اشرف المقالات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

بانی مجلس صیانۃ المسلمین کے

حالاتِ زندگی، علمی عملی، اصلاحی، تبلیغی اور قیام پاکستان کے
سلسلہ میں اُن کی سعی اور خدمات جیسے موضوعات پر

علماءِ کرام اور دانشورانِ قوم کے

مقالات

جلد اول

مرتبہ: وکیل احمد شیروانی

ناشر:
مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور

بانی مجلس صیانۃ المسلمین کے

جلد اول

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور

اشرف المقالات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

بانی مجلس صیانۃ المسلمین کے

حالاتِ زندگی، علمی عملی، اصلاحی، تبلیغی اور قیام پاکستان کے
سلسلہ میں اُن کی سعی اور خدمات جیسے موضوعات پر

علمائے کرام اور دانشورانِ قوم کے

مقالات

مرتبہ: وکیل احمد شیروانی

ناشر

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور

سلسلۂ اشاعت ———— نمبر

نام کتاب ———— اشرف المقالات
حصّہ اوّل

مرتب ———— وکیل احمد شیروانی خادم مجلس صیانۃ المسلمین
پاکستان لاہور

سرورق ———— محمد زاہد صاحب

نام ———— مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور

سن طباعت ———— سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق سنہ ۱۹۹۵ء

بار اول ———— " " "

قیمت ————

مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس ۴۳ نسبت روڈ لاہور

عنوانات ایک نظر میں

مقالات
تحریر کرنے والے حضرات ایک نظر میں

- حضرت مولانا الحاج ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب عارفیؒ
- حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ
- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ
- حضرت مولانا الحاج حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہیؒ (انڈیا)
- حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ
- حضرت علامہ سید ابوالحسن علی ندوی صاحب دام ظلہ
- جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی مرحوم
- حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی
- مولانا محمد محترم فہیم صاحب عثمانی مرحوم
- مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری
- حضرت مولانا قاری محمد سالم صاحب قاسمی
- حضرت علامہ سید انظر شاہ صاحب (انڈیا)
- مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندی (انڈیا)
- مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندی (انڈیا)

- مولانا عبداللہ سلیم صاحب (انڈیا)
- مولانا مقبول جہانگیر صاحب مرحوم
- مولانا محمود اشرف صاحب عثمانی
- مولانا عبدالرحمٰن صاحب سورتی (انڈیا)
- حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ
- حضرت مولانا سید مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی مدظلہ
- حضرت علامہ ظفر احمد صاحب عثمانیؒ تھانوی
- حضرت مولانا محمد عبیداللہ الاسعدی صاحب (انڈیا)
- جناب انیس احمد صاحب صدیقی
- جناب احسان قریشی صاحب بی۔اے
- جناب منشی عبدالرحمٰن خان صاحب مرحوم
- جناب مولانا قمر احمد صاحب عثمانی تھانوی
- جناب مولانا عبداللہ صاحب فیصل آباد

جناب مولانا عبدالرؤف صاحب الہ آبادی

فہرست مضامین

حصہ اوّل

مقالہ نمبر ۱

حکیم الامت حضرت تھانوی رح کے حالات و مصروفیات زندگی

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی رح

مقالہ نمبر ۲

حکیم الامت اور میرے ذاتی تاثرات

حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی رح

پیش لفظ

اکثر احباب کا ایک عرصہ سے تقاضا تھا کہ حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی علمی اصلاحی اور سیاسی زندگی پر ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جائے جس میں حضرت تھانویؒ کی علمی' اصلاحی اور سیاسی خدمات کا تذکرہ ہو' ہر چند کہ ان موضوعات پر پہلے بہت کچھ کام ہوچکا ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق حضرت تھانویؒ پر کام کیا ہے۔ لیکن وہ سب منتشر ہے' اکٹھا ایک جگہ نہیں۔ حضرت تھانویؒ کے کارناموں کے متعلق اگر کوئی شخص معلوم کرنا چاہے تو اسے مختلف کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ مگر پھر بھی حضرت حکیم الامتؒ کے علمی و اصلاحی اور سیاسی خدمت کے کچھ گوشے ایسے باقی رہ گئے تھے جن پر ابھی تک تفصیلی کام نہیں ہوا۔

حق تعالٰی شانہ کے فضل وکرم' اور مرشدی و مولائی مسیح الامت حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ کی دعاؤں کی برکت سے احقر کے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا کہ حضرت تھانویؒ کی دینی' اصلاحی اور سیاسی خدمات پر علماء کرام سے مختلف موضوعات پر مقالے اور مضامین لکھوائے جائیں۔ اور پھر ان کو یکجا طور پر شائع کر دیا جائے' اور ان کو مواد اکٹھا مل جائے تاکہ جو حضرات حضرت تھانویؒ پر تحقیقی کام کرنا چاہیں ان کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو' چنانچہ احقر نے علماء

کرام سے درخواست کی، ان سب حضرات نے احقر کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا، بفضلہ تعالیٰ ان سب حضرات نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق موضوع منتخب کرکے مقالے تیار کرکے احقر کو روانہ کر دیئے۔

احقر ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کی یہ مساعی جمیلہ قبول فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ حضرت تھانویؒ کی شخصیت کا کوئی پہلو رہ نہ جائے جس کا اندازہ آپ مقالات کی فہرست سے لگا سکتے ہیں۔ احقر اس سلسلہ میں تقریباً آٹھ نو سال سے لگا ہوا تھا اور اس سلسلہ میں مختلف حضرات کی خدمت میں کافی خطوط روانہ کئے جن کی تعداد کئی سینکڑہ کے قریب بنتی ہے۔

ناظرین سے درخواست ہے کہ دعاء فرما دیں کہ حق تعالیٰ شانہ احقر کی اس ناتمام سعی کو قبول فرما کر اس کو قبولیت عامہ سے نوازیں، اور اس کو احقر کے لئے صدقہ جاریہ بنائیں۔ آمین ثم آمین۔

نوٹ: اس مجموعہ میں کچھ مضامین سابقہ مطبوعات میں سے بھی چن کر موضوع کی مناسبت سے شامل کر دیئے گئے ہیں۔

آخر میں احقر فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور صاحب ترمذی دام ظلہم کا خاص طور پر ممنوع و شکر گذار ہے کہ جنہوں نے باوجود مدرسہ افتاء او ردیگر مصروفیات کے احقر کی درخواست پر نہایت محبت و جانفشانی سے تین مقالے تفسیر، فقہ اور تجوید کے موضوع پر تحریر فرمائے اور مزید براں جو مقدمہ تحریر فرمایا وہ ان سے بھی بڑھ کر ہے کہ جس میں حضرت حکیم الامتؒ کی دینی، علمی اور اصلاحی خدمات کا

تعارف اور ان کے تربیتی انداز و طریق پر جس مختصر اور جامع انداز میں پیش کیا ہے وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ حق تعالیٰ شانہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ کو ان عظیم خدمات کا صلے میں بہترین جزائے خیر عطا فرمائیں۔ اور ان کے سایہ رحمت تادیر سلامت باکرامت رکھے تاکہ زیادہ سے زیادہ دینی خدمات کی سعادت حاصل ہو۔

احقر وکیل احمد شیروانی عفی عنہ
خادم الافتاء والتدریس جامعہ اشرفیہ لاہور
خادم مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان

ملنے کے پتے

دفتر مجلس صیانۃ المسلمین جامعہ اشرفیہ، فیروز پور روڈ لاہور۔

ادارہ اسلامیات ۱۹۔ انار کلی لاہور۔

مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار، لاہور۔

ادارہ تالیفات اشرفیہ اردو بازار، ملتان۔

ادارہ تالیفات اشرفیہ ٹبہ شرقی متصل مسجد فردوس، ہارون آباد ضلع بہاولنگر۔

مکتبہ دارالعلوم۔ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴۔

کتب خانہ مظہری گلشن اقبال نمبر ۲ کراچی۔

دفتر مجلس صیانۃ المسلمین جامعہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا

(انڈیا)

ادارہ تالیفات اشرفیہ خانقاہ اشرفیہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یو پی۔ انڈیا)۔

مکتبہ فیض اشرف جلال آباد ضلع مظفر نگر (یو پی۔ انڈیا)۔

دفتر مجلس صیانۃ الحق کتب خانہ امدادالغرباء مفتی محلّہ، سہارنپور۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مُقدّمہ

از حضرت مولینا مفتی عبد الشکور صاحب ترمذی مدظلہ
مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی شخصیت اور ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے آپ کی شخصیت یگانۂ روزگار اور ؎

"آفتاب آمد دلیل آفتاب" کی مصداق ہے

حضرت اقدس رحؒ شریعت و طریقت کے جامع اور علم و عرفان، دینی بصیرت و فقاہت، تقویٰ و طہارت کے درجۂ کمال پر فائز تھے آپ کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کو دیکھ کر اسلاف کرام کی یاد تازہ ہو جاتی تھی حضرت اقدس رحؒ بجا طور پر سلف صالحین کے علوم و فیوض کے امین اور وارث تھے آپ کی کیمیا اثر صحبت اور بابرکت تعلیمات کی برکت سے ہزار ہا بندگانِ خدا

کو یقین و معرفت کی لازوال دولت میسر آئی۔ اور بہت سے تشنگان معرفت کو اس چشمۂ عرفان سے سیرابی حاصل ہوئی آپ برصغیر پاک و ہند میں معروف و نامور علمی و روحانی شخصیتوں کا مرکز اور صدر نشین تھے

اکابر علماء کرام کی رائے گرامی

اس زمانہ کے علماء کرام کی رائے گرامی حضرت والا کے متعلق یہ ہے کہ آپ نہ صرف یہ کہ اس زمانہ کے مجدد تھے بلکہ ایسے مجدد اور مصلح اعظم، جامع المجددین تھے جنہوں نے دین کامل کی تجدید و اصلاح کی

حضرت حکیم الامتہ کی تجدیدی جامعیت

معاملات و معاشرت، سیاست، عقائد و عبادات، دیانات و عمرانیات غرض کہ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضرت والا رح کی گرانقدر تجدیدی خدمات موجود نہوں اور دین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے بارہ میں حضرت حکیم الامتہ نے تجدید و اصلاح نہ کی ہو اور اپنی کتابوں اور ملفوظات و مواعظ میں ان کے بارے میں ہدایات نہ دی ہوں ہر شعبہ میں آپ کی تصانیف موجود ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف و سلوک، قرآت و تجوید، منطق و فلسفہ وغیرہ تمام علوم و فنون میں حضرت حکیم الامتہ رح کی مجددانہ اور حکیمانہ تحقیقات عصر حاضر کا بےمثال منفردانہ، مصلحانہ، شاندار کارنامہ ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ــ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

حضرت حکیم الامت کے تصنیفی کام کی وسعت

حضرت حکیم الامت رح کی تحقیقاتِ نادرہ اور تجدیدی اصلاحات، آپ کی مختلف النوع تصنیفات وتالیفات اور خطبات وملفوظات کے ذریعہ الحمد للہ منظر عام پر آکر امت مسلمہ کے لئے باعث رشد وہدایت ہورہی ہیں اس وقت ان کی تفصیل پیش کرنا یا ان کا تفصیلی تعارف کرانا مقصود نہیں ہے اور نہ ہی ان کی تفصیل ایک مضمون میں پیش کی جاسکتی ہے

یہ اتنا بڑا کام بظاہر اسباب ایک شخص کا نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑے ادارہ یا اکیڈمی کا کام نظر آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے حضرت حکیم الامت سے لیا ہے اس کو دیکھ کر عقل حیران وششدر رہ جاتی ہے۔ حضرت حکیم الامت سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں محض اپنے فضل وکرم سے دین کے ہر شعبہ میں اصلاحی اور تجدیدی کام لیا عقائد وعبادات سے لے کر معاشیات واقتصادیات معاشرت وسیاست تک کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارہ میں حضرت تھانوی رح کی کتابوں میں اصلاحی ہدایات موجود نہ ہوں۔

حضرت حکیم الامت کے علوم ومعارف اور اصلاح وہدایت کے طریقے جامع اور کامل ہیں، دین بلکہ دنیا کا بھی کوئی شعبہ اس سے خالی نہیں ہے ایسے تمام موضوعات پر حضرت حکیم الامت تھانوی رح نے قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی عمیق فکری اور ذوق علمی سے کام لے کر جو علمی جواہر پارے موجود اور آئندہ نسل انسانی کی اصلاح وہدایت کے لئے پیش کئے ہیں وہ یقیناً ایک جویائے یقین کے لئے باعث اطمینان ہے۔

علمی حیثیت سے حضرت حکیم الامت تھانوی کے تحریری اور تقریری مقالے، کارنامے اپنی مثال آپ ہیں۔

زیر نظر مجموعہ "مقالات اشرفیہ" میں حضرت حکیم الامت رح کی علمی خدمات کا بہت ہی مختصر طریقہ پر بطور مثال اجمالی جائزہ لینا مقصود ہے۔

حضرت والا کی تصانیف و تالیفات، مواعظ اور ملفوظات میں ہر موضوع پر علمی مواد اور ذخیرہ معلومات موجود ہے اور آپ کی مختلف النوع تصانیف آپ کی وسعتِ معلومات اور علمی جامعیت کی گواہ ہیں

آپ ایک جامع علم و عمل بلند پایہ شخصیت کے حامل، ایک کامل صوفی فاضل، مفسر، یگانہ روزگار فقیہ اور اپنے دور کے ممتاز محدث تھے آپ کی تصانیف علوم القرآن، علوم الحدیث، علم کلام و عقائد، فقہ و فتاوی، اور سلوک و تصوف میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں

علم تفسیر

اس علم میں آپ کی تفسیر "بیان القرآن"، ایک شاہکار ہے قرآن فہمی اور علوم قرآنی میں ایک نہایت بلند مقام آپ کو حاصل تھا۔ صرف بیان القرآن ہی کو دیکھ لیجئے کہ یہ حضرت والا کی اردو تفسیر ہے جو وسعت معلومات اور جامعیت، تحقیقات کے لحاظ سے منفرد تفسیر ہے یہ اردو تفاسیر میں واحد تفسیر ہے جو بہت سی مختلف النوع عربی فارسی اردو تفسیر سے بے نیاز کر دینے والی ہے اس کے علاوہ حضرت والا نے قرآنی علوم کے مختلف پہلوؤں پر متعدد چھوٹی بڑی تصانیف اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں اور یوں تو علوم قرآن کے متعلق جابجا مختلف علمی مباحث اور دقیق مسائل حضرت والا کی

اکثر تصانیف، مواعظ، ملفوظات میں پھیلے ہوئے پائے جاتے ہیں حضرت والا نے علوم قرآن کی خدمت جس جس طریقہ سے کی ہے وہ بجائے خود آپ کی ایک کرامت ہے۔

حضرت والا نے حضرت عبد اللہ بن عباس مفسر قرآن رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللھم علمہ الکتاب کی دعا دی تھی اور بشارت سنائی تھی۔ حضرت والا فرماتے ہیں اس خواب کے بعد میری مناسبت قرآنی بڑھ گئی تھی۔ اور یہ خواب اسی کی طرف اشارہ تھا

علم حدیث

اس علم میں جامع الآثار، تابع الآثار وغیرہ کے علاوہ بیس جلدوں پر ایک ضخیم کتاب اعلاء السنن حضرت والا کی کاوشوں کا شاہکار ہے جو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے آپ کی رہنمائی میں تصنیف کی اور یہ علم حدیث کے چودہ سو سالہ دور کا عجیب وغریب بے مثال بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں ان احادیث کو فقہی ابواب کی ترتیب سے جمع کیا گیا ہے جن سے فقہ حنفی ماخوذ ہے اور تمام فقہی ابواب سے متعلق احادیث نبویہ کی بے نظیر محدثانہ اور فقیہانہ شرح وتفصیل بیان کی گئی ہے

خدمت علم فقہ

اس علم میں دوسرے رسائل کے علاوہ امداد الفتاویٰ آپ کا ایک عظیم الشان علمی اور تحقیقی کارنامہ جو فقہی مسائل اور مباحث کا ایک نادر

مجموعہ ہے اس میں ہر باب سے متعلق فقہی مواد بڑی تحقیق کے ساتھ متداول معتبر کتب فقہ کے حوالہ سے مل جاتا ہے اور ایک اہل علم اور مفتی کی رہنمائی اور تسکین کا باعث ہوتا ہے۔

یوں تو علوم اسلامیہ میں سے کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جس میں حکیم الامت کی محققانہ بصیرت افروز تصنیف نہ ہو، جیسا کہ آپ کی جامعیت علوم و فنون کا تقاضا تھا اور زیر نظر "مقالات اشرفیہ" کے مجموعہ میں حکیم الامت کے مختلف علوم وفنون پر مقالات سے واضح ہے۔

لیکن قرآن وتصوف اور فقہ آپ کے مخصوص فن تھے ان تینوں فنون میں آپ کی مجددانہ تصانیف میں مقبولیت عامہ اور قبول الٰہی کے آثار مشاہد ہیں۔ خدمت علم سلوک میں حضرت حکیم الامت نے کتب احادیث سے ایسی تمام حدیثوں کو جمع فرمادیا جن میں اس فن شریف کے مسائل متفرق طور پر تھے،

حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ، التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف

اسی سلسلہ کی تالیفات ہیں جس میں مسائل تصوف کی احادیث کو جمع فرمایا گیا اور ان کی اصول محدثین پر تخریج کی گئی ہے۔ حضرت نے دنیا پر واضح کردیا کہ صحیح اسلامی تصوف صرف قرآن وحدیث سے ماخوذ اور مستنبط ہے اس کا کوئی مسئلہ بھی کسی غیر اسلامی ماخذ سے لیا ہوا نہیں، نیز مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ میں قرآن کریم کی ان آیات کی تفاسیر ہے جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں قرآن کریم کی آیات کثیرہ سے مجتہدانہ اور مجددانہ شان کے ساتھ مسائل تصوف کو مدون فرمایا۔

مہارت فی الحدیث

حضرت حکیم الامت کو علم حدیث میں جو مہارت حاصل تھی اس کی شہادت علاوہ ان کتابوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے آپ کے مواعظ و رسائل اور دوسری تالیفات کے ہزاروں صفحات بھی دے رہے ہیں جن میں بے شمار احادیث کے حوالے، ان کی مشکلات کی شرح، دقیق مطالب کے حل، اور نکات و لطائف کا بیان ہے۔

مواعظ میں برمحل اور بکثرت احادیث کے بعینہٖ الفاظ مع ان کی تخریجات کے اس کثرت سے ہیں کہ ان کو دیکھ کر آپ کے حافظ الحدیث ہونے میں کوئی شبہ رہ نہیں سکتا۔ پھر آپ کی تصانیف جو فقہ اور احکام و مسائل یا اصلاح رسوم اور سلوک میں ہیں ان کی بنیاد احادیث ہیں۔ ان میں احادیث کے حوالے دلائل کی مضبوطی اور صحت بیان کی تائید و شہادت کے لئے آتے ہیں جو حضرت مؤلف کے علم حدیث اور معرفت وجوہ استنباط پر دلیل قاطع ہیں اس کی تفصیل آپ اس مجموعہ مقالات میں "حضرت حکیم الامت کی خدمت حدیث" کے زیر عنوان ملاحظہ فرمائیں گے۔

فقہ نفس

حضرت حکیم الامت قدس سرہ السامی کو اللہ تعالیٰ نے زمانۂ تحصیلِ علم سے ہی ایسے اساتذہ کی تربیت و صحبت نصیب فرمائی جو اپنے اپنے فن میں کامل اور مہارتِ تامہ کے حامل تھے چنانچہ فقہ میں آپ کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رح اور فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح

کی تربیت حاصل رہی جن کی نظیر ان کے زمانہ میں تو کیا صدیوں میں بھی نظر نہیں آتی جو فقہ اور حدیث میں مرجع خلائق تھے۔

دارالعلوم میں نیابتِ افتار

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ ہی سے آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی کیمیا اثر صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے آپ ہی کی زیر تربیت فقہی سوالات کے جوابات لکھتے رہے جو حضرت نانوتوی موصوف کی تصحیح کے بعد دارالعلوم سے جاری ہوتے تھے

آپ کے فتاوی کا ایک حصہ وہ بھی **امداد الفتاوی** کا جزو ہے جو آپ نے بطور نیابت دارالعلوم دیوبند میں لکھے اور ان کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی تصدیق و تصحیح کا شرف حاصل ہے۔ ابتدا میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے افتاء کی یہ خدمت اپنے استاد زادے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رح (المتوفی ۱۳۰۲ھ) کے سپرد فرمائی تھی اور حکیم الامت مولانا اشرف علی رح نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رح (دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس اور پہلے مفتی) کی زیر تربیت ۱۳۰۱ھ سے پہلے ہی دارالعلوم دیوبند میں افتار کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ امداد الفتاوی بھی فتاوی دارالعلوم کے سلسلہ کی کڑی اور اس کا حصہ اول اور اسی عظیم الشان دینی ادارہ کا فیضان ہے اور حضرت حکیم الامت تھانوی رح اس کے پہلے نائب مفتی ہیں۔

گویا آپ کی فتوی نویسی کی زندگی کی ابتدار دارالعلوم دیوبند میں استاذ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی زیر نگرانی ہوئی اور فتوی نویسی

کے اصول وضوابط پر عملی تمرین اور مشق بھی احاطہ دار العلوم ہی میں فقیہ کامل اور ماہر استاذ کے زیر سایہ کرائی گئی۔

بعد فراغ از دار العلوم دیوبند کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں حضرت والا نے فتاویٰ لکھے اور وہ قریبًا کل کے کل مدرسہ جامع العلوم ہی میں محفوظ ہیں۔ آپ کے فتاویٰ کا تیسرا دور وہ ہے جو بہ زمانہ قیام تھانہ بھون لکھے گئے۔ حضرت حکیم الامۃ رح امداد الفتاویٰ کی تمہید میں ارقام فرماتے ہیں

"یہ مجموعہ ہے بعض فتاویٰ کا جو احقر نے وقتاً فوقتاً مختلف سوالات پر لکھے ہیں جس کے باعتبار احوال کی وبیشی نظر اس احقر کے تین حصے جدا جدا تھے

ایک وہ جو زمانہ طالب علمی دیوبند میں بامر استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب لکھے گئے تھے اور جن پر قریب قریب کل کے حضرت مولانا قدس سرہٗ کی تصحیح بھی تھی اور یہ زمانہ ۱۳۰۱ھ تک کا ہے۔

دوسرے وہ جو زمانہ مدرسی کانپور میں لکھے تھے جس وقت کہ کسی محقق کی صحبت نہ تھی اور عوام کی حالت کا تجربہ بھی کم تھا۔ اور یہ وقت ۱۳۱۵ھ کے اوائل تک کا ہے

تیسرے وہ جو زمانہ قیام وطن میں لکھے ہیں جب کہ گاہ گاہ شرف صحبت مقدام المحققین حجۃ اللہ علی العالمین حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے مشرف ہوتا تھا۔ اور عوام کی حالت کا تجربہ بھی بڑھ گیا تھا۔ (امداد الفتاویٰ ص۲ م

حضرت والا کی یہ غایت احتیاط اور آپ کا تقویٰ ہے کہ باوجود اپنے استاذ فقیہ کامل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے فتاویٰ کی مشق حاصل کرنے اور آپ کے زیر نگرانی فتاویٰ لکھنے کے بعد بھی زمانہ کانپور کے لکھے ہوئے فتاویٰ کو اس درجہ کا قرار نہیں دے رہے ہے جس درجہ کے آپ کے وہ فتاویٰ ہیں جو حضرات

اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کے زیر نگرانی لکھے گئے ہیں۔

حضرت حکیم الامت کی اس تمہیدی تحریر سے ایک تو فتویٰ کا اہم اصول یہ معلوم ہوا کہ جس کی اتباع حتی الامکان اس کام کے کرنے والوں پر لازم ہے کہ حتی المقدور کسی بڑے اور ماہر فقیہ کی زیر نگرانی یہ افتاء کا کام انجام دیا جائے اور اس کا لحاظ ہمیشہ ہی رکھنا چاہیئے کہ اپنے سے بڑے اور ماہر فقیہ سے مشورہ کرتا رہے،

ہمارے نوعمر اور نو آموز علماء چندے کسی فقیہ کے پاس رہ کر خود کو اس کام کا اہل سمجھنے لگ جاتے ہیں، اور کسی سے مشورہ تو کیا مصلحت بھی نہیں سمجھتے یہ روش قابل اصلاح بلکہ ضروری الاصلاح ہے۔ چندے کسی ماہر فقیہ کے پاس رہ کر فی الجملہ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور کسی قدر راستہ سے آگاہی ہو جاتی ہے راس کو کافی سمجھ کر اسی پر قناعت کر لینا اپنے بڑوں اور تجربہ کار فقہا سے خود کو بے نیاز اور مستغنی سمجھ لینا ہرگز درست نہیں ہے

دوسرا اصول یہ معلوم ہوا کہ اس کار افتاء میں احوالِ اہل زمانہ پر نظر رکھنا بھی بہت ضروری ہے ورنہ مفتی، من جهل اهل زمانه فهو جاهل (عقود رسم المفتی صلا)

فتاویٰ کا تحقیقی اور استدلالی اسلوب

حضرت حکیم الامت تھانوی رح کے امداد الفتاویٰ سے ظاہر ہے کہ آپ کو علم فقہ پر کس قدر مہارت تامہ اور عبور حاصل تھا۔ حضرت والا فقہی مسائل میں کافی تلاش و تحقیق اور غور و خوض اور مراجعت کتب اور بعض اہم مسائل میں اہل علم سے مشاورت کے بعد ہی کوئی فتویٰ جاری کرتے تھے اس لئے امداد

الفتاویٰ کو تحقیق و استدلال مسائل میں اپنے ہمعصر فتاویٰ میں ایک مخصوص امتیازی اور منفردانہ معیاری مقام حاصل ہے اور اس کا اسلوب استدلالی اور تحقیقی ہے جو اس کام کے سیکھنے اور کرنے والوں سب ہی کے لئے رہنمائی کا کام دینے والا اور بے حد مفید اور کارآمد ہے۔

امداد الفتاویٰ میں فقہاء کرام کی مستند کتب فتاویٰ سے صریح جزئیات کے نقل کرنے کا اہتمام فرمایا گیا ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا تلاش کر کے صریح جزئیہ ہی جواب میں لکھا گیا اور یہی طریقہ اصول فتاویٰ کے موافق ہے۔

وانما علی المفتی حکایۃ النقل الصریح

کما صرحوا بہ (شرح حموی علی الاشباہ ص۱۲۱)

البتہ اگر تلاش کے بعد صریح جزئیہ نہ ملا تو اصول وقواعد سے یا کسی منقولہ جزئی پر قیاس سے بھی جواب دیدیا گیا اور آخر میں عموماً اس پر تنبیہ فرمادی کہ:۔

"یہ جواب قواعد سے لکھا گیا ہے صریح جزئیہ نہیں ملا اس لئے دوسرے علماء سے مراجعت کر لی جائے وہ اختلاف فرمائیں تو مجھے مطلع کر دیا جائے"

یہ اصول ہر وقت پیش نظر رہنا چاہئے اپنے ہی فہم پر اعتماد کر کے اس کو ہی "عقل کل" نہ سمجھ لینا چاہیئے، اپنی تحقیق کے خلاف اگر اصول صحیحہ سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو اس کے قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے چنانچہ حضرت تھانویؒ غور و تحقیق کے بعد رائے بدلنے پر اس کا اعلان، "ترجیح الراجح" میں شائع فرما دیتے تھے۔

حضرت حکیم الامت رحؒ کے اس طرز عمل سے ایک تو اصول افتاء میں،

دیانت کی اہمیت اور عنداللہ مسئولیت اور جوابدہی کے ہر وقت استحضار کا سبق ملتا ہے دوسرے مستفتی کو اپنے فتویٰ کی حقیقت و مرتبہ سے آگاہ کرنا کہ وہ فتویٰ کو فقہائے سابقین کے منصوص فتاویٰ کے ہم پلہ نہ سمجھے بلکہ دونوں میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

دوسرے جزئیہ سے جزئیہ اور اصول وقواعد سے مسئلہ کے استنباط و استخراج معلوم ہوتا ہے جو اصول فتاویٰ میں اہم اور کارآمد اصول ہے **حوادث الفتاویٰ** نئے مسائل اور معاملات جدیدہ کے حل کے لئے اس اصول پر عملدرآمد کیا جانا ضروری ہے اس کے بغیر حوادث کے احکام معلوم نہیں ہو سکتے۔

فتوے میں وسعت

حضرت تھانوی رحؒ نے اپنی خداداد فقہی بصیرت سے کام لے کر اصول فقہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور مسئلہ کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے ہوئے تحقیق مسئلہ میں عموم بلویٰ اور ابتلائے عام کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور یہ آپ کا مخصوص طرز فتویٰ تھا جس پر آپ کے حوادث الفتاویٰ، الحیلۃ الناجزہ، رافع الضنک عن منافع البنک صفائی معاملات وغیرہ خاص طور پر شاہد ہیں، اس سلسلہ میں حضرت تھانوی رحؒ کا حسب ذیل ارشاد قابل لحاظ ہے اس میں امت کے لئے بڑی وسعت اور سہولت ہے فرمایا۔

"بلکہ اس باب میں میری رائے تو یہ ہے کہ اگر معاملات میں کسی وقت اپنے مذہب میں تنگی ہو اور دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال میں گنجائش ہو تو عوام کو تنگی میں نہ ڈالا جائے بلکہ دوسرے ائمہ کے اقوال پر فتویٰ دیدیا جائے"

میں حضرت مولانا گنگوہی رح سے اس رائے کی صریح تائید حاصل کر چکا ہوں
(وعظ آداب المصائب سلسلہ تبلیغ نمبر ۱۳۹)
لیکن حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی رح کی اس رائے گرامی کا یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ کسی ایک مذہب معین کی تقلید ضروری نہیں ہے اور عوام کو اس کی کھلی اجازت ہو کہ وہ از خود جس مذہب میں آسانی ہو اور موجودہ زمانے کے حالات کا لحاظ ہو اس پر عمل کر لیا کریں یا حکومت سے کسی معین فقہ کے نافذ کرنے کا مطالبہ نہ کیا جائے جیسا کہ بعض مقالہ نگاروں نے اس طرح کا تاثر لیا ہے"

حضرت حکیم الامت کے نزدیک مذہب غیر پر عمل کرنے کی شرائط

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے مذہب غیر پر عمل کرنے کی شرائط و قیود کو الحیلۃ الناجزۃ کی تمہید اور اس کے مقدمہ میں تفصیل سے بیان کر دیا ہے ارشاد ہے :۔

"شرط اولین تو یہی ہے کہ مذہب غیر پر عمل کرنا ضرورت شدیدہ کی بناء پر ہو اتباع ہوا کے لئے نہ ہو اور اس شرط پر تمام امت کا اجماع اور اتفاق علامہ ابن تیمیہ نے نقل کیا ہے۔

حیث قال فیمن نکح عند شہود فسقۃ ثم طلقھا ثلاثا فاراد التخلص من الحرمۃ المغلظۃ بان النکاح کان فاسدًا فی الاصل علی مذہب الشافعی فلم یقع الطلاق مانصہ وھذا القول یخالف اجماع المسلمین فانھم متفقون علی ان من اعتقد حل الشئ کان علیہ ان یعتقد ذلک

سواء وافق غرضه او خالف ومن اعتقد تحريمه
كان عليه ان يعتقد ونك فى الحالين وهؤلاء
المطلقون لايفكرون فى فساد النكاح بفسق الولى
الاعند الطلاق الثلاث لاعند الاستمتاع والتوارث
يكون فى وقت يقلدون من يفسده وفى وقت
يقلدون من يصححه بحسب الغرض والهوى
ومثل هذا لايجوز باتفاق الائمة الخ
(فتاوىٰ ابن تیمیہ جلد ثانی ص۲۴۲ ، الحیلۃ الناجزہ ص۳۶)

اور ضرورت شدیدہ اور ابتلائے عام کے وقت حنفیہ کے نزدیک دوسرے ائمہ کے مذہب کو اختیار کر کے اس پر فتویٰ دیدینا بھی جائز ہے لیکن عوام کو خود اپنی رائے سے جس مسئلہ میں چاہیں ایسا کر لینے کی اجازت نہیں بلکہ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے

اور اس زمانہ میں احتیاط اسی طرح ہو سکتی ہے کہ جب تک محقق و متدین علماء کرام میں سے متعدد حضرات کسی مسئلہ میں ضرورت کا تحقق تسلیم کر کے دوسرے امام کے مذہب پر فتویٰ نہ دیں اس وقت تک ہرگز اپنے امام کے مذہب کو نہ چھوڑیں کیونکہ مذہب غیر کو لینے کے لئے یہ شرط ہے کہ اتباع ہوا کی بناء پر نہ ہو بلکہ ضرورت داعیہ کی وجہ سے ہو اور ضرورت وہی معتبر ہے جس کو علماء نے اہل بصیرت ضرورت سمجھیں

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ فتویٰ دینے والا ایسا شخص ہو جس نے کسی ماہر استاذ سے فن کو حاصل کیا ہو اور اہل بصیرت اس کو فقہ میں مہارت تامہ حاصل ہونے پر شہادت دیتے ہوں۔

لما قال الشامی فی عقود رسم المفتی فان المتقدمین شرطوا فی المفتی الاجتہاد وھذا مفقود فی زماننا فلا اقل من ان تشترط فیہ معرفۃ المسائل بشروطھا و قیودات التی کثیرًا ما یسقطونھا ولا یصرحون بھا اعتمادًا علی فہم المتفقہ وکذا لابد من معرفۃ عرف زمانہ واحوال اھلہ والتخرج فی ذلک علی استاذنا اھ الخ (۲۶)

(الحیلۃ الناجزہ ۶۵۰)

آگے ارقام فرماتے ہیں :-

اس زمانہ میں اطمینان کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کم از کم دو چار محقق علماء دین کسی امر میں ضرورت کو تسلیم کر کے مذہب غیر پر فتویٰ دیں بدون اس کے اس زمانہ میں اگر اقوال ضعیفہ اور مذہب غیر کو لینے کی اجازت دی جائے تو اس کا نتیجہ ہدم مذہب ہوگا۔ (الحیلہ ص۲۶)

حضرت تھانوی کے نزدیک بدون ایسی ضرورت شدیدہ کے تحقق کے جس کو متعدد محقق علماء دین تسلیم کریں مذہب غیر پر عمل کرنے کی اجازت تو کیا ہوتی اپنے مذہب کے اقوال ضعیفہ پر بھی عمل کی اجازت کا نتیجہ ہدم مذہب ہے"

الحیلۃ الناجزہ پر تصدیق کرنے والے بعض اکابر علماء کرام کے ارشادات کا خلاصہ ذیل میں درج ہے

"درحقیقت امت مرحومہ کی اس اہم مشکل کا حل حضرت اقدس"

ہی جیسے مجمع کمالات کا محتاج تھا اس زمانہ میں حضرت حکیم الامت رح جیسے فقیہ کو جو علاوہ ظاہری و باطنی علوم کی مہارت تامہ کے احوال زمانہ اور مشکلات حاضرہ سے بھی بخوبی واقف ہیں یقیناً یہ حق حاصل ہے کہ بعد مشورہ علماء کرام فتویٰ اُس کے لئے کسی دوسرے امام کے مذہب کو اختیار فرمائیں کیونکہ بوقت ضرورتِ شدیدہ دوسرے اماموں کے مذہب کو اختیار کرنا بھی فقہ حنفی کا ایک حکم ہے ۔

آپ نے جس غور و خوض کو ایک عرصہ دراز تک اس تحقیق و تصنیف میں مبذول فرمایا ہے اس کا کچھ اندازہ وہی حضرات اہلِ علم کر سکتے ہیں جن کو زمانہ تالیف میں حاضری کی دولت نصیب ہوئی ہو ۔

یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگ مذہب مالکیہ کی آڑ میں تمام قیود و شرائط سے آزاد ہو کر بعض اوقات ایسی کارروائی کر گذرتے تھے جو کسی مذہب میں بھی صحیح نہیں ہوتی تھی اور مذہب مالکیہ سے عام طور پر کماحقہٗ واقفیت نہ ہونے کے سبب اکثر اہل علم کو بھی اس میں مغالطہ ہو جاتا تھا اس لئے سخت ضرورت تھی کہ ان مسائل ضروریہ کے متعلق جس قدر شرائط ہوں ان سب کو تفصیل کے ساتھ جمع کر دیا جائے تاکہ مواقع ضرورت میں ان شرائط کا لحاظ رکھا جائے

چنانچہ حضرت تھانوی رح نے محنت شاقہ برداشت کر کے مذہب مالکیہ کے ارباب فتاویٰ علماء مکہ مکرمہ اور علماء مدینہ منورہ سے مسئلہ کی مکمل تحقیق و تنقیح فرما کر تمام شرائط و قیود کو یکجا مدون فرما دیا ۔

اب ضرورت ہے کہ اس رسالہ الحیلۃ الناجزہ میں جو قیود و شرائط درج ہیں وہ چونکہ نہایت درجہ ضروری ہیں عمل کے وقت ارباب

فتاویٰ ان تمام شرائط وقیود کو بخوبی ملحوظ رکھیں، وھوالموفق للخیر والعاصم من کل ضیء ہم یقین کرتے ہیں کہ حضرت اقدس تھانوی رحؒ کی یہ مساعی جمیلہ تاقیامت امت مرحومہ میں مشکور رہیں گی

فجزاھم اللہ احسن الجزاء عنا وعن سائر المسلمین

آمین ثم آمین

علم سلوک وتصوف

علم سلوک وتصوف روح شریعت کا نام ہے جس میں اخلاص دین اور اعمال قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کی جاتی ہے، قدماء صوفیاء نے اس پر جو کتابیں لکھی ہیں مثلاً رسالہ قشیریہ امام قشیری، قوت القلوب، ابو طالب مکی، کتاب اللمعہ، ابونصر عبداللہ بن سراج الطوسی، کتاب الصدق، ابو سعید خزار، فتوح الغیب شیخ سہروردی، غنیۃ الطالبین، شیخ عبدالقادر جیلانی اور متاخرین میں تصانیف امام عبدالوہاب شعرانی، ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے افسوس کہ مصنوعی اور دکاندار صوفیہ اور مبتدعین کی تلبیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ بدعات کا مجموعہ بلکہ بطلان وضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا تھا۔ اصل شئی جو اخلاص فی الدین، طلب رضاء حصول قرب، اور اعمال واخلاق قلب ومقامات ہیں۔ اور جن سے مقصود رذائل سے پاکیزگی اور فضائل سے آراستگی ہے تمام متروک ہوگیا مقاصدیوں کے بعد حضرت حکیم الامت کے تجدیدی مساعی نے اس فن کو پھر سلف صالحین کے رنگ میں پیش کیا اور ہر قسم کے اضافوں اور آمیزشوں سے پاک کرکے کتاب وسنت کے نور میں اس تاریک زمانہ میں پھر ظاہر کیا۔ اور زبان وقلم سے ان

مسائل پر اتنا کچھ لکھا اور بیان فرمایا کہ اب طالب پر اصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا۔ وللہ الحمد

جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں نے شریعت وطریقت کی دوئی کا مسئلہ گھڑا۔ اور اس زور سے اس کو شہرت دی کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا حالانکہ یہ تمامتر لغو اور بے دینی ہے

حضرت حکیم الامت تھانوی نے تمام عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے، احکام الٰہی کی "باخلاص تمام تعمیل وتکمیل ہی کا نام طریقت ہے اور یہی خواص امت کا مذہب ہے، اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے ناآشنا ہے، حضرت حکیم الامت تھانوی نے فن سلوک میں مسائل السلوک، "تائید الحقیقۃ" اور التشرف وغیرہ تالیف فرماکر مسائل سلوک کی قرآن وسنت سے تشریح فرمائی ہے۔

اہل تحقیق کے لئے اس فن شریف پر ایک جامع کتاب "التکشف عن مہمات التصوف" تالیف فرمائی جو پانچ حصوں میں منقسم ہے، حقیقت طریقت، حقوق طریقت، تحقیق کرامت، اور دیگر مضامین تصوف پر مشتمل نہایت عجیب وغریب اور مفید مجموعہ ہے

اصلاحات حضرت تھانوی ؒ

حضرت حکیم الامت ؒ کی اصلاحات کا باب اتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں، اور عورتوں سے لے کر مردوں اور علماء اور فضلاء کے حلقہ تک پھیلا ہوا ہے اور سب کے لئے مفید ہدایات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے مسلمانوں کی اصلاح کی جو دقیق نظر حضرت حکیم الامت کو بارگاہ الٰہی سے عطا

ہوتی تھی اس کا اندازہ آپ کو حضرت کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہوسکتا ہے ان اصلاحات کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ مجالس و مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شادی غمی کی رسومات اور روزمرہ کی زندگی تک کو محیط ہیں۔ غرض کہ ایک مسلمان جدھر اپنی زندگی میں رُخ کرے ان کے قلم نے شریعت کی ہدایت کا پروگرام تیار کر رکھا ہے۔

مواعظ حکیم الامت

اس سلسلہ میں حضرت کی سب سے اہم اور مفید چیز مواعظ ہیں واعظ تو بحمد اللہ تعالیٰ اسلام کی دس بارہ صدیوں میں بے شمار گذرے ہوں گے مگر شاید واعظین میں ابن نباتہ اور ائمہ سلوک میں حضرت شیخ الشیوخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کے سوا کوئی دوسرا مستند اور مفید مجموعہ موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آخر دور میں امت اسلامیہ کی اصلاح کے لئے بہت بڑا فضل یہ فرمایا کہ حضرت کے مستفیدین کے دل میں ڈالا کہ وہ حضرت کے مواعظ عین وعظ کے وقت قید تحریر میں لائیں اور حضرت کی نظر اصلاحی سے گذار کر ان کو دوسرے مسلمانوں کے عام فائدہ کی غرض سے شائع کر دیں چنانچہ اس اہتمام و احتیاط کے ساتھ تقریباً چار سو مواعظ مرتب ہوئے اور اکثر شائع ہوئے جو احکام اسلامی، رد بدعات، نصائح دلپذیر اور مسلمانوں کی مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں اور جن میں حقائق کے ساتھ ساتھ دلچسپیوں کی بھی کمی نہیں

بڑی خصوصیت

سلسلۂ اصلاح و تربیت میں حضرت رحؒ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

عموماً واعظین صرف عقائد وعبادات پر گفتگو فرماتے ہیں، حضرت ان چیزوں کی رعایت کے ساتھ مسلمانوں کے اخلاق ومعاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی اصلاح پر بھی زور دیتے ہیں بلکہ اپنی تربیت وسلوک میں بھی ان پر برابر کی نظر رکھتے ہیں حالانکہ عام مشائخ نے اس اہم سبق کو صدیوں سے بھلا دیا تھا

علمِ کلام

علم کلام وعقائد اور توحید پر متعدد رسالے تالیف فرمائے جو شائع ہو چکے ہیں المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ تین حصوں میں ترتیب پایا ہے جس میں احکام ومسائل کے مصالح اور حکم بیان کئے گئے ہیں جن میں عذاب قبر اور معاد کے متعلق اسلامی عقائد کے مصالح بھی شامل ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے مذہبی اعتراضات کے تشفی بخش جوابات کے لئے حضرت والا نے الانتباہات المفیدہ من الاشتباہات الجدیدہ" تحریر فرمائی۔ اور آپ کے مواعظ وملفوظات سے نئے اور پرانے شبہات کے جوابات کو جمع کر کے اشرف الجواب کے تین حصوں کی صورت میں شائع کئے گئے، یہ بھی علم کلام کی گراں قدر خدمت ہے اس کے علاوہ نئے زمانہ کے حالات کا خیال کر کے اسلام اور سائنس کے نام سے الحصون الحمیدیہ عربی کی جدید کلامی تالیف کا مولانا محمد اسحاق صاحب سے اردو ترجمہ کرایا

فلاسفہ اور متکلمین کے اختلاف میں محاکمہ

حضرت حکیم الامتؒ نے بعض مسائل میں فلاسفہ اور متکلمین میں محاکمہ بھی کیا ہے حضرت والا کی علم کلام اور علم منطق میں اپنی تحقیقی رائے تھی وہ

فلاسفہ یا متکلمین کے بغیر دلیل جامد کے مقلد نہیں تھے چنانچہ ذیل کے مسئلہ فنار ارواح بعد نفخ صور کی تحقیق سے آپ کی رائے واضح ہے کہ اگر نفخ صور کے وقت ارواح بھی فنا ہو جائیں تب بھی اس سے انقطاع لازم نہیں آتا۔ کیونکہ وہ فنا تھوڑی دیر کے لئے ہوگا ممتد نہ ہوگا۔ اور امور عادیہ میں زمان لطیف کا انقطاع مانع استمرار نہیں ہوتا پس اگر ارواح کا فنار بھی ایک آن کے لئے ہو جائے تو یہ مانع بقار نہ ہوگا

فلاسفہ کا مذہب

یہ جواب محققین کا ہے اور بالخصوص فلاسفہ کے مذہب پر تو یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک زمانہ آنات سے مرکب نہیں بلکہ آن طرف زمان ہے تو اب یہ کہنا بہت سہل ہے کہ ارواح کا بقار تو زمانی ہے اور فنار آنی ہے اور بقا زمانی کا انقطاع فنار زمانی ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ فنار آنی سے اس تقدیر پر حقیقت میں بھی انقطاع بقار نہ ہوگا۔ البتہ متکلمین کے مذہب پر اشکال وارد ہوگا کیونکہ وہ زمانہ کو آنات سے مرکب مانتے ہیں ان کے نزدیک فنار آنی سے بھی بقار کا انقطاع ہو سکتا ہے سو اس صورت میں جواب یہ ہوگا کہ گو حقیقت میں انقطاع ہو گیا مگر عرفاً انقطاع نہیں ہوا کیونکہ عرفاً امور عادیہ میں فنار آنی مانع استمرار نہیں ہوتی۔ مگر اس مسئلہ میں کہ زمانہ آنات سے مرکب ہے یا نہیں ہم کو متکلین کا مذہب ماننا ضروری نہیں اگر ہم حکماء کے مذہب کو لے لیں تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ شریعت نے اس مسئلہ میں سکوت کیا ہے محض عقلی مسئلہ ہے جس کا مبنیٰ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔

ترکیب اجسام

وہ یہ کہ حکمار اجسام کی ترکیب ہیولی اور صورت سے مانتے ہیں اور جسم کو متصل واحد مانتے ہیں اور متکلمین اس کو اجزار لاتیجزی سے مرکب

مانتے ہیں جیسا کہ اس وقت اہل سائنس بھی ذرات سے مرکب مانتے ہیں جب ایک زمانہ میں کسی مسافت پر حرکت ہوتی ہے تو وہ حرکت اور وہ زمانہ اور وہ مسافت ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں حکماء کے نزدیک جب مسافت واحد ہے تو زمانہ اور حرکت سب متصل واحد ہیں اور متکلمین کے نزدیک جب مسافت اجزاء لایتجزیٰ سے مرکب ہے تو زمانہ اور حرکت سب ایسے ہی اجزاء سے مرکب ہے اس لئے زمانہ کو آنات سے مرکب مانتے ہیں باقی متکلمین کے پاس خود اجزاء لایتجزیٰ کے وجود کی کوئی دلیل نہیں، صرف انہوں نے ہیولیٰ و صورت کے مسئلہ میں حکماء کی مخالفت کر کے یہ ایک احتمال بطور منع کے نکال کر اس کو مذہب قرار دیدیا

وجہ مخالفت

مخالفت کی وجہ یہ ہوئی کہ اگر ہیولیٰ و صورت سے مرکب مانیں گے تو اس کے قدم کا قائل ہونا پڑے گا اور قدم شرعاً و نصاً باطل ہے۔

حضرت حکیم الامت کی رائے گرامی

اب میں کہتا ہوں کہ قدم ہیولیٰ و صورت کے لوازم سے نہیں بلکہ وہ اس پر مستقل دلائل قائم کرتے ہیں جو محض باطل ہیں پس اگر کوئی ہیولیٰ و صورت کو مان کر ان کے قدم کا انکار کر دے تو اس میں کوئی محذور نہیں، غرض شرعاً یہ بھی جائز ہے کہ ہم ہیولیٰ و صورت کے وجود کو مان لیں اور ان کے قدم کو باطل کر دیں اور میرے نزدیک یہی اچھا ہے کیونکہ اجزاء لایتجزیٰ کے دلائل جو کچھ بیان کئے جاتے ہیں وہ بہت کمزور ہیں اور ثبوت ہیولیٰ و صورت کے دلائل قوی ہیں البتہ حکماء نے جو ان کے قدم پر دلائل قائم کئے ہیں وہ محض لچر ہیں تو ہمارے نزدیک اقویٰ یہ ہے کہ احکام کا

ترکیب تو ہیولیٰ وصورت سے ہے مگر یہ دونوں حادث بالذات اور حادث بالزمان ہیں نہ ان میں سے کسی کا قدم بالذات ثابت ہے (یہ تو حکما بھی مانتے ہیں) نہ قدم بالزمان ۔ چنانچہ اہل علم جانتے ہیں کہ جتنے دلائل قدم بالزمان پر قائم کئے گئے ہیں سب لغو ہیں

ایک شبہ کا جواب

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ قول تو ملفق ہو گیا کہ نہ متکلمین کا قول ہوا نہ حکما کا اور قول ملفق باطل ہے

جواب یہ ہے کہ اول تو قول ملفق شرعیات میں باطل ہے نہ عقلیات میں کیونکہ قول ملفق میں اجماع کا ترک لازم آتا ہے تو شرعیات میں اجماع کا ترک جائز نہیں اور عقلیات میں جائز بلکہ بعض اوقات واجب ہے اور اوپر عرض کر چکا ہوں کہ شریعت ہیولیٰ وصورت و اجزاء لا یتجزیٰ دونوں سے ساکت ہے

دوسرے اگر مقصود پر نظر کی جائے تو یہ قول متکلمین کے بھی خلاف نہیں ۔ کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ متکلمین کا مقصود اصلی قدم عالم کا ابطال ہے جو ہیولیٰ وصورت کو قدیم ماننے سے لازم آتا ہے اور اگر کوئی شخص ان کو حادث بالذات وبالزمان مان کر اجسام کو ان سے مرکب کہے تو متکلمین اس کے در پے نہ ہوں گے اور اس کی تغلیط نہ کریں گے ۔ پس جب جسم کو متصل واحد مان کر زمانہ کو بھی متصل واحد مان لیا جائے تو فناء آنی کے قائل ہونے سے اشکال بہت سہولت سے رفع ہو جائے گا یعنی ارواح کا بقاء زمانی ہے اور فناء آنی ہے تو استمرار بقاء حقیقۃً بھی منقطع نہ ہوئی اور حیات ملکوتیہ کے ابقی ہونے پر جو شبہ تھا وہ رفع ہو گیا اور اس کے ابقی ہونے کا دعویٰ بحالہ باقی رہا (الورد الفرسخی فی المولد

البرزخی ص ۲۹۴)

تعریف انسان

میں انسان کی تعریف میں بجائے حیوان ناطق کے حیوان متفکر کہا کرتا ہوں
کیونکہ مجھے انسان کی تعریف حیوان ناطق کرنے میں کلام ہے اس لئے کہ ناطق
کے حاصل معنی ہیں عاقل کے، تو اس تعریف کا حاصل یہ ہوا کہ عاقل صرف
انسان ہی ہے دوسرے حیوان میں عقل نہیں پائی جاتی حالانکہ یہ مشاہدہ کے
خلاف ہے دوسرے حیوانات میں بھی عقل ہوتی ہے اگر دوسرے حیوانات
میں عقل نہ ہوتی تو ان کو تعلیم کیسے دی جا سکتی تھی اشاروں پر کیسے چل سکتے تھے
اور یہ بدیہی امر ہے کہ تعلیم بلا عقل کے نہیں ہو سکتی، دیکھئے پاگل کو کوئی تعلیم
نہیں دے سکتا نہ ایسا سدھا سکتا ہے جیسا کہ جانوروں کو سدھایا جاتا ہے۔
میں نے خود ایسے واقعات کا مشاہدہ کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں
میں بھی عقل ہوتی ہے۔

چونکہ یہ مسئلہ تعریفِ انسان کا سمعی نہیں محض عقلی ہے اس لئے اگر
کوئی شخص حکمائے یونان کے قول کو خلاف تحقیق و مشاہدہ سمجھ کر چھوڑ دے
تو کچھ حرج نہیں۔

اشکال اور اس کا جواب

لیکن اشکال یہ ہوگا کہ حکمائے اسلام نے بھی تو ایسا لکھا ہے کہ عقل
صرف انسان میں ہے دوسرے حیوانات میں عقل نہیں اس اشکال کا جواب یہ
ہے کہ حکمائے اسلام نے جس عقل کی نفی کی ہے اس سے مراد عقل کا وہ درجہ ہے

جس سے احکام شرعیہ کی پابندی لازمی ہوجاتی ہے مطلقاً عقل کی نفی مقصود نہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ شریعت نے حیوانات کو مکلف نہیں کیا ہے لہذا فرمادیا کہ حیوانات میں عقل نہیں جو مدار تکلیف ہو سکے۔ خلاصہ یہ کہ حیوانات میں عقل ہے تو ضرور جس کی وجہ سے انسان کی تعریف حیوان ناطق کے ساتھ صحیح نہیں ٹھہرتی مگر اتنی نہیں کہ جس کی وجہ سے ان کو مکلف کہا جا سکتا۔

سیاست

حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر شعبہ میں جو عظیم خدمات لی ہیں ان کی نظیر زمانہ حال میں تو کیا ماضی کی بھی کئی صدیوں میں ڈھونڈھنے سے بمشکل ملیگی۔ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس کے بارے میں حضرت تھانویؒ نے دین کی تعلیمات کو واضح نہ کیا ہو، جیسا کہ زیر نظر "مجموعہ مقالات اشرفیہ" کے مطالعہ سے واضح ہو رہا ہے دین کے دوسرے شعبوں کی طرح اسلام کے احکام سیاست سے بھی متعلق ہیں اس لئے حضرت نے اسلام کے سیاسی احکام پر بھی اپنی تصانیف اور مواعظ وغیرہ میں جابجا جامع تحقیق فرمائی ہیں جس سے احکام اسلام کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کے غیر اسلامی سیاسی نظاموں کی فکری اور عملی غلطیوں پر بھی بھرپور تبصرے شامل ہیں۔

اسلام میں سیاست کا مقام

سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام میں سیاست کا مقام کیا ہے؟ عیسائیت کا باطل نظریہ مشہور ہے کہ "قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو"

[illegible] کا حاصل یہ ہے کہ مذہب کا سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

دین و سیاست کی تفریق کا یہی نظریہ اس زمانہ میں ترقی کر کے "سیکولرازم" کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ اسلام جیسے جامع دین میں اس طرح کے غلط نظریہ کی کسی طرح بھی گنجائش نہیں ہے اسلام کی تعلیمات ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہیں جس میں سیاست بھی داخل ہے اور اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اس لئے دین کے سیاست سے جدا ہونے کا تصور غیر اسلامی اور دین کو ناقص قرار دینے کے مترادف ہے، غالباً اسی کی تردید میں علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ؎

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس میں بھی ایک تعبیری کوتاہی رہ گئی کہ کہنا تو یہ چاہئے تھا کہ "سیاست" کو دین سے الگ نہ ہونا چاہئے اس سے سیاست کے اصل اور دین کے تابع ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے حالانکہ دین مجموعہ ہے عبادات و معاملات و سیاست وغیرہ کا۔ اور سیاست اس کا ایک شعبہ ہے، اور شعبہ اصل کے تابع ہوا کرتا ہے اصل شعبہ کے تابع نہیں ہوا کرتی۔ مقصد یہ ہے کہ سیاست کی وجہ سے دین کے کسی حکم کو نہیں بدلا جا سکتا بلکہ سیاست کو دین کے احکام کے تابع رہنا چاہئے۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے دوسرے احکام کی طرح ان احکام پر بھی بقدر قدرت عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کرے اور عوام کا فرض ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق ایسی حکومت کے قیام کی کوشش کریں مگر یہ بات درست نہیں ہے کہ سیاست اور حکومت اسلام کا مقصود اصلی اور اس کا حقیقی نصب العین اور بعثت انبیاء کا مطمح نظر ہے

اور اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ کی حیثیت صرف ثانوی ہے گویا جو چیز وسیلہ تھی اس کو مقصد بنا دیا جائے اور جو مقصد تھا وہ ایک غیر اہم اور وسیلہ بن جائے۔

حضرت تھانوی فرماتے ہیں:۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور"

وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے،،

اس سے واضح ہے کہ دیانات مقصود بالذات (اصلی مقصود) ہیں اور سیاسات وجہاد مقصود اصلی نہیں ہے بلکہ اقامت دیانات کا وسیلہ ہے یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاست وجہاد سب کو نہیں دیا گیا بلکہ جہاں ضرورت ومصلحت سمجھی گئی دی گئی ورنہ نہیں، وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ بقدر ضرورت ہی دیئے جاتے ہیں (خاتمۃ السوانح ص۵۵/۵۶)

آگے اس کے خلاف کا شبہ جو دوسری آیات سے بظاہر نظر واقع ہوتا ہے اس کو رفع فرما کر فرماتے ہیں:۔

بہر حال واضح ہوا کہ سیاست و دیانت میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجہ میں بھی مطلوب نہیں بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصود اصلی نہیں ہے

اور دیانت خود مقصود اصلی ہے (خاتمۃ السوانح ص۲۵)

خلاصہ یہ کہ نہ تو وہ سیکولر نظریہ ہی درست ہے کہ سیاست اور حکومت میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی یہ خیال صحیح ہے کہ دین کا اصل مقصود ہی سیاست و حکومت ہے، دین کا اصل مقصد بندے کا اپنے خالق سے تعلق قائم کرنا ہے جس کا مظاہرہ عبادات و طاعت کے ذریعہ ہوتا ہے سیاست و حکومت بھی اسی مقصد کی تحصیل کا ذریعہ ہے اس سے واضح ہوا کہ اسلام میں سیاست کا صحیح مقام یہی ہے کہ وہ حصول مقاصد کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے لہٰذا اسلام میں وہی سیاست و حکومت مطلوب ہے، جو اس مقصد تحصیل دیانت یعنی طاعت و عبادت میں مددگار ہو اور جو سیاست اس مقصد کی تحصیل کا ذریعہ نہ ہو وہ ہرگز اسلامی سیاست نہیں ہے۔

سیاست اور اہل مدارس

حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ :۔

ایک جماعت ایسی بھی رہنی چاہئے جو خاص حفاظت دیانت اور تعلیم دین میں مشغول ہو۔ اور وہ جماعت اہل مدارس کی ہی ہو سکتی ہے اسی لئے میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلباء کو سیاست میں ملوث نہ کیا جائے، طلباء اگر ان قصوں میں پڑ گئے تو تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے اور تربیت بھی ان کی نہ ہو گی۔ چنانچہ جب سے طلباء کو اس سلسلہ میں ڈال دیا گیا ہے ان میں آزادی پیدا ہو گئی ہے (خاتمہ)

آج کل ہمارے عزیز طلبہ دین کے جن شعبوں، تعلیم و تعلم، تصحیح عقائد و اعمال تبلیغ و اشاعت وغیرہ میں اشتغال کو سیاست میں حصہ لینے سے کمتر اور فروتر تصور کر کے ان مقدس مشاغل اور اصل خدمت دین کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں

ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان علمی مشاغل میں اشتغال ہی دین کی اصل خدمت ہے اور جو جماعت علماء اس میں مشغول ہے وہ اپنے اصل فرضِ منصبی کے انجام دینے میں لگی ہوئی ہے۔ ہمارے اسلاف کرام اور اکابر علماء دیوبندؒ نے بھی اپنی عمروں کا زیادہ تر حصہ اسی تعلیم و تعلم اور تربیت و اصلاح کے مشاغل میں مدارس اور خانقاہوں ہی میں گذارا ہے اور اسی تعلیم و تربیت کو دین کی اہم اور اصل خدمت اور اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ضرورت کے وقت ملکی حالات اور سیاست میں عملی حصہ لیا ہے اور اس شعبہ میں بھی بڑی قابل قدر اور بے مثال خدمات انجام دی ہیں مگر ان کا اصل کام یہ نہیں تھا۔ اصل کام وہی تھا جس میں عمر کا بیشتر حصہ گذارا ہے

علماء کا اصل فرض منصبی

علماء کا اصل فرض منصبی اور وظیفۂ زندگی احکام شرعیہ کی تحقیق و تنقیح کرنا ہے اور تصنیف و تالیف، افتاء اور تبلیغ کے ذریعہ دین کی حفاظت و اشاعت ہے اس لئے علماء کی جو جماعت احکام شرعیہ کی تحقیق و تنقیح وغیرہ میں مصروف عمل ہے اور اس وجہ سے وہ امور سیاسیہ میں حصہ نہیں لیتی وہ جماعت علماء اپنے اصل فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگی ہوئی ہے اس لئے باعتبار اپنے منصب کے نہ تو وہ کسی کوتاہی عمل کی مرتکب ہو رہی ہے اور نہ ہی عملی طور پر کسی نقص میں مبتلا ہے اس لئے وہ ہرگز کسی طعن و ملامت کے مستحق نہیں ہے اس پر طعن و ملامت حقیقت سے ناواقفیت اور بے بصیرتی کی دلیل ہے کیونکہ دین کا یہ شعبہ سیاست اپنی ذات کے لحاظ سے خود مطلوب و مقصود نہیں ہے بلکہ دین کے دوسرے شعبوں عقائد و عبادات وغیرہ کے قائم کرنے کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے جس کی

کسی قدر تفصیل اوپر گذر چکی ہے

تقسیم خدمات کے اصول

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ علماء کی پوری جماعت سیاست میں عملی حصہ لے اور سب کے سب ملکی سیاست اور امور مملکت کے انجام دینے میں بھی مشغول ہو جائیں بلکہ تقسیم خدمات کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لئے بقدر کفایت ایک جماعت کا تیار ہو جانا ہی کافی ہے اور یہ بھی جب ہے، جب وہ سیاست شرعیہ ہو اور اس میں شریعت کے حدود و قیود کو ملحوظ رکھا گیا ہو، ورنہ آجکل کی بے قید جمہوری سیاست کا تو شرعی معیار پر درست اترنا ہی مشکل ہے اس کی شرکت کو لازم قرار دینا اور دین کے دوسرے تمام شعبوں پر اس کو فوقیت دینا تو کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جمہوریت

حضرت حکیم الامت تھانوی نے اپنے متعدد مواعظ و ملفوظات و تصانیف میں ثابت کیا ہے کہ جمہوریت اسلامی چیز نہیں ہے اس جمہوریت پر بحث فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

"غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں ہے اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری حکومت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں۔

(تقلیل الاختلاط مع الانام)

پھر اس کی تفصیل کی گئی ہے جو کہ قابل ملاحظہ ہے۔ مزید ارشاد ہے

"بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں وشاورھم فی الامر مگر یہ غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا۔ اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو، چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں، اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں، جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے (۲)"

کثرت رائے

جمہوریت میں کثرت رائے کو ایسا مقام دے رکھا ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیفات اور مواعظ وملفوظات میں کثرت رائے کو معیار حق قرار دینے کی جا بجا تردید فرمائی ہے ایک وعظ میں فرماتے ہیں کہ:۔

آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا؟

ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف، آخر انہوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام اپنے سر لیا۔ اس لئے کہ وہ قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔

(فضائل العلم)

مطلب واضح ہے کہ عوام کی کثرت رائے کبھی معیار حق نہیں ہو سکتی" کیونکہ عوام میں کثرت عموماً بے علم یا کم علم لوگوں کی ہوتی ہے۔

ایک موقعہ پر ارشاد ہے کہ:۔

مولانا محمد حسین الہٰ آبادی مرحوم نے سرسید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو، کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ، تو اس قاعدے کی بناء پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔"

(تقلیل الاختلاط مع الانام)

آگے چل کر اسی وعظ میں حضرت تھانوی نے کثرت رائے کی لازمی حقانیت کے خلاف حضرت صدیق اکبر کے اس طرز عمل کی مثال بھی دی ہے کہ:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا ارادہ فرمایا حضرت عمر سمیت بیشتر صحابہ کی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد نہ کیا جائے لیکن حضرت صدیق اکبرؓ اپنی رائے پر قائم رہے اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی ہوا۔ اور بعد میں سب لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ صائب رائے یہی تھی"۔

غرضیکہ حضرت والا نے کثرت رائے کو معیار حق قرار دینے کے نظریہ پر شرعی اور عقلی دونوں قسم کے دلائل سے تنقید فرمائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ نظریہ شرعی اور عقلی دلائل کی رو سے غلط اور فطرت کے خلاف ہے۔

جدید علم سیاست کے بعض حقیقت پسند ماہرین نے بھی جمہوریت کے ان نقائص کو تسلیم کیا ہے۔ اس کی تفصیل مولانا محمد تقی عثمانی کے مقالہ "حکیم الامت کے سیاسی افکار" اشاعت خاص "المحسن" جامعہ اشرفیہ لاہور میں قابل ملاحظہ ہے

جمہوریت کے بارہ میں علامہ اقبال مرحوم نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

"جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو ۔ کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

علامہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں جمہوری طرز حکومت کی خرابی بیان کر کے اس سے اجتناب کرنے کو کہا ہے اور شخصی طرز حکومت "غلامے پختہ کارے شو" پر عمل کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اور حضرت حکیم الامت تھانوی نے بھی فرمایا ہے کہ اس کثرت رائے کے فیصلہ میں بھی وہ خرابی موجود ہے جو شخصی رائے میں بیان کی جاتی ہے۔

تو اب بتلائیے کہ ایک شخص کی غلامی اور استبداد سے پارلیمنٹ کی غلامی اور اس کا استبداد کیوں افضل ہے۔ یقیناً بیس تیس آدمیوں کی غلامی سے ایک کی غلامی بہتر ہوگی۔ (ارشادات حکیم الامت صفحہ ۵۳۴)

اصل میں جمہوریت مغرب کی ایجاد ہے بعض لوگوں نے اسلام میں بھی جمہوریت

کو ثابت کرنا شروع کر دیا حالانکہ اسلام اس غیر فطری جمہوریت کا قائل نہیں ہے جیسا کہ اوپر شرعی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ اور کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور اس کو معیار حق قرار دینا بھی شرعاً غلط ہے اور اس کا قانونِ فطرت کے خلاف ہونا بھی اوپر ثابت کر دیا گیا ہے۔ حکیم الامت تھانوی کی سیاسی خدمات کے زیر عنوان مقالہ کو حضرت کے ان مختصر مگر جامع ارشادات کی روشنی میں ملاحظہ کرنا چاہیے۔

حکیم الامت تھانوی رحؒ کی خدمت فنِ تجوید و قرآت

قرآن فہمی اور معانی قرآن سے متعلقہ علوم میں تو حضرت والا نہایت بلند مقام پر فائز تھے ہی جیسا کہ علوم قرآنی سے متعلقہ آپ کی تصانیف سے ظاہر ہے اور اس مجموعہ مقالاتِ اشرفیہ سے بھی واضح ہے اس کے ساتھ ہی آپ الفاظ قرآنی کے بھی ماہر اور فن تجوید و قرآت کے بھی امام تھے۔ الفاظ قرآنی کے موضوع پر بھی آپ نے مختلف انداز سے تقریباً دس کتابیں لکھی ہیں اور آپ کے مواعظ اور دوسری تصانیف میں بھی اس فن تجوید و قرآت سے متعلق جا بجا عمدہ تحقیقات ملتی ہیں۔ زیر نظر مجموعہ مقالات اشرفیہ کے مقالہ، حکیم الامت کے آثار علمیہ میں ان تصانیف متعلقہ تجوید و قرآت کا مختصر طریقہ پر تعارف کرا دیا گیا ہے اور تفصیلی تعارف اسی مجموعہ کے مقالہ "حکیم الامت تھانوی رحؒ کی خدمت فن تجوید و قرآت" میں ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے۔

وھو الموفق والمعین وھو حسبی ونعم الوکیل

مجموعہ مقالاتِ اشرفیہ کا مختصر تعارف

اس تمہیدی گذارش کے بعد عرض ہے کہ زیر نظر یہ مجموعہ چوبیس [۲۴] مقالات پر مشتمل ہے اس کے حصہ دوم میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی گرانقدر دینی خدمات کا تعارف کرایا گیا ہے، تفسیر، حدیث، فقہ تصوف، تجوید وقرآت، علم سیاست وغیرہ دین کے ہر شعبہ سے متعلق مقالہ لکھا گیا ہے اور آپ کی دینی خدمات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

آپ کی علمی جامعیت وبصیرت کا اندازہ ان مقالات کے ملاحظہ کے بعد ہی ہو سکیگا اور معلوم ہوگا کہ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے بلند پایہ خدمات انجام نہ دی ہوں، ہر شعبہ میں آپ کی تصانیف موجود ہیں، اس مجموعہ کا اصل مقصد اسی خدمت کا تعارف کرانا ہے تاکہ عام مسلمانوں کو حکیم الامت مجدد الملت کی حکیمانہ اور مجددانہ اصلاحات وتحقیقات سے استفادہ کا موقع ملے اور افادہ عام ہو۔

تیسرے حصہ میں حضرت والا کی سیاسی خدمات اور تحریک پاکستان کے سلسلہ کی جدوجہد کا تذکرہ ہے،

حصہ اول میں حضرت حکیم الامت کی ذات گرامی اور عظیم شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں مقالے لکھے گئے ہیں۔ کسی شخصیت کے تعارف کا مقصد اس کے اقوال وافعال پر اعتماد کا اظہار ہوتا ہے اور اس کی تحقیقات

کو قابل قبول اور لائق تقلید باور کرانا ہوتا ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ ان مجموعہ مقالات سے حضرت حکیم الامت تھانوی رح کی علمی جامعیت اور دین کے ہر شعبہ میں آپ کی دینی خدمات تعارف بھی باحسن وجوہ ہو رہا ہے اور آپ کی سیاسی خدمات و رجحانات اور تحریک پاکستان کی جدوجہد پر بھی روشنی پڑ رہی ہے اور آپ کی جامع کمالات شخصیت کے محاسن و فضائل کا بیان بھی عمدہ پیرایوں سے ہو رہا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مقالات کے تحریک کنندہ مولانا وکیل احمد صاحب اور ان مقالات کے تحریر کرنیوالوں کی محنتوں اور کوششوں کو حسن قبول عطا فرمادیں اور ان کو عام وخاص مسلمانوں کے لئے نافع بنائیں۔ آمین

اب ناظرین کی خدمت میں عرض ہے کہ اس مجموعہ مقالات کو غور سے ملاحظہ فرمائیں اور اس کی قدر کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی ہمہ صفات جامع کمالات شخصیت کے علوم سے استفادہ کی توفیق عنایت فرمادیں آمین یا رب العالمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

نوٹ

حضرت حکیم الامتؒ اور مجلس صیانۃ المسلمین کی عظیم الشان خدمات کا تفصیلی تعارف

مستقل کتاب "مجلس صیانۃ المسلمین کا تاریخی پس منظر" میں کرا دیا گیا ہے جس کو بڑی محنت سے مولانا وکیل احمد صاحب شیروانی سلمہ (مرتب اشرف المقالات) نے مرتب کیا ہے یہ موضوع اپنی اہمیت اور تفصیل کے اعتبار سے علیحدہ کتاب ہی کا مستحق تھا۔

باقی حضرتؒ کی غیر مسلموں کے شبہات کے جوابات نیز مسلمانوں کے قدیم اور جدید شبہات کے جوابات میں کتاب "اشرف الجواب لشفاء المرتاب" تین حصوں میں شائع ہو چکی ہے ـــــــــــــــ

ـــــــــــــ "سید عبد الشکور ترمذی عفی عنہ"

اشرف المقالات کی اشاعت مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان کا ایک عظیم کارنامہ ہے

از حضرت مولانا سید نجم الحسن صاحب تھانوی ناظم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات گرامی اپنی مختلف النوع خصوصیات، محاسن و کمالات اور ممتاز کارنامہ تبلیغ کی بناء پر کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں۔ حق تعالیٰ نے جو ان کو علمی و عملی کمالات عطا فرمائے اور تقویٰ کے جس مقام پر فائز فرمایا وہ ابتداء عمر ہی سے معروف و مشہور اور سب کی نظروں میں تھا۔ اسی کی برکت سے حق تعالیٰ نے اپنی معرفتِ کاملہ اور امور دین کی خاص فہم و فراست سے نوازا اور اصلاح امت کی آسان اور مؤثر و مفید تدبیریں من جانب اللہ آپ کو عطا ہوئیں اور یہ ایسی چیز ہے جو امت میں خاص خاص حضرات کو نصیب ہوتی ہے

وہ اپنے وقت کے مجدد، حکیم الامت، شیخ طریقت، اور مسندِ رشد و ہدایت کے آفتاب و مہتاب تھے۔ صدیوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے امت کی اصلاح کا سامان اس طرح فرمایا کہ انہوں نے دین کے ہر شعبے میں مجددانہ و محققانہ خدمات انجام دیں۔ اور بیس سال کی عمر سے لے کر تقریباً تریسٹھ سال کی مدت تک عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت و اخلاقیات کی ایک ہمہ گیر اور سیر حاصل تبلیغ و تعلیم اور تربیت فرمائی ؎

تریسٹھ سال تک تو نے ہمیں تبلیغ فرمائی
یہی وہ عمر تھی جو سرور کونین نے پائی

مذکورہ پانچوں شعبوں میں آپ کی متعدد تصانیف و تالیفات مشہد وجود

میں آئیں اور سیکڑوں مواعظ و ہزاروں ملفوظات قلم بند ہوکر امت کی ہدایت کا ذریعہ بنے، اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں مذہبی شعور اور اسلامی شعائر کی طرف رجحان پیدا ہونے لگا۔ اور ہزاروں لوگوں کی زندگی میں دینی انقلاب واقع ہوا۔ چنانچہ خواص وعوام کا جتنا بڑا طبقہ حکیم الامت رح کے فیض سے مستفیض ہوا۔ اس کی مثال اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ علماء و صلحاء اور متقین کی ایک ایسی جماعت تیار کی جنہوں نے آپ کی حیات میں اور آپ کے بعد بھی آپ ہی کے تعلیم کردہ طریقوں سے امت کی اصلاح کے کام کو آگے بڑھایا اور بڑھا رہے ہیں کثر اللہ فینا امثالہم۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ افراد سازی میں بھی حضرت حکیم الامت کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ممتاز اور منفرد مقام عطا فرمایا تھا جو محض موہبت اور عطیہ خداوندی تھا۔

ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسے دور میں پیدا فرمایا کہ جب جہالت دین کے لباس میں پھیلی ہوئی تھی۔ تعلیمات اسلام پر رسم ورواج کی دبیز تہہ چڑھ گئی تھی تصوف کے نام پر رہبانیت کی تعلیم دی جارہی تھی۔ محبت رسول کے نام پر رسوم بدعت کفر وشرک کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی رسم ورواج پکڑ رہی تھیں حقائق پوشیدہ ہورہے تھے اور ان کی جگہ توہمات نے لے لی تھی۔ قوم کے افراد بے راہ روی کا شکار تھے مغربی تعلیم کے زیر اثر الحاد و دہریت اور نیچریت فروغ پا رہے تھے۔ غرض پوری قوم ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں سے اس کو واپس لانا جوئے شیر لانے سے کم تر تھا۔ ایسے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے مصلح، مجدد، محقق کو بھیجا۔ جو امت کی اصلاح کی فکر میں انبیاء کا سچا وارث اور نائب تھا جس نے بلا خوف لومۃ لائم دینِ حق کے چہرے سے تمام غبار صاف کرکے اصلی صورت میں امت کو دین سے متعارف کرا دیا۔

حضرت حکیم الامت نے جس طرح شریعت ظاہرہ کو جہالت وضلالت کی تاریکیوں سے نکالنے کا کام انجام دیا اسی طرح طریقت باطنہ کو افراط وتفریط کی بھول بھلیوں سے نجات دلائی۔ آپ نے مسائل تصوف وسلوک اپنی مصلحانہ جدوجہد، و توجہات خصوصی کا مرکز بنالیا تھا اور اپنی متعدد تصانیف اور اکثر وبیشتر مواعظ وملفوظات کے ذریعہ اس کی حقیقت وغایت اور اہمیت وضرورت کو واضح کرکے جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کی اصلاح فرمائی جو شریعت اور طریقت کو دو چیزیں سمجھتے اور سمجھاتے رہے، آپ نے تمام عمر یہی تلقین فرمائی کہ طریقت میں شریعت ہے۔ احکام الٰہی کی باخلاص تمام تعمیل وتکمیل ہی کا نام طریقت ہے باقی سب ہیچ ہے۔ تصوف کے بغیر دین و ایمان کامل نہیں ہوتا۔ یہی خواص امت کا مذہب ہے۔

حکیم الامت کی تجدید طریقت کا بڑا کمال یہی ہے کہ آپ نے طریقت کو حشو وزوائد سے پاک وصاف کرکے صبغۃ اللہ اور سلف صالحین کے رنگ میں پیش کیا۔ نیز اس کو دین متین کا ایک اہم اور بنیادی شعبہ ثابت کر دکھایا۔
مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہمیت فقط سلوک وطریقت کیوجہ سے نہ تھی آپ ایک زبردست عالم اور کامیاب مدرس تھے آپ نے دیوبند سے تکمیل علوم کے بعد چودہ سال تک درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ کئی اکابر علماء آپ کے شاگرد ہوئے۔ طریق درس وتدریس میں بھی اصلاحیں کیں انضباط اوقات اور ٹھوس کام کرنے کا بھی آپ کو بڑا ملکہ تھا۔ تصنیف وتالیف کے سلسلے کا آغاز بھی اٹھارہ سال کی عمر ہی سے ہو گیا تھا۔ ہر معاملہ میں آپ صحت و سلامت روی کا طریقہ اختیار کرتے۔ اعتدال وانصاف اور معاملہ فہمی کا خیال رکھتے۔

طویل عرصہ سے امت مسلمہ جس سانحے سے دوچار ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کا مرکز کوئی نہیں ہے پھر ان کو اس امر کا احساس بھی نہیں اس کا حضرت کی طبیعت پر بہت اثر تھا، دوسرے شفقت علی الخلق کا امتیازی جذبہ جو آپ کو فطری طور پر عطا ہوا تھا اس کے سبب سے امت کی خیر خواہی اور اس کی صلاح و فلاح کا فکر ہمہ وقت آپ پر طاری رہتا تھا۔ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی، پستی اور زوال کا (جس کی وجہ سے یہ قوم ناقابل برداشت مصائب اور مشکلات سے دوچار ہے) تجزیہ کر کے تین اسباب کی نشاندہی فرمائی اور مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ اگر ان تین چیزوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے تو قوم تازہ دم ہو کر ابھرے گی اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور گم کردہ وقار کو حاصل کر لے گی۔ وہ تین اسباب مندرجہ ذیل ہیں

(۱) جہل و نادانی (یعنی دین سے ناواقفیت) (۲) افلاس و غربت (۳) تشویش و بے اطمینانی۔

ان اسباب کو دور کیسے کیا جائے؟ اس کے لئے حکیم الامت قدس سرہٗ نے شریعت مطہرہ کی روشنی میں ۲۵ عنوانات پر مشتمل ایک لائحہ عمل اپنی معرکۃ الآراء تصنیف حیٰوۃ المسلمین کی صورت میں تجویز فرمایا۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ انہی تین قسم کے اعمال کی طرف امت کی رہبری فرمائی گئی ہے اور ہر عمل کو ایک روح کے ساتھ ملقب فرمایا جو فہرست ہے ان اعمال کی جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمان دین و دنیا کے مختلف میدانوں میں کامیابی و کامرانی سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان اصول حیات کی وسیع پیمانہ پر عملی ترویج اور مسلمانوں کی زندگی میں ان کے مکمل نفاذ کی منظم طریقہ پر جدوجہد کے لئے ۳۱ دفعات پر مشتمل ایک مکمل نظام عمل صیانۃ المسلمین کے نام سے ۱۳۱۵ھ میں جاری فرمایا اور امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو دین متین کی حفاظت ذاتی اجتماعی اصلاح

اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی تدابیر مرتب فرمائیں اس طرح دعوت و تبلیغ کے طریقہ کار میں حضرت حکیم الامت رح نے وہ انوکھا مؤثر و الہامی طریقہ جاری فرمایا جس میں دین کے کسی ایک شعبہ کی تبلیغ نہیں بلکہ پورے نظام شریعت کی بیک وقت تبلیغ ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں دو رسالے تفہیم المسلمین اور تعلیم المسلمین تحریر فرما کر ہر طبقہ کے لئے ایک ایسا مفید اور مؤثر طریقہ تجویز فرما دیا جس سے دعوت و تبلیغ میں کشش و جاذبیت پیدا ہو گئی، تبلیغ کے اصول متعین ہو گئے اور مبلغین کی اہلیت کی تعیین فرما دی گئی، جن جن چیزوں کی تبلیغ اس وقت مقدم ہے وہ سامنے آ گئیں۔ اگر مسلمان اس دستور العمل کو اختیار کر لیں، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تائید غیبی کی یوں بشارت دی ہے کہ"

میں خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے کہتا ہوں کہ (انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ تمہیں سربلند ہو گے بشرطیکہ پورے مومن رہے) کا ظہور ہو جائے گا (لیکن) عمل شرط ہے جیسے اعلیٰ درجہ کا ماء اللحم بوتلوں میں بھرا ہوا قیمتی ہے مگر نتیجہ خیز نہیں یہ نفع اس کا اس وقت ظاہر ہوگا جبکہ حلق سے اترے گا۔ ورنہ بدوں عمل یہ سب کوشش اس کا مصداق ہوگی۔

"نشستند، و گفتند و برخاستند"

مجلس صیانۃ المسلمین

اپنے زمانہ قیام سے حضرت حکیم الامت تھانوی رح کی وفات ۱۹۴۳ء تک بلکہ ۱۹۴۷ء تک متحدہ ہندوستان میں متحرک اور فعال رہی۔ قیام پاکستان

کے بعد حضرت تھانویؒ کے ایک جلیل القدر خلیفہ خاص حضرت مولانا جلیل احمد صاحب شیروانی رحمۃ اللہ علیہ نے بانی جامعہ اشرفیہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سرپرستی میں جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور میں اسکا احیاء فرمایا۔

مجلس صیانۃ المسلمین اس وقت سے آج تک اسی طور وطریق پر کام کر رہی ہے۔ اور اس کا کاروانِ علم وصلاح حضرت حکیم الامت کے متعین فرمودہ خطوط پر گامزن اور نام ونمود سے گریزاں نمائش وہنگامے سے دور رہتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے، چنانچہ مجلس نے اصلاح وتذکیر تصنیف وتالیف، تبلیغ واصلاح اور عوام تک دین کی بات براہ راست پہنچانے کی تمام صورتوں کو بیک وقت اپنا محور عمل بنایا ہوا ہے۔ مجلس کے زیر اہتمام اصلاحی تبلیغی جلسے بھی منعقد کئے جاتے ہیں دینی اصلاحی مجلسیں بھی ہوتی ہیں۔ مختلف موضوعات پر تحریر وتالیف اور نشر واشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ مختلف علاقوں اور متعدد مقامات پر ستّر سے زائد نمائندہ شاخیں اور منتخب دینی وعلمی واصلاحی کتابوں پر مشتمل لائبریریاں قائم ہیں۔ تعارفی کتابچے، پمفلٹوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے دینی تعلیمات پر مشتمل چارٹ اور ہینڈ بل بھی کثیر تعداد میں شائع کئے جاتے ہیں

مجلس کا سدابہار تحفہ اس کا ترجمان ماہنامہ الصیانۃ ہے جو تقریباً تین سال سے پابندی وقت کے ساتھ چھپ رہا ہے اور علوم قرآن و سنت کی تبلیغ واشاعت اور حضرت حکیم الامت کی نادر وکمیاب تالیفات و باقیات کی اشاعت میں مصروف ہے،،

اسی سلسلے کی یہ کوشش زیر نظر مجموعہ مقالات بھی ہے جو بانی مجلس حضرت

حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی خدمات کے اعتراف میں مختلف اوقات میں متعدد موضوعات پر لکھے گئے جن میں مشاہیر ہند وپاک نے ان کی مساعی کو اپنے مقالات کی صورت میں سراہا اور اجاگر کیا ہے۔ یہ مقالات مجلس صیانۃ المسلمین کے علمی ذخیرہ میں عرصہ سے اشاعت کے منتظر تھے۔ لیکن بعض دوسرے اہم پروگراموں کی طرح وسائل محدود ہونے کی وجہ سے منصۂ شہود پر نہ آسکے تھے وکل شیئ مرھون باوقاتہٖ۔ مجلس کی اس گرانقدر علمی وعرفانی اضافہ کے لئے مولانا وکیل احمد صاحب شیروانی ناظم نشرواشاعت وخلیفۂ مجاز مسیح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ خانصاحب جلال آبادی قدس سرہٗ کی مستعد وفعال شخصیت قابل صد مبارکباد ہے جن کی سعی وکوشش سے حضرت حکیم الامت کی گوناگوں خدمات متعدد اوصاف وکمالات، اور عظیم کارناموں سے منتسبین کو واقف ومتعارف ہونیکا موقع فراہم ہوا۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ ارباب مجلس کی اس مبارک و مفید کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول سے نوازے اور مجلس کے تمام زیر تجویز پروگراموں کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ جو افراد کی قلت یا مالی وسائل کی کمی کی بناء پر ہنوز معرض التوا میں ہیں۔

نجم الحسن تھانوی

ناظم خانقاہ امدادیہ اشرفیہ

تھانہ بھون۔ انڈیا

حصہ
اول
حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے
حالاتِ زندگی و مصروفیاتِ زندگی

حضرت تھانوی رح
کے
حالات
و
مصروفیاتِ زندگی
از
حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب عارفی رح

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

حالات و مصروفیاتِ زندگی

حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وطن مالوف و مقام پیدائش تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یوپی ہندوستان تھا۔ آپ کا یوم ولادتِ باسعادت چہار شنبہ ۵ ربیع الاول ۱۲۸۰؁ھ ہے۔ قصبہ میں آپ کے آبا و اجداد کا خاندان نہایت معزز و ممتاز تھا۔ آپ کے والد ماجد منشی عبدالحق صاحبؒ بڑے صاحب وجاہت، صاحب منصب اور صاحب جائداد رئیس تھے اور بڑے اہل دل بزرگ تھے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نسباً فاروقی مذہباً حنفی تھے اور مسلکاً سلسلہ امدادیہ صابریہ چشتیہ سے وابستہ ہو کر منصب خلافت و رشد و ہدایت پر فائز ہوئے۔ حضرتؒ کا بچپن وطن ہی میں گذرا اور وہیں ناظرہ و حفظ قرآن اور عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر علوم دینیہ کی تکمیل کے لئے ۱۲۹۵؁ھ میں دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے اور جید علماء اور مدرسین سے فیضانِ علوم حاصل کر کے ۱۳۰۱؁ھ میں فارغ التحصیل ہوئے گویا ادھر چودھویں صدی کا آغاز ہو رہا تھا اور ادھر احیاء و تجدید دین مبین کے لئے یہ مجدد عصر تیار ہو رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فضل عظیم تھا کہ حضرتؒ کو مدرسہ دار العلوم دیوبند ایسی شہرہ آفاق اور مستند درس گاہ میں تحصیل علوم اور تکمیل درسیات کا موقع نصیب ہوا جہاں خوبی قسمت سے

اس وقت بڑے منتخب اور یگانۂ عصر و جامع کمالات وصفات اہل اللہ اور اساتذہ کا مجمع تھا جن کے فیوض و برکاتِ علمی و ایمانی کا آج بھی عالم اسلام معترف ہے۔ ان میں اکثر حضرات جناب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ العزیز کے سلسلہ سے وابستہ اور بعض ان کے خلفائے راشدین میں تھے، ایسے نورانی ماحول میں اور ان حضرات کے فیضانِ صحبت سے بعونہٖ تعالیٰ حضرتؒ کی باطنی صلاحیت و استعداد بھی تربیت پذیر ہوتی رہی۔

یوں تو تمام بزرگوں اور اساتذہؒ کی توجہات خصوصی کی سعادت حضرتؒ کو حاصل تھی۔ مگر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ العزیز اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز کو خاص طور پر حضرتؒ کے ساتھ محبت و شفقت کا تعلق تھا اور حضرتؒ کو بھی ان بزرگوں کے ساتھ نہایت والہانہ عقیدت و محبت تھی چنانچہ اکثر و بیشتر ان حضرات کا ذکر بڑے کیف و سرور کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔

حضرتؒ کو مدرسہ دیوبند میں داخل ہونے کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز سے حصول سعادت کا زیادہ موقع نہیں ملا کیونکہ سال بھر کے بعد ہی حضرت ممدوح کا وصال ہوگیا تھا۔ البتہ اول الذکر دونوں بزرگوں سے رابطہ قلبی بہت بڑھتا رہا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "مجھکو حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز سے اس درجہ عقیدت تھی کہ سوائے حضرت حاجی صاحبؒ کے اور کسی سے ایسی نہ تھی۔ میں نے ایسا جامع ظاہر و باطن بزرگ کوئی اور نہیں دیکھا، اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت استدلالی تھی مگر مولاناؒ کے ساتھ غیر استدلالی تھی۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اول مولاناؒ ہی سے مدرسہ دیوبند میں بیعت کی درخواست کی تھی لیکن مولانا نے طالب علمی کے زمانے میں بیعت کرنے کو خلاف مصلحت اور حارج تحصیل علوم دینیہ خیال فرما کر عذر کر دیا لیکن میں نے ہمیشہ ان کو اپنا شیخ ہی سمجھا اور ہمیشہ اہم

امور میں ان سے مشورہ لے کر عمل کرتا تھا۔ حضرت مولانا کی مجھ پر خاص عنایت تھی اور میرا بڑا لحاظ فرماتے تھے۔ میں جب حاضر خدمت ہوتا تھا تو فرماتے تھے "بھائی جب تم آجاتے ہو تو زندہ ہو جاتا ہوں" حضرت حاجی صاحبؒ کا تذکرہ بہت ذوق و شوق کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ "بھائی تم نے تو حضرت حاجی صاحبؒ کے پکے پھل کھائے ہیں اور ہم نے کچے پھل کھائے ہیں (یعنی حضرت حاجی صاحبؒ کے اخیر زمانے کے فیوض و برکات حاصل کئے ہیں) ایک بار حضرتؒ کا گنگوہ میں وعظ ہو رہا تھا تو جو کوئی حضرت مولانا رح خدمت میں حاضر ہوتا تو اس سے فرماتے کہ ایک عالم حقانی کا وعظ ہو رہا ہے وہاں جاؤ۔ سنو۔ میرے پاس کیا بیٹھے ہو۔ حضرت مولانا اکثر اپنے بعض طالبین و سالکین کو بھی بغرض تربیت حضرت رح کے پاس بھیج دیا کرتے تھے

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز مدرسہ عالیہ دیوبند میں مدرس اول تھے۔ فن درس و تدریس اور علوم ظاہرہ میں یگانہ روزگار تھے اور بڑے صاحب باطن اور صاحب کشف و کرامات اولیائے کاملین میں سے تھے حضرتؒ کو ان سے بڑی عقیدت و محبت و گرویدگی تھی۔ اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اس ہونہار طالب علم کے ساتھ بڑی مربیانہ شفقت اور توجہ فرماتے تھے انہوں نے اپنی روحانی فراست سے سمجھ لیا تھا کہ اس طالب علم کے طالع بیدار سے اس کے مستقبل کے روشن آثار نمایاں ہیں

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

چنانچہ ان کی موجودگی میں خصوصیت کے ساتھ خاص خاص حقائق و معارف و نکات و دقائق علمیہ بیان فرمایا کرتے۔ حضرتؒ اپنی مجلس میں حضرت مولانا کے ایسے ملفوظات کا بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ذکر فرمایا کرتے اور فرماتے تھے کہ "ان کا حلقہ درس کیا ہوتا تھا ایک حلقہ توجہ الی اللہ ہوتا تھا۔ قرآن مجید کی تفسیر بیان فرما رہے ہیں اور

آنکھوں سے آنسو جاری ہیں :

حضرتؒ کی دستاربندی ۱۳۰۱ھ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ العزیز کے متبرک و مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔ اس سال مدرسہ دیوبند میں بڑا شاندار جلسہ منعقد ہوا اس موقع پر حضرتؒ اپنے چند رفقاء کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت ہم میں ایسی استعداد نہیں کہ ہمیں دستار فضیلت عطا کی جائے اس سے مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ یہ سنکر مولاناؒ کو جوش آگیا اور فرمایا، تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیئے باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ خدا کی قسم جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے باقی سارا میدان صاف ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ؎

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اسی طرح اللہ تعالٰے نے حضرت رح کے باطنی علوم و اعمال کی تکمیل و تہذیب کے لئے بھی ایک یگانۂ عصر شیخ المشائخ حضرت حاجی شاہ محمد امداد اللہ صاحب تھانوی ثم مہاجر مکی قدس سرہ العزیز سے شرف تعلق عطا فرمایا۔

حضرت حاجیؒ صاحبؒ کو اللہ تعالٰے نے بہت سے فضائل و خصوصیات سے متصف فرمایا تھا۔ اس زمانے میں عرب و عجم کے کثیر التعداد علمائے عظام اور صوفیائے کرام ان کے حلقہ بگوش عقیدت تھے اور ان کے فیوض و برکات سے شرقاً و غرباً ہر طبقہ کے طالبان طریقت فیضیاب و سیراب ہو رہے تھے۔ اللہ تعالٰے نے ان کو دیگر اوصاف کمالات کے ساتھ خاص طور پر فن تصوف و سلوک میں ایک مجددانہ و مجتہدانہ ذوق و مسلک سے بہرہ اندوز فرمایا تھا۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے کو حضرت حکیم الامت سے مستقبل میں اہم خدمات دین خصوصاً تصوف و سلوک میں ایک اصلاحی وانقلابی کام لینا منظور تھا اس لئے اس کام کی استعداد و قابلیت پیدا کرنے کے لئے بھی۔ ایک ایسے ہی جامع شریعت و طریقت اور صاحب فراست شیخ کی ضرورت تھی۔ واقعات پر نظر کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ منجانب اللہ حضرت حاجی صاحبؒ کی توجہ خود بخود ابتدا ہی سے غائبانہ طور پر حضرتؒ کی طرف مبذول ہونے لگی تھی چنانچہ ایک بار بغیر کسی خاص ذکر و مذکور کے حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے ہم وطن منشی عبد الحق صاحب حضرتؒ کے والد ماجد سے از خود کہلا بھیجا کہ آپ جب حج کو آئیں تو اپنے ساتھ اپنے لڑکے کو ضرور لیتے آئیں۔ حالانکہ حضرتؒ کی ولادت حضرت حاجی صاحبؒ کی ہجرت کے بعد ہوئی تھی اور انہوں نے ان کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

سنہ ۱۲۹۹ھ میں جب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ العزیز حج کے لئے تشریف لے جا رہے تھے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے ہاتھ ایک عریضہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ العزیز کی خدمت میں روانہ کیا جس میں استدعا کی کہ حضرت مولانا سے بیعت فرما لینے کے لئے سفارش فرما دیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت مولانا سے اس کا تذکرہ فرمایا اور پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ "اچھا میں خود ہی ان کو بیعت کئے لیتا ہوں اور حضرتؒ کو بھی تحریر فرمایا کہ "میں نے خود آپ کو بیعت کر لیا ہے مطمئن رہیں"

سنہ ۱۳۰۱ھ میں جب حضرتؒ علوم درسیہ سے فارغ ہوئے تھے اسی زمانے میں کانپور کے مدرسہ "فیض عام" میں ایک مدرس کی ضرورت تھی۔ حضرتؒ کو وہاں تدریس کے لئے بلایا گیا۔ حضرتؒ کئی سال تک اس مدرسہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مدرسہ کے نظم و نسق سے غیر مطمئن ہو کر تعلق منقطع کر لیا پھر کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ کانپور کی جامع مسجد میں درس دینے لگے اور وہاں

ایک مدرسہ قائم ہوگیا۔ اس مدرسہ کا نام حضرت نے مسجد کی مناسبت سے "مدرسہ جامع العلوم" موسوم فرمایا یہ مدرسہ یوماً فیوماً ترقی کرتا رہا اور کچھ مدت کے بعد بہت مشہور و معروف ہوگیا۔ (اور اب تک بفضلہ تعالیٰ قائم ہے)

دوران قیام کانپور شوال ۱۳۰۱ھ میں ایسے اسباب و سائل رونما ہوئے کہ حضرتؒ اپنے والد صاحب کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ حضرت حاجی صاحبؒ سے ملاقات ہوئی اور دست بدست بیعت، ہونے کا شرف حاصل ہوا حضرت حاجی صاحبؒ نے ان کو کچھ دنوں کے لئے اپنے پاس رہنے کے لئے روکنا چاہا مگر حضرت کے والد صاحب نے اس وقت حضرتؒ کی مفارقت کو گوارا نہ فرمایا اور اپنے ساتھ واپس لے آئے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت والا سے فرمایا کہ اب کی بار حج کو آؤ تو کم از کم چھ ماہ کے قیام کے ارادے سے آنا۔ حضرتؒ ۱۳۱۰ھ میں دوسری بار حج کے لئے تشریف لے گئے اور اپنی طلب صادق اور حضرت شیخ کے منشاء اور ان کی خواہش کے مطابق وہاں چھ ماہ تک قیام کا ارادہ کرلیا۔

حضرتؒ کو اپنے پیر و مرشد کی صحبت بابرکت میں فراغت قلب کے ساتھ رہنے اور باطنی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لئے یہ بہت مغتنم موقع نصیب ہوا اس کی قدر کرتے ہوئے حضرتؒ اپنا سارا وقت حضرت شیخ ہی کی خدمت اور معیت میں گذارنے لگے اور ہمہ وقت ان کے علوم عارفانہ اور مقالات حکمت سے بہرہ اندوز ہونے لگے۔ اس کے علاوہ عبادات نافلہ اور حسب ہدایت شیخ ریاضات و اوراد معمولہ حضرات صوفیائے کرام میں بھی مشغول رہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ اسی موقع کے منتظر تھے چنانچہ نہایت شفقت و محبت کے ساتھ اپنے مرید صادق کی تربیت باطنی کی طرف متوجہ ہوگئے اور اپنے نوخیز طالب و سالک طریق کی فطری صلاحیت و استعداد اور جوہر قابل کا اندازہ کرتے رہے اور وہ تمام علوم باطنی اور اسرار و رموز روحانی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب مبارک پر وارد اور القا فرمائے تھے حضرت کے

قلب مصفیٰ میں منتقل فرماتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس قلیل عرصہ میں حضرت شیخ کی توجہات خاص سے حضرت رح کا سینہ مبارک دولت معارف وحقائق باطنی کا خزینہ اور انوار وتجلیات روحانی کا آئینہ بن گیا اور محبت حق سبحانہٗ تعالیٰ اور محبت نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوز وگداز رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ اپنے مرید سعید کی ترقی باطنی کا اندازہ فرماکر بہت مطمئن ومسرور تھے۔ بعض وقت جوش محبت میں آکر فرماتے کہ "اللہ تعالیٰ نے جو الہامی علوم مجھ کو عطا فرمائے ہیں وہ ان کی زبان پر جاری فرمادیئے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ ہونہار رہرو طریق ایک دن رہبر طریق بنے گا اور امت مسلمہ کے لئے رشد وہدایت کا علمبردار ہوگا"

بالآخر ہر صورت سے مطمئن ہوکر اور اپنے ذوق ومسلک سے تمام تر ہم آہنگی کے آثار نمایاں دیکھ کر اپنا جانشین بنالیا اور باذن اللہ تعالیٰ خلعت خلافت اور منصب ارشاد وہدایت سے سرفراز فرمایا اور خلق اللہ کی رہنمائی کے لئے تعلیم وتلقین کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جب حضرتؒ کا وہاں سے واپسی کا وقت آیا تو بکمال محبت وشفقت گلے لگاکر فرمایا "میاں اشرف علی میں دیکھتا ہوں کہ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے تم کو تمام معاصرین پر خاص فضیلت عطا فرمائی ہے ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ پھر ان دو وصیتوں کے ساتھ رخصت فرمایا۔

دیکھو وطن پہنچکر تم کو باطنی کیفیات میں ایک حالت شدید پیش آنے گی گھبرانا نہیں مجھکو مطلع کرتے رہنا۔ دوسرے یہ کہ جب مدرسہ کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو تو پھر وطن پہنچکر ہماری خانقاہ اور مدرسہ میں توکلاً علی اللہ مقیم ہوجانا تم سے انشاء اللہ تعالیٰ خلق کثیر کو نفع پہنچے گا"

۱۳۱۱ھ میں حج سے واپسی پر کانپور پہنچکر حضرتؒ پھر درس وتدریس کے کام میں لگ گئے اس طرح ایک طرف تو درس وتدریس کی مداومت اور تبحر وتفکر سے علوم

میں پختگی اور ترقی ہوتی رہی۔ دوسری طرف عبادات و ریاضات میں مشغولی سے باطنی کیفیات وحالات میں عروج وارتقا ہوتا رہا۔ اسی زمانے میں اکثر و بیشتر مواقع پر حضرت رح کے تبلیغی و اصلاحی وعظ بھی ہوتے رہے جو قلم بند ہو کر شائع بھی ہوتے رہے، اور اسی زمانے میں حضرت رح کی مجالست میں ایک حلقہ ذکر اللہ بھی قائم ہو گیا جس میں طالبین حق و سالکین طریق جمع ہو کر حضرت رح کی تعلیم و تربیت باطنی سے مستفیض ہونے لگے، اہل شوق حضرت رح کے ارشادات و مقالات حکمت کو قلم بند کرتے اور شائع کرتے رہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ حضرت رح کے عالمانہ وعارفانہ کمالات کا شہرہ اطراف میں ہونے لگا اور خواص و عوام میں حضرت رح کی ذات کو ایک ہر دلعزیزی کی شان حاصل ہو گئی۔

مگر حضرت شیخ کی خدمت سے واپسی پر مزاج اور انداز زندگی میں ایک گونہ ربودگی اور وارفتگی سی طاری رہنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آیا کہ حضرت رح فرماتے تھے کہ "انقباض باطنی و کیفیات روحانی کی شدت سے میں اس قدر بے قابو ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ اپنی جان دیدوں۔ (شاید یہ وہی حالت رفیعہ تھی جس کا اشارہ حضرت حاجی صاحب رح نے مکہ معظمہ سے واپسی کے وقت فرمایا تھا) حضرت رح نے اپنی اس مضطربانہ حالت کی اطلاع اپنے شیخ مربی باطن کو کی کہ حضرت "آپ تو اتنی دور ہیں اور میری یہاں یہ حالت ہو رہی ہے، کیا کروں، حضرت حاجی صاحب رح اس اطلاع سے بہت متاثر ہوئے اور جواب تحریر فرمایا کہ "جب تک فقیر زندہ ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں برابر تمہاری طرف متوجہ ہوں تم اطمینان رکھو۔" ان محبت بھرے الفاظ میں ایسی جاں نوازتا ثیر تھی کہ حضرت رح فرماتے تھے کہ "خط پڑھتے ہی فوراً سکون محسوس ہونے لگا اور تمام معمولات و مشاغل رفتہ رفتہ بحال ہو گئے" (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اشرف السوانح حصہ اول)

حضرت رح نے دوران قیام کانپور درس و تدریس کے سلسلہ میں چودہ سال بسر کئے۔ یہی زمانہ منجانب اللہ ان کے ذہنی و روحانی صلاحیت و استعداد کے نشو و نما کا اور علوم ظاہری

و باطنی کے بار آور ہونے کا تھا اور اسی زمانے میں تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر عام مسلمانوں کے عقاید و اصلاح اعمال کے لئے دین مبین کی تبلیغ و اشاعت کا ایک بے اختیار جذبہ اور شدید تقاضا دل میں پیدا ہو رہا تھا جس سے حضرتؒ ہمہ وقت متاثر رہنے لگے اور موجودہ انہماک و اشتغال کی زندگی سے طبیعت گھبرانے لگی مستقبل میں پیش نظر مقاصد کے حصول کے لئے فراغت قلب و یکسوئی درکار تھی چنانچہ مدرسہ کی ملازمت ترک کرنے کا ارادہ کر لیا اور چند وجوہات و معذورات پیش کر کے آخر کار ۱۳۱۵ھ میں سبکدوشی حاصل کر لی اور اپنے وطن تھانہ بھون تشریف لے گئے اور اس کی اطلاع اپنے پیر و مرشد کو کر دی وہاں سے جواب آیا۔

"بہتر ہوا آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ اور خانقاہ کو از سر نو آباد کریں میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور آپ کا مجھے خیال رہتا ہے۔"

قصبہ تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) بڑے شہروں (دہلی سہارنپور) سے دُور اور ذرائع آمد و رفت کے اعتبار سے اس زمانے میں بالکل الگ تھلگ پرانے زمانے کے رئیسوں کی ایک بستی تھی اس بستی سے بالکل باہر خانقاہ امدادیہ واقع تھی، یہ وہی خانقاہ تھی جہاں کچھ زمانہ پہلے اللہ تعالٰی کے تین برگزیدہ خلوت گزین بندے درویشانہ زندگی بسر کر رہے تھے، یعنی حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ۔ حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ۔

یہ حضرات میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ کے خلفائے راشدین تھے، اور اپنے علوم ظاہری و باطنی کے فیوض و برکات سے خواص و عوام کو فیض رسانی میں مشغول تھے۔ پھر جب انقلاب آیا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ شہید ہو گئے اور کچھ عرصہ کے بعد مولانا شیخ محمد صاحبؒ کا انتقال ہو گیا اور حضرت حاجی صاحبؒ مکہ مکرمہ ہجرت فرما کر چلے گئے۔ کچھ مدت کے لئے یہ خانقاہ ضرور غیر آباد ہو گئی

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی کو اپنے ان مقبول بندوں کی یادگار کو قائم رکھنا اور مستقبل میں اس خانقاہ کو ایک عالمگیر رشد و ہدایت و علوم ظاہری و باطنی کی نشر و اشاعت کا عظیم القدر مرکز بنانا منظور تھا اور اس اہم و عظیم کام کو سرانجام دینے کے لئے حضرت حکیم الامت مجدد ملت محی السنت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ارشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کو ازل ہی سے منتخب فرمالیا تھا۔ حضرت نے وطن پہنچکر اپنے پیر و مرشد کی تمنا اور ہدایت کے مطابق خانقاہ امدادیہ میں سکونت اختیار کرنے کا انتظام کیا اور توکل علی اللہ بظاہر ایک گونہ عارضی بے سر و سامانی مگر حقیقتاً مستقبل کے غیر فانی ساز و سامان کے ساتھ اپنے بزرگوں کی مقدس مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہو گئے اس طرح پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب کی تمنا اور پیش گوئی پوری ہو گئی۔

حضرت نے خانقاہ میں مقیم ہو کر شروع ہی سے اپنی آئندہ زندگی کے انضباط اور اہم خدمات دین کے انصرام کے لئے اپنے مذاق فطری اور نصب العین کے موافق ایک لائحہ عمل مقرر فرمایا اور اسی کے مطابق اپنے پیش نظر کام کے سرانجام دینے میں مشغول ہو گئے اس وقت حضرت کی عمر تخمیناً ۳۵ سال تھی۔

حضرت کو فطرتاً حسن انتظام اور نظم الاوقات کا بڑا اہتمام تھا چنانچہ اپنی نجی ضروریات کے لئے، تصنیف و تالیف کے لئے اور مجلس احباب میں تعلیم و تربیت کے لئے ایسے فراغت کے اوقات مقرر فرمائے کہ ہر کام آسانی و اطمینان سے سرانجام ہوتا رہے۔ اس نظم الاوقات میں اس قدر انضباط و جامعیت تھی کہ آخر ایام تک اس میں سرمو فرق نہیں آیا۔

یومیہ نظم الاوقات

حضرت کا رہائشی مکان خانقاہ سے کچھ تھوڑے فاصلے پر واقع تھا۔ خانقاہ ہی کے اندر قدیم زمانے کی ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ حضرت پنج گانہ نماز اسی مسجد میں ادا فرماتے

اور خود امامت فرماتے تھے۔ آخر عمر میں ضعف اور چند معذورات کی وجہ سے ایک قاری صاحب کو امامت کے لئے مقرر فرما دیا تھا۔ جنوب کی طرف مسجد سے ملی ہوئی ایک سہ دری تھی جس میں حضرت حاجی صاحبؒ کے زمانے کے دو حجرے ہیں۔ حضرتؒ کی نشست گاہ یہی سہ دری تھی اور یہیں مجلس منعقد ہوتی تھی۔ خانقاہ میں ایک طرف کچھ حجرے بھی تھے جس میں مہمان اور ذاکرین وسالکین آکر مقیم ہوا کرتے تھے۔

صبح فجر کی اذان کے بعد ہی حضرتؒ مکان سے خانقاہ تشریف لے آتے تھے نماز کے بعد کچھ معمولی ضروریات سے فارغ ہو کر مشی (چہل قدمی) کے لئے باہر میدان میں کچھ دور تک چلے جاتے تھے اور اسی دوران اپنے چند اوراد وغیرہ پورے کر لیتے۔ واپسی پر خانقاہ کی سہ دری میں نماز اشراق ادا کرتے اور پھر تھوڑی دیر کے لئے مکان تشریف لے جاتے۔ واپس آکر عموماً گیارہ بجے تک یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔ عام طور پر اس وقت کسی کو آنے اور ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی خاص مہمان جو مختصر مدت کے لئے آئے ہوں ان کے لئے تصنیفات سے فارغ ہو کر تھوڑا وقت مجلس خاص کا دے دیتے ورنہ مکان تشریف لے جاتے۔ کھانا تناول فرما کر اور کچھ دیر آرام فرما کر پھر خانقاہ آجاتے اور قیلولہ فرماتے۔ ظہر کی اذان پر نماز کے لئے تیاری فرماتے۔ نماز ظہر کے بعد عصر کی اذان تک خانقاہ کی سہ دری میں مجلس عام منعقد ہوتی اس میں قصبہ والے اور باہر سے آئے ہوئے لوگ شریک ہوتے مشرکادمیں علماء۔ ذاکرین۔ شاغلین امیر و غریب، پڑھے لکھے اور بغیر پڑھے لکھے، سب ہی طرح کے لوگ ہوتے جن کی تعداد روزانہ کم و بیش بیس پچیس ہوا کرتی تھی۔ اس وقت جو لوگ کہیں باہر سے آتے ان سے مصافحہ کے بعد مختصر سی مزاج پرسی اور دریافت حال کر لیتے اور مناسب جگہ پر بیٹھنے کے لئے فرما دیتے، زیادہ گفتگو نہ فرماتے تاکہ دیر تک ایک طرف متوجہ رہنا دوسرے لوگوں پر بار نہ ہو۔

اہل مجلس خاموش بیٹھے ہوئے حضرتؒ کی باتیں سنا کرتے کبھی کسی نے کوئی مناسب

سوال کیا تو اس کا جواب فرما دیتے۔ کوئی تعویذ طلب کرتا تو لکھ کر دیدیتے کوئی دعا کے لئے عرض کرتا تو دعا فرما دیتے اس وقت حضرتؒ مختلف قسم کی متفرق باتیں کیا کرتے کبھی حالات حاضرہ کے وقتی ضروریات اور تقاضوں کے متعلق کبھی بزرگوں کے حالات وحکایات کبھی عام پند و نصائح کبھی تصوف و سلوک کی وضاحت وغیرہ۔ اکثر و بیشتر حضرتؒ کے یہ ارشادات و مقالات حکمت قلم بند ہوتے رہتے اور شائع ہوتے رہتے۔ اس صورت سے "الافادات الیومیہ" کے نام سے کئی جلدیں مرتب ہو کر شائع ہوئیں جو شریعت وسنت وطریق کے مختلف التنوع مضامین وحقائق و معارف کا بڑا مفید وسبق آموز ذخیرہ ہیں۔

اسی عرصہ میں خطوط کے جواب بھی تحریر فرمایا کرتے جن کی تعداد کم از کم تقریباً پچیس تیس تک روزانہ ہوا کرتی تھی۔ خطوط کے جواب التزاماً روز کے روز تحریر کر کے واپس کر دیئے جاتے تاکہ مکتوب الیہ کو زحمت انتظار نہ ہو۔ زیادہ تر یہ خطوط اصلاحی تعلق رکھنے والوں کے ہوتے جو اپنی باطنی حالات وکیفیات، خطرات و وساوس یا دینی امور میں ذہنی کشمکش اور اندیشوں کا حل دریافت کرتے یا تصوف وسلوک کے متعلق معلومات حاصل کرتے۔ حضرتؒ ان سب کے جواب خطوط کے حاشیہ ہی پر معاً قلم برداشتہ لکھدیا کرتے، وہ خطوط جن میں کوئی خاص اہم مضامین ہوتے (وہ مع جوابات) منتخب کر لئے جاتے اور بغیر اظہار نام شائع کر دیئے جاتے جو "تربیت السالک" کی ضخیم جلدوں میں مدون ہو کر شائع ہوتے رہے۔ اسی طرح بعض خطوں میں لوگ فقہی مسائل اور حالات حاضرہ کی ضروریات اور تقاضوں میں شریعت کی ہدایات یا مسائل دریافت کرتے، ان میں سے بھی خاص مضامین کے خط مع جواب منتخب کر لئے جاتے اور شائع کر دیئے جاتے جو "امداد الفتاویٰ" کی کئی ضخیم جلدوں میں جمع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ روزانہ انہیں معلولات کے ساتھ اذان عصر کے وقت یہ مجلس ختم ہو جاتی۔ نماز عصر کے بعد حضرتؒ اپنے دونوں مکانوں میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے جاتے۔ مغرب کی اذان سے پہلے واپس آ جاتے پھر نماز

مغرب سے فارغ ہو کر کچھ دیر اپنی نشست گاہ سہ دری میں تشریف رکھتے اور کچھ متفرق کاموں میں کچھ دیر مشغول رہتے۔

حضرت کا بیعت کرنے کا معمول بھی عموماً بعد مغرب ہی تھا۔ پھر فارغ ہو کر مکان تشریف لے جاتے اور عشاء کی نماز مسجد میں آکر ادا فرماتے، اس کے بعد پھر آرام کے لئے مکان تشریف لے جاتے۔

چوبیس گھنٹوں میں یہ ایسے سیدھے سادے بے تکلف معمولات تھے کہ برسوں تک گردش ایام سے ان میں ذرا بھی فرق نہ آیا اور یہی کمال استقامت فوق الکرامت ہے جس وقت بھی جس حال میں حضرتؒ ہوتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بالکل اطمینان کی حالت میں فراغتِ قلب کے ساتھ ہیں لیکن جب ان کے مختلف مشاغل زندگی اور ہمہ گیر مختلف النوع تصانیف و تالیفات پر نظر کی جاتی ہے اس وقت اندازہ ہوتا ہے کہ صرف اپنی ذات سے تن تنہا حضرتؒ نے جو علمی و تحقیقی اور اصلاحی و تبلیغی خدمات انجام دی ہیں وہ بڑے بڑے اداروں سے بھی ممکن نہ تھا۔ یہ سب ایک مضبوط و مستقل نظم الاوقات ہی کی برکت تھی کہ تجدید دین اور تبلیغ دین کا عظیم الشان اور فقید المثال تحریری و تقریری ذخیرہ امتِ مسلمہ کے لئے حضرتؒ نے اپنی حیات ہی میں فراہم کر کے صدیوں تک کے لئے شائع فرما دیا۔ تصانیف و تالیفات کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وقت گذرتا گیا اور حضرتؒ کے نصب العین کے مطابق اس خانقاہ کی اہمیت اور خصوصیات میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب یہ خانقاہ ایک ایسا شہرہ آفاق ہمہ گیر ادارہ بن گئی جو ایک ہی وقت میں علوم و فنون دینیہ کی

ایک معیاری جامعہ بھی تھی جہاں سے دین مبین کے اہم اور دقیق مسائل کی تنقیح و تحقیق کا زبردست کام ہوا۔ یہی خانقاہ ایک مثالی دینی مدرسہ بھی تھی جہاں علوم قرآن و حدیث کا درس بھی دیا جاتا تھا اور تہذیب اخلاق کی عملی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ خانقاہ برصغیر کی ایک مستند و معتبر دارالافتاء بھی تھی۔ جہاں سے حالات حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کے فقہی مسائل میں رہنمائی بھی ہوتی اور یہی خانقاہ تعلیم و تربیت روحانی اور تزکیہ نفس و تہذیب اخلاق باطنی کی ایک ممتاز و منفرد تربیت گاہ بھی تھی جہاں بڑے بڑے جیّد علماء سے لے کر عوام کے ہر طبقہ کے لوگ ایک قلیل عرصہ میں تربیت باطن و تہذیب اخلاق سے آراستہ ہو کر اور حقیقت تصوف و سلوک کا عرفان حاصل کر کے مشائخ طریق بنے اور منصب رُشد و ہدایت پر فائز ہو کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔

اسی زمانے میں تقریباً چالیس سال تک حضرتؒ کا ملک کے طول و عرض میں بڑی کثرت سے تبلیغی دوروں کا سلسلہ جاری رہا۔ بڑے بڑے شہروں میں مشہور دینی درس گاہوں انگریزی تعلیم گاہوں اور اسلامی انجمنوں کے شاندار جلسوں میں بار بار حضرتؒ کے کثرت سے بڑے انقلاب انگیز اصلاحی وعظ ہوئے بعض وقت وعظ کا یہ سلسلہ چار چار گھنٹہ تک جاری رہتا تھا ہزاروں کی تعداد میں لوگ والہانہ انداز میں جمع ہوتے تھے۔ اور دینی و دُنیوی تقاضوں سے آگاہ ہو کر ایمانی تقویت حاصل کرتے۔

حضرتؒ کے مواعظ کا موضوع خاص طور پر عقاید کی اصلاح۔ اعمال کی درستی، معاملات کی اہمیت اور اخلاق کی پاکیزگی کے لیے ہوا کرتا تھا۔ حضرتؒ کی مساعی و جدّوجہد کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہوا کہ اللہ تعالےٰ کے فضل سے مسلمانوں کے ضمیر میں اسلامی شعور و شعائر کا جذبہ بیدار ہونے لگا اور حق و باطل کا صحیح معیار واضح ہو گیا۔ اکثر و بیشتر مواعظ قلم بند ہوئے اور طبع ہو کر شائع ہوئے اور بہت سے وعظ صرف قلم بند ہو کر محفوظ رہے اور شائع نہ ہو سکے تاہم شائع شدہ مواعظ کی تعداد تقریباً چار سو سے زاید ہے جو اب بھی وقتاً فوقتاً

تجدیداً شائع ہو رہے ہیں اور ان سے مسلمان اب بھی مستفیض ہوتے رہتے ہیں ۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

حضرت کی سوانح حیات پر نظر کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ جل شانہٗ کو اس زمانے میں چونکہ احیائے سنت، اعلاء کلمۃ الحق اور اصلاح امت کا ایک عظیم الشان اور غیر فانی کام لینا منظور تھا اس لئے ابتدائے عمر ہی میں حضرت رحؒ کے دل میں تبلیغ و اشاعت دین کا ایک مجددانہ و مصلحانہ ذوق اور تقاضا ودیعت فرما دیا تھا۔ ابھی درس و تدریس ہی کا زمانہ تھا کہ حضرت رحؒ نے اپنی خداداد فراست اور عام معلومات و تجربے کی بنا پر محسوس کیا کہ اس وقت عام طور پر مسلمان تعلیمات دین سے نا آشنا اور غافل ہوتے جا رہے ہیں اور اسی وجہ سے طرح طرح کی گمراہیوں، غلط فہمیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہو رہے ہیں ۔

اُس زمانے میں مسلمانوں میں دو بڑے خطرناک رجحانات شدت پکڑ رہے تھے ۔ ایک طرف تو انگریز کے برسر اقتدار ہونے کی وجہ سے مغربی فلسفہ اور تہذیب و معاشرے کا اثر پھیل رہا تھا جس سے عام طور پر تعلیم گاہیں، تجارتی ادارے اور سرکاری محکمے اور عوام متاثر ہو رہے تھے جس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں دینی تعلیمات کی کمی کی وجہ سے بلا قید و بند ایک آزادانہ زندگی کی رَو پیدا ہو گئی تھی۔ عام طور پر دین اسلام کی عظمت و وقعت دلوں سے کم ہونے لگی تھی اور دُنیوی ترقی اور مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری دلکشی و جاذبیت سے عام مسلمان متاثر ہو کر اپنے مذہب سے بیگانہ اور نا آشنا ہونے لگا بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کے پورا کرنے کے لئے اس کو شعائر اسلام سدراہ معلوم ہونے لگے، یہاں تک کہ مغرب زدہ آزاد دماغ میں یہ بات آنے لگی تھی کہ اس ترقی یافتہ زمانے میں احکامات شرعیہ پر عمل کرنا ممکن نہیں، خصوصاً معاملات معاشرت و اخلاقیات ایسے امور زندگی ہیں جن کو تقاضائے وقت کے لحاظ سے حسب ضرورت اپنے موافق بنایا جا سکتا ہے۔ مذہب سے ان کا کوئی واسطہ نہ ہونا چاہیے۔ دین مبین کے ان تین اہم اور بنیادی ارکان سے اس قسم کا انحراف دراصل

ایک درجہ میں ایمان ہی سے برگشتہ ہونے کے مترادف ہے۔ یہ فتنہ مسلمانوں کی عاقبت خراب کرنے کے لئے اس دور میں نہایت شدید و عبرتناک تھا۔

حضرتؒ نے اس فتنہ کے انسداد کے لئے بڑی شد و مد کے ساتھ تبلیغ شروع فرمائی۔ اس موضوع پر سیکڑوں وعظ مختلف عنوانات کے ساتھ بیان فرمائے اور متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو کثرت سے طبع ہو کر شائع ہوئیں۔ مثلاً انتباہات مفیدہ۔ بہشتی زیور۔ فروع الایمان۔ اصلاح الخیال۔ حیوٰۃ المسلمین۔ آداب المعاشرت۔ اصلاح انقلاب امت (وعظ اسلام حقیقی۔ محاسن اسلام۔ دعوۃ الحق وغیرہ) بعونہ تعالیٰ شرق سے غرب تک تمام ملک میں ہر طبقہ کے مسلمانوں کو ان سے خاطر خواہ نفع اور رہنمائی حاصل ہوئی۔ فلسفہ جدید کی ظلماتی اثرات سے اور دین کے متعلق مختلف اوہام و شکوک سے ذہن پاک و صاف ہو گئے۔ حضرتؒ نے کتاب و سنت کی روشنی میں دین کے ہر شعبہ میں اسلام کی فطری تعلیمات کو بڑے دلکش اور دل نشین اور قابل قبول اور قابل عمل انداز میں صلائے عام کے ساتھ تمام اہل فکر و نظر کے سامنے پیش کیا اور ہر عنوان سے ثابت کر دیا کہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایسا واحد مذہب ہے جس کا تعلق انسان کی زندگی میں ہر ضرورت و ہر تقاضہ بشری سے ہے اور ہر حالت اور ہر دور میں ہر فرد اور ہر جماعت کے لئے نہ صرف قابل عمل بلکہ شرافت نفس اور تہذیب و تمدن میں ترقی کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔

اس ہمہ گیر مصلحانہ تبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں دینی شعور اور اسلامی شعائر کی طرف رجحان پیدا ہونے لگا۔ ہر طبقہ کے اکثر و بیشتر انگریزی تعلیم یافتہ لوگ خصوصاً سرکاری محکموں کے بڑے بڑے عہدہ دار وکیل۔ بیرسٹر جج۔ منصف۔ مجسٹریٹ کثرت سے حضرتؒ کی تعلیمات سے متاثر ہوتے اور بعض تو حلقہ بگوش عقیدت ہو گئے اور بعض کی باطنی تعلیم و تربیت سے دینی حالت میں ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی کہ حضرتؒ نے ان کو اپنے خلفائے مجازین صحبت " " میں شامل فرما لیا تھا۔ اس طرح حضرتؒ نے اس دور حاضر میں

ایک ایسی زندہ مثال قائم فرمادی کہ مسلمان خواہ کسی مشغلۂ زندگی میں ہو اگر چاہے تو پکا دیندار بن سکتا ہے یہ حضرت کی ایسی کرامت اور ایسا کارنامۂ تبلیغ دین ہے جو ہر اعتبار سے انفرادیت کا درجہ رکھتا ہے۔

ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

ایسا کام نہ اس وقت اس طرح کہیں باضابطہ ہو رہا تھا اور نہ بعد میں کہیں اس کی مثال ملتی ہے۔

دوسری اہم چیز جو حضرت رحؒ کے دل و دماغ میں کاوش و اضطراب پیدا کررہی تھی وہ دورِ حاضر کی خانقاہی فقیری و درویشی کی ہیئت کذائی تھی جہاں کتاب و سنت سے بالکل بیگانہ اور بے نیاز ہو کر چند جوگیانہ رسم اور طریقہ نفس کشی ہی کو واصل حق ہونے کا ذریعہ اور چند ملحدانہ عقاید کو حاصل تصوف و سلوک سمجھ لیا گیا تھا یہ ایک عالمگیر فتنہ تھا جس میں اکثر دینی رجحان رکھنے والے نادان عوام مبتلا ہو رہے تھے، الا ماشاء اللہ حضرت رحؒ نے اپنی تمام مصلحانہ توجہ اور مجددانہ تبلیغ کی جدوجہد اسی طبقہ کے لئے بھی خاص طور پر مبذول فرمائی اور اس موضوع پر عقاید و اعمال کی اصلاح کے لئے متعدد کتابیں تصنیف و تالیف فرمائیں سیکڑوں وعظ و ملفوظات قلم بند کرا کے شائع فرمائے اور قرآن و حدیث کی غیر متزلزل سند کے ساتھ تمام باطل عقائد کا رد اور تمام غیر اسلامی رسم و روایات اور غیر معقول اور ملحدانہ رموز و اسرار باطنی اور گمراہ کن اصطلاحات کی تردید فرمائی اور نہایت نمایاں طور پر واضح کر دیا کہ طریقت یعنی تصوف و سلوک یا دوسرے الفاظ میں تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس دین مبین ہی کا ایک اہم اور بنیادی رکن ہے اور اس پر شریعت و سنت کے مطابق عمل کرنا ایک درجہ میں ہر مسلمان پر فرض و واجب ہے (چنانچہ کتاب ہذا تمامتر اسی موضوع کی تشریح و وضاحت پر مشتمل ہے)

اس کے علاوہ دین کے پانچوں شعبوں میں یعنی عقاید کے معاملہ میں فساد و الحاد کی سمیت عبادات میں رسومات و بدعات کی شمولیت، معاملات میں حق تلفیاں اور ظلم

معاشرے میں فواحشات ومنکرات کی ترویج اور اخلاقیات میں نفسانیت وشہوانیت کا غلبہ اور آمیزش ان سب سے اس زمانے میں عام طور پر ذہن مانوس ہو رہے تھے اور الا ماشاء اللہ، خواص وعوام سب ہی اس میں مبتلا ہو رہے تھے۔

حضرت رح نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ان سب مفاسد ومنکرات کی اصلاح فرمائی اور تصحیح عقائد واعمال کے لئے تصانیف، مواعظ وملفوظات کے ذریعہ ایک ہمہ گیر تبلیغ فرمائی اور اس سے بحمد للہ خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

اسی طرح علوم دینیہ سے متعلق۔ قرآن مجید کی تفاسیر میں۔ احادیث سے استنباط میں، فقہ کی توجیہات میں، تصوف کی غایات میں جہاں جہاں خواص وعوام غلط فہمیوں اور غلط کاریوں میں مبتلا ہو گئے تھے وہاں اس مجدد عصر کی نظر اصلاح کارفرما نظر آتی ہے اور ان علوم کے ہر باب میں مفصل تصانیف موجود ہیں۔

یوں تو علوم دینیہ کے متعلق حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سب ہی تصانیف وتالیفات اپنے مضامین کی جامعیت ونافعیت وانفرادیت کے اعتبار سے بے نظیر وبے مثال ہیں۔ لیکن حضرت رح کے مطبوعہ مواعظ وملفوظات اور تربیت السالک علوم ظاہری وباطنی کے ایک بحر بیکراں ہیں۔ ان مواعظ وملفوظات میں اکثر وبیشتر آیات قرآنیہ۔ احادیث نبویہ۔ فقہ اور طریقت کے متعلق بہت ہی نادر اور نازک و لطیف تفاسیر۔ تشریحات۔ تنقید وتدقیق بیان کی گئی ہیں۔

ان کے علاوہ دنیا وآخرت کے متعلق مسلمانوں کے لئے ہزاروں قسم کے علوم اور معلومات کا بڑا گراں مایہ ذخیرہ ہیں۔ اسی طرح کتاب تربیت السالک بھی اہل باطن واہل سلوک کے ہزاروں طرح کے احوال وکیفیات روحانی اور رذائل ومحرکات نفسانی اور اوہام وشکوک کے متعلق حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ملہمانہ تحقیق وتدقیق کا عجیب وغریب مجموعہ اور علوم موہوبہ کا بے نظیر خزینہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت رح کی مصلحانہ و مجددانہ انفرادیت اس حقیقت سے واضح ہوتی ہے کہ حضرت رح کی تمام تصانیف و تالیفات۔ تمام مواعظ و ملفوظات یعنی تمام تحریری و تقریری کارنامہ ملاحظہ کیا جائے تو یہ بات نمایاں اور آشکارا نظر آئے گی کہ دین مبین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس حکیم الامت مصلح شریعت و طریقت کے اصلاحی و تجدیدی جد و جہد کے احاطہ کے اندر نہ آگیا ہو۔

شانِ انفرادیت واجتماعیت

قرون اولی اور آئمہ مجتہدین کے عہد زریں کے بعد اس امت مرحومہ میں حاملان شریعت و طریقت کے زمرے میں جس قدر مقتدر و مقدس ہستیاں گزری ہیں ان میں حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی شخصیت اس دور میں بڑی نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر طرح کے ظاہری و باطنی اوصاف سے متصف فرمایا تھا۔ عالم۔ حاجی۔ حافظ اور قاری ہونے کے علاوہ صحیح معنوں میں حکیم الامت و مجدد ملت اور قطب الارشاد تھے۔ پھر صف اول کے مفسر اور محدث فقیہہ و امام تصوف تھے۔ مبلغین و واعظین کے سرخیل اور مصنفین و مؤلفین میں بھی اولیت و اولویت کا درجہ رکھتے تھے۔ بلا تکلف بے ساختہ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کا مصداق تھے۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ دین اسلام کے لیے اُن کی تبلیغی مساعی اور جد و جہد۔ علوم شریعت و طریقت میں حقائق و معارف کے تحریری و تقریری دفاتر، خود ان کی جامعیت اور تبحر علمی کے شاہد عادل ہیں۔

ان تمام کارناموں کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ حضرت کی حیات ہی میں

اُن کی تصانیف دورِ حاضر کے مفسرین و محدثین، فقہا و صوفیا کی نگاہ میں مقبول و ممتاز ہو گئیں، اور عامۃ المسلمین کے لیے شمعِ ہدایت بن گئیں۔

علاوہ ازیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا حکیم الامت، مجدد الملت اور قطب الارشاد ہونا اس سے ظاہر ہے کہ دین کے پانچوں شعبوں میں جو افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی اس کی نشاندہی کر کے شریعت اور سنت کی صراطِ مستقیم کو امت کے سامنے وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا۔

اس پُرفتن دَور میں نہ مسلمانوں کے عقائد صحیح رہے تھے نہ عبادات، نہ معاشرت، نہ معاملات، نہ اخلاقیات۔ نت نئے فتنے مختلف فرقوں میں مختلف شکلوں میں نمودار ہو رہے تھے۔ مغربی تعلیم کے اثرات سے زندقہ والحاد پھیل رہا تھا۔ عقائد میں افراط و تفریط تھی۔ رسوم و بدعات عبادات میں داخل ہو گئی تھیں۔ معاملات میں سود، رشوت، حق تلفی۔ بے پردگی وغیرہ وغیرہ عام تھیں۔ معاشرت میں تہذیب کے نام سے یہود و نصاریٰ کے تمدن کا غلبہ ہو گیا تھا۔ اخلاقیات میں وہ ابتری پیدا ہو گئی تھی کہ آدمی انسانیت کے درجہ سے گر کر اسفل السافلین تک پہنچ گیا تھا۔ عوام الناس دین سے دُور ہٹ گئے تھے۔ عام اہلِ علم میں (الا ماشاء اللہ) مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی مداہنت کی حد تک آ گئی تھی۔ رہنمایانِ قوم منصب پرست اور جاہ طلب ہو گئے تھے۔ اکثر صوفیا۔ خود بینی و ریاکاری کے خوگر ہو گئے تھے۔ دینی تعلیم گاہیں۔ اخلاق سے معرا ہوتی تھیں۔ مختصر یہ کہ عالم اسلام میں تمام تر ابتری پیدا ہو چکی تھی، ہر طبقہ کے مسلمانوں میں دین و مذہب کا ہر شعبہ مسموم اور مجروح ہو چکا تھا۔ شریعت

سنت و طریقت کا صحیح مفہوم ہی مسلمانوں کے ذہن میں باقی نہ رہا تھا۔

اب اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کارنامہ تبلیغ کو دیکھا جائے تو اس سے واضح ہو گا کہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام شعبوں میں اصلاح امت کے لیے کس قدر جانفشانی کے ساتھ بے خوف و خطر خدمات سر انجام دی ہیں جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مجدد ہونے کی صریح دلیل ہے اور اہل علم اور اہل بصیرت دیکھیں کے کہ دین و اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں تفاسیر و احادیث و فقہ و تصوف کی تصنیفات و تالیفات میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا عظیم الشان عدیم المثال اور وسیع المقدار کارنامہ ایسی مخصوص انفرادیت کا حامل ہے کہ ایسی جاذبیت جامعیت و نافعیت و مقبولیت کی کوئی دوسری مثال دور دراز زمانے تک کہیں نظر نہیں آتی، اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ چند صدیوں تک مسلمانان عالم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے انہیں اوصاف و کمالات ظاہری و باطنی کے فیوض و برکات سے ہر شعبہ دین میں فیضیاب و سیراب ہوتے رہیں گے، اور وہی ان کے لیے معتبر حجت و سند ہو گی۔

فیضانِ تصانیف

اللہ جل شانہٗ نے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ العزیز کو اس دور میں مجددیت کے منصب پر فائز فرمایا تھا۔ حضرتؒ نے مسلمانوں کے ہر شعبہ زندگی میں بڑھتی ہوئی دینی اور دنیوی تباہیوں اور بربادیوں کو محسوس فرمایا اور ان کے دین سے مغائرت کے اسباب پر نظر ڈالی اور دینی شعور کے

بڑھتے ہوئے فقدان کا اندازہ کیا پھر اپنی تمام زندگی مسلمانوں کے رشد و ہدایت اور تبلیغ دین کے لیے وقف کردی۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہمیشہ شامل حال رہی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی حیات ہی میں ان مساعی اور کارنامہ تبلیغ میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی۔ اور ملک کے گوشہ گوشہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تحریری و تقریری فیوض و برکات سے مسلمانوں میں ایک حیات تازہ پیدا ہوگئی جذبۂ اسلامی بیدار ہوگیا اور اکثر و بیشتر مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی میں ایک بہتر انقلاب پیدا ہوگیا۔ اس سے قبل عام معتبر و مستند علوم دینیہ عربی و فارسی زبان میں مدون تھے۔ جن سے علماء یا وہ حضرات ہی مستفید ہوتے تھے جو ان زبانوں سے آشنا تھے۔ مگر اس مجدد وقت کے فیضان ایمانی و روحانی سے اردو زبان بھی دین مبین کی حیات افروز دولت سے مالا مال ہوگئی۔

حضرت والا قدس سرہٗ العزیز کی تصانیف کثیرہ تفسیر، حدیث و فقہ و تصوف پر مشتمل ہیں اور ملفوظات و مواعظ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ دور حاضر کے خاص دینی علوم و فنون کے مبصروں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دینی کارناموں کے پیش نظر یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ اس عہد کے مجدد ملت حکیم الامت و حجۃ اللہ فی الارض تھے چنانچہ اظہر من الشمس ہے کہ خواص و عام کے لیے علماء و صلحاء کے لیے، طالبین و سالکین کے لیے مفید و کار آمد بصیرت افروز اعجازی و الہامی مضامین مدتوں تک منجانب اللہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے قلم و زبان سے جاری رہے۔ شریعت و طریقت کے دقائق

وحقائق کی تشریح و وضاحت ہوتی رہی ۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

مسلمانوں کے لیے دین و دنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر حضرت والا رحمہ اللہ علیہ کی سیر حاصل مستند و معتبر تصانیف و مواعظ و ملفوظات نہ ہوں۔

نصائح و وصایا کا بھی نہایت جامع و نافع مکمل دستور العمل مرتب فرما دیا ہے۔ خود بھی بار بار ارشاد فرمایا ہے بحمد اللہ و بفضلہ تعالیٰ سب ضروری کام ہوگیا ہے۔ صدیوں تک کے لیے دین کا راستہ بے غبار ہوگیا ہے۔ آئندہ نسلوں کے لیے انشاء اللہ تعالےٰ میری ہی تصانیف ملفوظات و مواعظ سے ضروری کام چلتا رہے گا۔ یہ سب حضرت حاجی صاحب قدس العزیز کا فیض و برکت ہے۔

منجانب اللہ تعالےٰ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کو رشد و ہدایت، تجدید دین واعلائے کلمۃ الحق اور احیائے سنت کا منصب عطا ہونا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وجدانًا ابتدا ہی سے آپ نے دین کے ہر شعبہ کا بڑی کاوش ونظر غائر کے ساتھ جائزہ لیا اور جہاں جہاں کوتاہیاں نظر آئیں اُن کی تشخیص فرمائی ۔ ان کے اسباب وعلل پر نظر کی اور پھر ان کے لیے شریعت وسنت کے ضابطہ کے مطابق اصلاح فرمائی۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے تصوّف وسلوک یعنی طریقت کے متعلق علوم باطنی کے تمام معارف وحقائق پر گہری نظر ڈالی، اور خداداد فراست سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حکیمانہ نکتہ رس نظر باطن کے تمام نازک اور لطیف احوال کیفیات وجدانات ومقامات پر پہنچی ہے، اور ہر طرح کے وساوس وخطرات

نفسانیہ اور تمام ملکات حسنہ و ملکات سیئہ کے تقاضوں اور محرکات کو اور مکائد نفسانی اور تلبیس شیطانی کو سمجھا ہے، اور بطور معالجہ " جلب منفعت" اور " دفع مضرت " کے اصول پر کاربند ہونے کے لیے اور مقصود اصلی یعنی تزکیہ نفس و تعلق مع اللہ حاصل کرنے کے لیے نہایت سہل۔ جامع و نافع معالجات و تدابیر کو قرآن و حدیث کی مطابقت کے ساتھ مرتب و مدوّن فرمایا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کثیر التعداد مواعظ اور بے شمار ملفوظات میں بھی مصلحانہ اور مجدّدانہ طریق کار فرما نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف و سلوک کی حقیقت و اہمیت اور ضرورت و غایت واضح کرنے کے لیے بڑی بصیرت افروز اور گرانقدر مضامین پر مشتمل کتابیں تصنیف و تالیف فرمائیں۔ مثلاً مسائل السلوک التکشف۔ التشرف۔ قصد السبیل۔ تعلیم الدین۔ کلید مثنوی۔ بوادر النوادر اور بدائع وغیرہ یہ سب علوم باطنی پر عدیم المثال تصانیف ہیں جن میں شریعت اور طریقت کی ہم آہنگی اور ہدایت و ضلالت اور حق و باطل کا فرق روز روشن کی طرح واضح ہے اور قرآن و حدیث کی سند کے ساتھ حسن و قبح کو نمایاں فرما دیا ہے، اور علوم باطنی کے تمام اصولی و فروعی مسائل کو اصول شریعت کے مطابق مرتب فرما دیا ہے۔ اسی طرح علوم باطنی یعنی تصوف و سلوک کو مستقل فن کی حیثیت سے صحیح صورت میں امت کے سامنے بے کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ یہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسری جگہ (سلف میں ہو تو ہو) نظر نہیں آتی، اور بطور خود مشاہدہ ناطق ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز عصر حاضر میں فن تصوف کے

امام تھے۔ مجدّد تھے۔ مجتہد تھے۔ اس حقیقت سے کون حق شناس۔ اہل دل، اہل نظر انکار کر سکتا ہے؟

ذالِكَ فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم ط

حضرت والا رح کی سوانح حیات پر نظر ڈالنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ جل شانہٗ کو اس زمانے میں چونکہ احیائے سنت اعلاء کلمۃ الحق اور اصلاح امت کا ایک عظیم الشان اور غیر فانی کام لینا منظور تھا، اس لیے ابتدائے عمر ہی میں حضرت رح کے دل میں تبلیغ و اشاعت دین کا ایک مجددانہ و مصلحانہ ذوق اور تقاضا ودیعت فرما دیا تھا۔ درس و تدریس ہی کا زمانہ تھا کہ حضرت رح نے اپنی خداداد فراست اور عام معلومات و تجربے کی بناء پر محسوس کیا کہ اس وقت عام طور پر مسلمان تعلیماتِ دین سے ناآشنا اور غافل ہوتے جا رہے ہیں اور اس وجہ سے طرح طرح کی گمراہیوں، غلط فہمیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

حضرت کی مجلس ایک سچے وارث نبیؐ کی مجلس ہوتی تھی

آپ کی مجلس میں بیٹھ کر ایمان تازہ ہوتا تھا

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح نے اپنے مخصوص انداز رشد سے اپنی مجالس میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس کی تصویر کھینچ کر ہمارے تصورات کو نورانی بنا دیا۔ بے ساختہ یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی

مرا با جان جان ہمراز کردی

اس دور حاضر میں واقعی مولانا تھانوی رح کی مجلس ایک سچے وارث نبی کی مجلس تھی۔

شرف تجھ کو ملا بزم ولا کی باریابی کا !

صحابی تو نہ تھا لیکن نمونہ تھا صحابی کا

دیکھیے اس مجلس روح پرور کی جھلکیاں دیکھیے اور اپنے ایمان میں تازگی پیدا کیجیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی لطافتوں سے سرشار ہو کر اتباع سنت کی سعادتوں سے حیات طیبہ حاصل کیجیے اور صحابہ کرام کا سا اندازہ خلوص و فدائیت پیدا کیجیے۔

دیکھیے اس مجلس کی تنوعات روحانی کیسے کیسے جاذب و دلکش ہیں اور اندازہ کیجیے کہ "خود میر مجلس" کا وجدان روحانی کیسا ہوگا۔

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تو نے یہ مے ظالم شیشہ میں بھری ہوگی

اس وقت تصورات اس قدر تازہ ہو گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت مولانا تھانویؒ کی مجلس ہی میں بیٹھے ہیں۔ قصبہ تھانہ بھون کے ایک گوشہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خانقاہ امدادیہ کی سہ دری میں حضرت مولانا تشریف فرما ہیں۔ ظہر عصر کے درمیان کا وقت ہے کچھ لوگ قصبہ کے اور کچھ باہر سے آئے ہوئے شریک مجلس ہیں عالم بھی ہیں اور عامی بھی۔ ذاکر و شاغل بھی ہیں اور کاروباری بھی سب کے سب ہمہ تن گوش بنے ہوئے عقیدت مندانہ سر جھکائے بیٹھے ہیں جو لوگ حاضر ہیں اور جو دور ہیں سب بیک وقت فیض یاب ہو رہے ہیں۔

ساقی نے لطف خاص کے دریا بہا دیئے
نزدیک و دور عام ہے فیضان میکدہ

حضرت تھانوی کے سامنے جواب طلب خطوط کا ڈھیر ہے ایک ہاتھ میں خط ہے اور ایک ہاتھ میں قلم جواب تحریر فرماتے جا رہے ہیں اور اہل مجلس کی طرف متوجہ ہو کر گفتگو بھی فرما رہے ہیں کچھ خطوط سالکین کے ہیں جنہوں نے اپنے احوال و کیفیات باطنہ تحریر کیے ہیں۔ ان کے جواب لکھے جا رہے ہیں۔ کچھ خطوط فقہی مسائل کے متعلق ہیں جن خطوط میں کچھ اہمیت و خصوصیت ہے ان پر نشان لگا کر علیحدہ رکھا جا رہا ہے تاکہ ان کی نقل کرا کے ماہنامہ رسالہ النور

میں شائع کیا جائے اس طرح بیک وقت سالکین کے احوال اور ان کے جوابات پر مشتمل ایک ذخیرہ تربیت السالک کے نام سے جمع ہو رہا ہے اور وہ خطوط جن میں خاص فقہی مسائل کے جوابات ہیں جمع کیے جا رہے ہیں جو امداد الفتاوی کے نام سے مرتب ہو رہے ہیں، منجملہ دیگر تصنیفات کے یہ دو جلیل القدر کام اس مجدد عصر کی مجالس روزانہ کا کارنامہ ہیں۔ جن کی افادیت و یادگار انشاء اللہ تعالیٰ صدیوں تک قائم رہے گی۔ غرض یہ کام بھی ہو رہا ہے اور حضرت مولانا گفتگو بھی فرما رہے ہیں اور یہ گفتگو بھی خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب، وصل بلگرامی صاحب حکیم محمد مصطفٰے صاحب میرٹھی، مفتی جمیل احمد تھانوی، مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا جلیل احمد صاحب شروانی جیسے اہل دل حضرات قلمبند کرتے جا رہے ہیں۔ جو افادات یومیہ سے موسوم ہو کر جمع ہو رہے ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتے رہے اور جن میں صدیوں تک کے لیے حضرت مولانا کے علوم و معارف محفوظ کر لیے گئے۔

اسی اثنا میں اگر کوئی اجنبی شخص مجلس میں آگیا اور اس نے اپنا تعارف یا اپنے آنے کا مقصد ادھوری یا بے ڈھنگی باتوں سے کیا ہے تو حضرت مولانا کے لہجہ میں تغیر پیدا ہو جاتا تھا اور جب تک وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہ کر لے اور صاف بات نہ کر لے۔ اس سے برابر جرح فرماتے رہتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھے ناتمام اور گول مول باتوں سے سخت الجھن ہوتی ہے کیونکہ اس سے سامع کے دل میں ناگواری اور گرانی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کا ایسا معاملہ کرنے سے خود اس شخص کو اور اہل مجلس کو اپنی اس قسم کی کوتاہیوں پر ہمیشہ کے لیے تنبیہ ہو

جاتا تھا۔ اس فہمائش معاملہ کے بعد حضرت مولانا پھر احباب مجلس کی طرف اسی خندہ صورتی اور تبسم آمیز انداز گفتگو کے ساتھ متوجہ ہو جاتے تھے۔

اب دیکھیے اور سنیے کہ حضرت مولانا نے اپنے احباب مجلس کے ساتھ کس قسم کی باتیں فرمایا کرتے تھے۔

مجلس میں حضرت مولانا مختصر مختلف اور گوناگوں مضامین بیان فرماتے تھے البتہ کبھی کسی خاص موضوع پر اتفاق تقریر ہوا تو دیر تک اور ایک خاص اثر انداز جذبے سے طویل تقریر بھی فرمایا کرتے تھے اگر کبھی کسی نے کوئی خاص تحقیق طلب بات دریافت کی تو اس کی وضاحت فرما دیتے تھے اگر کسی نے کوئی مسئلہ شرعی پوچھا تو کسی مفتی کا پتہ بتا دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس کے بتانے والے بہت ہیں جہاں چاہو پوچھو اور یہ شعر پڑھ دیا کرتے تھے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

مجھ سے تو بس اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت کی باتیں سنو، اور یہی محبت دین کے تمام شعبوں میں روح رواں ہیں۔

اور کسی انداز محبت میں تصحیح عقائد و زاد راہ آخرت کی باتیں کر رہے ہیں۔ اتباع شریعت و اتباع سنت کے لیے اہتمام اور اس کے حدود متعین فرما رہے ہیں۔ اصلاح باطنہ و تزکیہ نفس کے طریق کو واضح کیا جا رہا ہے۔ حسنات و رذائل کی تشریح کی جا رہی ہے۔ اعمال ظاہرہ و باطنہ میں اختیاری و غیر اختیاری مقصود و غیر مقصود کی حدیں قائم کی جا رہی ہیں۔ حکایات و روایات سے ان

امور کی دل نشین کیا جا رہا ہے۔ آداب زندگی اور آداب انسانیت کی تعلیم
کی جا رہی ہے۔ حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق النفس کے ادا کرنے کے
طریقے بتائے جا رہے ہیں اور اسی طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی
عظمت و محبت دل میں اتاری جا رہی ہے۔ مجاہدہ اور حصول تقویٰ کا معیار قائم
کیا جا رہا ہے۔ روزمرہ کی زندگی اور خانگی معاملات اور ازدواجی تعلقات میں
خوشگواری پیدا ہونے کی باتیں کی جا رہی ہیں ملکی و سیاسی حالات پر دینی روشنی
ڈالی جا رہی ہے۔ مختصر یہ کہ حیات طیبہ حاصل کرنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی
رضاجوئی کے لیے تمام معارف و حقائق سہل لفظوں میں بیان کیے جا رہے ہیں۔
غرضکہ بلا تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا مرحوم نے اپنی مجالس رشد و ہدایت
میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس مبارکہ کی جھلکیاں پیدا فرما دیں اور صحابہ کرام
کی زندگی کے نمونے ہمارے سامنے پیش فرما دیئے۔

رنگ مجلس:

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی منصب رشد و ہدایت لے کر آئے
تھے۔ حقائق و معارف حکیم الامت کے مشاہدات میں سے تھے۔ باطن کی تعلیم و
تربیت کا طریقہ اور اصلاح کا انداز عجیب و غریب تھا۔ ابنائے زمانہ کی نبضوں
کو پہچانتے تھے۔ جب واردات و کیفیات باطنہ کا اظہار فرماتے تو دوران گفتگو
سالکین کو قبض و بسط کی لطافتوں سے بھر دیتے۔ کبھی خالی کر دیتے۔ راہروان
طریق کو ناز اور یاس سے بچا بچا کر رکھتے۔ اعتدال کی راہ پر چلاتے۔ خالی کرنے

میں بھی کمال حاصل تھا اور بھرنے میں بھی کوئی مجلس میں نازلے کر جاتا اور فنا ہو کر آتا کوئی یاس لے کر جاتا اور بشارت سن کر آتا۔ جب سالک کو رذائل سے خالی کرنے پر آتے تو ندامت اور شکستگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اپنے عجز و نیاز کی حقیقت سامنے آجاتی۔ سالکین ندامت سے روتے اور اپنے کو ملامت کرتے۔ جب حسنات اور محبت الٰہی سے بھرنے پر آتے تو رحمتوں کے اعلان سناتے۔ بشارتیں دیتے۔ دل جوئی و دل نوازی فرماتے اور حاضرین اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا کھلا اثر محسوس کرتے اور اس طرح سالکین کو ہلکا پھلکا رکھتے، تشویشات سے بچاتے اور اصل کام میں سرگرم رکھتے۔ زبان میں اللہ تعالیٰ نے وہ تاثیر دی تھی کہ مجلس پر نظر ڈال کر کوئی مضمون ارشاد فرماتے تو ہر شخص یہی کہتا کہ میرے دل کی بات کہہ دی، میرا عقدہ کھل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ لوگوں کے قلوب کی حالت حضرت رح پر منکشف فرما رہے ہیں پھر حضرت وہی فرماتے جس کی اہل مجلس کو ضرورت ہوتی۔ حاضرین کے قلبی تاثرات کا احساس فرماتے ہوئے لب و لہجہ ایسا اختیار فرماتے کہ لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں۔

تاثراتِ مجلس:

آپ کی مجلس کے اثرات بڑے قوی اور دیرپا ہوتے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ

"یہاں سے کوئی خالی نہیں جاتا، کم از کم
سب کے کان کھول دیئے جاتے ہیں"۔

اس آخری عمر میں حضرت تھانوی کا فیض روحانی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے

عالم برزخ سے فیض کی لہریں آئی ہوں اسی جذبہ سے متاثر ہو کر میں کبھی کبھی کہہ دیتا ہوں کہ جتنی باتیں مجھ سے سننا ہوں سن لو! یہاں بیٹھ جاؤ میرے پاس اور میری بات سنو اور میری بات یہ ہے کہ حضرت فرماتے تھے۔

"بزرگ بننا ہو، قطب بننا ہو، غوث بننا ہو کہیں اور جاؤ اور انسان بننا ہو تو یہاں آؤ۔"

اور فرماتے تھے کہ:

"پہلے آدمی بنو، کیا بزرگی اور ولایت ڈھونڈتے پھرتے ہو، آدمیت سیکھو، بزرگی بے چاری تو ایک دن میں ساتھ ہو لیتی ہے۔ مشکل چیز تو شرافت نفس ہے اور شعور انسانیت۔"

غور تو فرمائیے کہ حضرت مولانا اپنی مجلس میں بار بار کیا علان فرماتے رہے کس چیز پر زور دیتے رہے اور کن باتوں پر تنبیہ اور مواخذہ فرماتے رہے، کیفیات، مکاشفات، ذوقیات، کرامات، تصرفات کو تو چھوڑئیے ایک درجے میں حضرت مولانا تھانوی ان کو تو اہمیت دینے کے لیے مخالف ہی رہے مگر میں پوچھتا ہوں جو لوگ واقف ہیں وہ بتائیں کہ معمولات یومیہ، تہجد، نوافل، ذکر و اذکار اور وظائف کے چھوٹ جانے پر کسی سالک پر کبھا حضرت کبھی چیں بجبیں ہوئے ہ کیا ان کے کسی عذر شرعی پر معمولات چھوٹ جانے سے کبھی تنبیہ اور مواخذہ فرمایا؟ لیکن اگر کوئی بے اصولی بات کرتا یا بے فکری کا ثبوت دیتا، حقوق واجبہ کا تارک ہوتا، معاملات میں بدنظمی برتتا یا سلیقہ اور ڈھنگ سے کام نہ کرتا یا کسی کی ناگواری کا باعث بنتا تو حضرت تھانویؒ فوراً تیور بدل لیتے سخت اور تیز لہجہ بنا لیتے اور

فوراً اصلاح فرماتے۔ تمام اہل مجلس عموماً اور سالکین کی خصوصیات اس طرف توجہ دلاتے کہ یہ تمام چیزیں دوسروں کی اذیت کا سبب بنتی ہیں اور اذیت نہ پہنچانا واجب ہے اور تم سب اس کے مکلف ہو۔"

تمام بزرگی، قطبیت، غوث اور کشف و کرامات کو نظر انداز کر کے اور تمام غیر ضروری چیزوں کو حذف کر کے حضرت تھانویؒ طالبین و مریدین کی صرف دو صفات پر نظر رکھتے۔ فرماتے تھے کہ میرے یہاں تو طالبین کے اندر دو باتیں دیکھی جاتی ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ اس کے اندر انسانیت ہو یعنی اپنے قول و فعل میں اس چیز کا خیال رکھے کہ اس سے کسی کو ایذا نہ پہنچے۔

(۲) دوسرے میں اس کی کوشش کرتا ہوں کہ سب سے پہلے آنے والے پر مقصود اور اس طریق کی حقیقت منکشف ہو جائے تاکہ عمل بصیرت سے ہو سکے۔

تو پہلے یہ معاملہ درست کر لو پھر مختلف کاروبار میں رہتے ہوئے بھی ہر مسلمان صوفی ہو سکتا ہے جیسے صحابہ درویش تھے۔ پھر ہر مسلمان ولی ہو، جیسے صحابہ ولی تھے ہر مسلمان عاشق ہو جیسے صحابہ عاشق تھے۔

یہ بھی حضرت حکیم الامت تھانوی کی مجلس کی ایک جھلک جو آپ حضرات کے سامنے پیش کی ہے۔

بالآخر دین مبین کا یہ آفتاب، عالم تاب، نصف صدی سے زاید کے پھیلے ہوئے زمانے تک عالم اسلام کی فضاؤں میں اپنی ایمان افروز و غیر فانی شعاعیں چھوڑ کر ۸۲

سال کی عمر میں ۱۵ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ میں مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء کی سہ شنبہ کی شام کو غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب یہ پیکر صدق و صفا ابدی و سرمدی رحمتوں کے ساتھ اپنی ارض وطن مالوف کے آغوش ناز میں آسودہ و خوابیدہ ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مدفن قبرستان موسوم بہ تکیہ جانب شمال خانقاہ تھانہ بھون
ضلع مظفر نگر۔ یو۔ پی۔ (ہندوستان)

مقالہ نمبر ۲
حکیم الامت حضرت تھانوی
اور
میرے ذاتی تاثرات
حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی قدس سرہٗ
سابق مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور

حکیم الامتؒ

تاثرات و مشاہدات!

حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی قدس سرہٗ

نازہے گل کی نزاکت پہ چمن کو اسے ذوق!
اس نے دیکھے ہی نہیں نازو نزاکت والے

۱۲۸۰ھ سے لے کر ۱۳۶۲ھ تک کا زمانہ ایسا گذرا جس میں حق تعالیٰ شانہٗ کے جوشِ رحمت نے دنیا کو ایک زبردست فطری ہادی عطا فرمایا، جس نے پاک و ہند کی سرزمین بلکہ دنیا بھر کو سیراب فرمایا۔ ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کے ایک ضلع مظفر نگر کے قصبہ تھانہ بھون میں سے یہ فیض کا لاوا پھوٹا، جس سے تمام عالم فیضیاب ہوا، ان کا نام نامی حضرت مولینا محمد اشرف علی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے علوم ظاہری کا خزانہ جمع کر کے قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے فیض سے نورِ باطن کا سمندر اپنے اندر سمو لیا۔ جس کی شہادت کے لیے ایک ارشاد بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک خاص الخاص مجلس میں حضرت حاجی صاحبؒ کی تحریر کسی اور بزرگ کے نام کی نقل فرمائی:

"یہ تو اب ماشاء اللہ فلاں فلاں (اجل خلفاء) سے بھی آگے

بڑھ گئے ہیں"

اور پھر فرمایا کہ میں نے اس تحریر کو ضائع کر دیا کہ کسی کے ہاتھ نہ آسکے۔

خود حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بڑے بڑے خلفاء کرام نے اس پر ہمیشہ مہر تصدیق ثبت کی۔ مثلاً مولانا محمد حسین الہ آبادی، حضرت مولانا محب الدین، حضرت مولانا شفیع الدین، حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت نانوتوی وغیرہ نے حضرت سے ہمیشہ اعزاز و اکرام کا معاملہ رکھا۔ صحیح ہے

ولی را ولی می شناسد

افادۂ باطنی :

ہزاروں نیک بندوں نے حسب استعداد صحبت و تعلیمات کا نور باطن پایا کہ خود ان کی نور پاشی کے چشمے اطراف عالم میں فیض رسانی کا باعث ہیں۔ ان کی تعداد اور ان کے مستقل پتے اشرف السوانح میں مفصل مذکور ہیں صرف پاکستان میں ہی جو تعداد ان حضرات کی ہے جنہوں نے حضرت والا قدس سرہٗ سے بلا واسطہ فیض حاصل کیا حتیٰ کہ خود بھی فیض رساں ہو گئے۔ "مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان" کی سعی و کوشش سے لاہور میں مجتمع ہو کر اہل لاہور کو فیضیاب کر گئے، جس سے لاہور پر انوار کی گویا بارش برس گئی، ان کی صحبت خواہ تھوڑی دیر ہی کی رہی ہو۔ جس کو میسر آئی وہ کیمیا اثر ثابت ہوئی ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

تمام زیر اصلاح و تربیت رہنے والوں کا روزمرہ کا تجربہ رہا ہے کہ

جس وقت حالات سے مطلع کرتے کا خط پہنچتا تھا۔ اپنے اپنے دلوں کی دنیا کی کایا پلٹ کا فوری مشاہدہ ہزاروں سینکڑوں میل دور اپنے اپنے گھر بیٹھے ہوتا رہتا تھا۔ اس کی صحیح کیفیت اسی سے معلوم ہو سکتی ہے جو کبھی حضرت کے زیرِ اصلاح رہا ہو۔ اب بھی چند ایسے حضرات باحیات موجود ہیں جنہوں نے اس انقلابی اثر کو دیکھا ہے۔

عام مجلس مبارک میں جو ظہر سے عصر تک ہوتی تھی، ۵۰، ۶۰ خطوط کے جوابات بھی لکھے جاتے تھے۔ بزرگوں کے احوال بھی ارشاد ہوتے رہتے تھے، علوم ظاہر و باطن کے نکات بھی، آیات و احادیث کی شرح و تفسیر محیر العقول راز و اسرار بھی، سوالات کے جوابات بھی، مسائل کی تحقیقات بھی ہوتی رہتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ مجلس کے شرکا و حاضرین میں سے ہر ایک کے دل پر اس کی استعداد کے مطابق نور کی پھوار بھی آخر مجلس تک رہتی تھی۔

ہر شخص کا ذاتی مشاہدہ تھا کہ جو اشکال یا کوئی علمی گنجلک، اس کے دل میں ہوتی ہر روز کی مجلس میں اس کا حل، ہر ایک کے لیے بلا عرض و معروض، خاص طور پر مخاطب کیئے بغیر کسی سلسلۂ گفتگو کے ضمن میں آجاتا۔ ایک روز کشف کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک پرانے زیر تربیت صاحب نے عرض کیا کہ جناب کو کشف ہوتا ہے۔؟

"فرمایا کہ "نہیں""

اس موقع پر مولانا عبد الماجد دریا بادی ایڈیٹر ماہنامہ "صدق" بھی لکھنؤ بھی موجود

فقیہ بے ساختہ بول پڑے کہ حضرت! ہوتا ہے۔

فرمایا کہ "نہیں"

اُنہوں نے عرض کیا کہ خدا کی قسم ہوتا ہے۔

فرمایا قسم تو نہ کھاؤ۔

اُنہوں نے عرض کیا کہ ہم میں سے ہر شخص کا ہر روز کا تجربہ ہے کہ جو شبہ، وہم اور وسوسہ، اس کے دل میں ہوتا ہے۔ مجلس میں اس کا حل ضرور ہو جاتا ہے

فرمایا کہ:

"یہ کشف نہیں ہے بلکہ حق تعالے شانہ، کو جس کی ہدایت منظور ہوتی ہے اس کے سامنے زبان سے نکلوا دیتے ہیں چاہے کہنے والے کو خبر بھی نہ ہو۔"

خود احقر کو اس کا بارہا تجربہ ہوا اور ایک دن تو شرمندگی بھی ہوئی۔ میں نیا نیا فتاویٰ کا کام کرتا تھا۔ فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ دیکھا کہ:

"اگر کوئی عورت خاوند کے تابع ہونے کا تعویذ مانگے تو دینا جائز نہیں۔"

دل میں خلجان ہوا کہ ہمارے سارے بزرگ تو اپنی اس خصوصیت میں سارے زمانہ میں مشہور ہیں کہ فقہ و عقائد میں راجح وقوی ترین مسائل پر عمل کیا کرتے ہیں پھر یہ عورتوں کو تعویذ دینے کا معمول کیوں ہے۔ ایک روز مجلس میں حاضر تھا کہ کسی شخص نے ایک عورت کے لیے تعویذ مانگنے کا ذکر کیا۔ حضرت نے تعویذ لکھا اور عنایت فرمایا۔ میرے دماغ میں وہی خلجان ہو رہا تھا تو

پوری مجلس کو چھوڑ کر صرف مجھ ہی کو خطاب کر کے فرمایا کہ:

"فقہاء نے منع لکھا ہے اور ہے بھی صحیح کیونکہ جیسے کسی پر ظاہر میں جبر کرنا جائز نہیں باطن میں بھی جائز نہیں۔ مگر میرا اپنے بزرگوں کے مطابق یہ معمول ہے کہ "جملہ لاداء الحقوق الواجبہ" پڑھا دیتا ہوں تاکہ شوہر حقوق واجبہ کی ادائیگی کرنے لگے۔ اور حقوق الواجبہ ادا کرنے کیلئے جیسے ظاہر میں جبر کرنا جائز ہے ایسے ہی باطن میں بھی جائز ہے"

میرا پورا خلجان پادر ہوا ہو گیا۔ آنکھیں کھل گئیں مگر شرمندگی یہ ہوئی کہ پورے مجمع میں سے مجھ ہی کو مخاطب فرمایا جو خلافِ معمول تھا۔ سب کو علم ہو گیا ہو گا کہ یہ خلجان اسی کے دل میں تھا، گو پھر بات یہ بھی ذہن میں آئی کہ اس وقت مجمع میں ان مسائل کا واقف اور کوئی نہ تھا، اس لیے مخاطب مجھ ہی کو فرمایا۔ اب ع

بہ پیش بزرگاں نگہدار دل !

کا مطلب سمجھ میں آیا۔

برکات:۔

اکثر حضرات سے معلوم ہوا اور خود کا بھی بارہا کا تجربہ ہے کہ جب کسی کے لڑکا یا لڑکی پیدا ہوئی اور حضرتؒ سے نام رکھنے کے لیے عرض کیا تو لڑکے کے لیے باپ کے نام کے قافیہ کے اور لڑکی کے لیے ماں کے نام کے قافیے کے ایک یا دو، چار نام اسی وقت لکھ دیئے سب کا تجربہ

یہ ہے کہ جتنے نام لکھے اتنے ہی بچے ہوئے اور زندہ رہے۔ کانپور کے عبدالغفار خان صاحب مرحوم نے پہلے لڑکے کے نام کے بارے میں درخواست کی تھی، تو حضرتؒ نے صیار، عمار، وغیرہ آٹھ نام اسی وقت لکھ کر بھیجدیئے ان کے یہ آٹھوں بیٹے انہیں ناموں کے ساتھ آج بھی کراچی میں بحمداللہ موجود ہیں۔ خود احقر نے بڑے لڑکے کی پیدائش پر نام کے لیے عرض کیا تو چار نام تجویز فرمائے بحمداللہ چاروں موجود ہیں۔ میاں نیاز خان کے جو حضرتؒ کے بڑے گھر کے ملازم تھے۔ لڑکا ہوا تو نام پوچھا فرمایا:

"ایاز"

اور فرمایا:

"اور کوئی قافیہ ہی ذہن میں نہیں آیا"

بھائی نیاز مرحوم کے بس صرف وہی ایک لڑکا رہا اور کوئی بچہ نہ ہوا جو کہ کراچی میں ہیں۔ اور بھی بہت سے حضرات نے ایسے واقعات بیان کئے ہیں کہ جتنے نام تجویز فرماتے تھے اتنے ہی بچے ہوتے تھے۔

مجلس کے حاضر باش خاموش بیٹھنے والوں کو بھی اس کا تجربہ ہے کہ ان سب کے دلوں کے وساوس و خطرات بد عقیدگیاں وغیرہ خود بخود دور ہوتے رہتے تھے، میں نے خود ایک عریضہ میں عرض بھی کر دیا تھا جب کہ طلب علم کا رسمی زمانہ ختم ہو کر تدریس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، کہ میرے خیالات بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ آج کل یورپ کے گندہ اثرات سے دور دور رہنے والوں تک بھی پہنچ کر ہی رہتے ہیں، بحمداللہ حضرت کی مجالس کی

شرکت سے اب سب کافور ہو گئے۔ اور قریب قریب سب کا ہی یہ تجربہ ہے۔ بقول شاعر ؂

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

دلوں سے زنگ دُور ہو کر دینی رنگ کا ظہور ہو جاتا ہے۔

عمر رسیدہ حضرات جنہوں نے "خلافت کمیٹی" کا دَور دیکھا ہے انہیں یاد ہو گا کہ اس کمیٹی کا پورے ملک میں زور شور تھا۔ حضرت تھانویؒ اس کمیٹی میں شریک نہ تھے۔ اور اس کو مسلمانوں کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ انگریزوں کی حکومت سے تو ہر مسلمان کو نفرت تھی۔ اور اسلامی حکومت کا قیام ہر مسلمان کی تمنّا تھی، مگر اس ہنگامہ آرائی میں مسلمانوں کے لیے دو قسم کے خطرات تھے ایک یہ کہ ہندوؤں کے اختلاط سے مسلمان اسلامی تعلیمات بلکہ عقائد تک سے تر پھر جائیں۔ دوسرے یہ کہ ہندوؤں کا اعتبار نہیں دغاباز قوم ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو جو کچھ کرنا ہے وہ صرف مسلمان تنہا کریں۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے کریں ورنہ خطرات سامنے ہیں۔

دوسرے علماء، دشمن کو قوی سمجھ کر ہندوؤں سے میل جول کی تاویلات کر کے اسے درست سمجھتے تھے۔ گو بعد میں سب کو وہ خطرات نظر آ گئے جو حضرت علیہ الرحمۃ کی فراست نے پہلے ہی سے بھانپ لیئے تھے، قصبہ رامپور میں جو تھانہ بھون سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے، میرے ایک عزیز سیاسی مزاج کے بڑے سرگرم تھے، اور مجلسوں میں بیٹھ بیٹھ کر

لوگوں سے بار بار کہتے کہ:

"میں اگر حضرت تھانویؒ سے ملوں تو یوں کہوں اور یوں کہوں ایسے کہوں ویسے کہوں۔"

لوگ کہتے کہ قریب ہی تو تھانہ بھون ہے، وہاں ہو آیئے، تو کہتے کہ نہیں یہ مناسب نہیں سمجھتا۔ ایک مرتبہ حضرتؒ کا سفر قصبہ اسلام نگر کا ہوا، اس کے لیے رامپور اسٹیشن پر اتر کر تین میل بیل گاڑی پر سفر کرنا تھا، رات کو ریل سے روانہ ہو کر صبح فجر کے وقت رامپور پہنچے، وہاں ایک مسجد میں فجر کی نماز ادا کی۔ بیل گاڑی ابھی پہنچی نہ تھی، اس لیے مسجد میں ہی تشریف فرما رہے، بہت لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ملفوظات سے مجلس گرم رہی وہ صاحب بھی خاموش بیٹھے تھے، آدھ، پونے گھنٹہ کے بعد سواری آنے کی اطلاع ملی اور حضرتؒ اٹھ کر تشریف لے گئے تو ان سیاسی مزاج شور و شغب برپا کرنے والے صاحب سے کسی نے عرض کیا کہ:

"آج تو حضرت آپ کے گھر تشریف لا کر پون گھنٹہ تشریف فرما رہے مگر کیا ہوا کہ آپ کے منہ پر مہر سکوت ہی لگی رہی یوں تو روز روز آپ بڑی باتیں کرتے تھے، اب کیوں نہ بولے۔"

کہنے لگے:

"بھائی! میں خود حیرت زدہ ہوں قصہ سمجھ میں نہیں آتا، میں بولنا، اور کچھ کہنا چاہتا تو فوراً یہ دل میں آتا کہ اس کا جواب تو یہ دے دیں گے۔ پھر کوئی دوسری بات ذہن میں آتی تو فوراً اس کا

جواب ذہن میں آنا پورا وقت اسی ادھیڑ بن میں گذر گیا کہ کیا کہوں
اور کیا نہ کہوں، "میں خود حیرت میں ہوں" سچ ہے
"اسے لقائے تو جواب ہر سوال"

برکت یا زندہ کرامت:

بعض حضرات ناواقفیت کی بدولت کرامتوں کا انکار کیا کرتے ہیں تو اسے زندہ برکت کہہ لیجئے کہ آج بھی حضرت کے مطبوعہ مواعظ اور ملفوظات میں علوم ظاہر و باطن اور بڑے بڑے نکتے سربستہ اسرار کے علاوہ یہ خاص بات اور خاص اثر ہے کہ جو شخص بھی ان کا مطالعہ کثیر تعداد میں مسلسل کرلے اس کی عقل، طبیعت، اور دل و دماغ میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا ہو جائے گی، طبیعت میں ایک انقلاب برپا ہو کر صحیح دین کی لگن لگ جائے گی۔ ہر شخص کے لیے یہ نسخہ کیمیا اثر موجود ہے، جب چاہے آزما کر، تجربہ کرکے دیکھ لے، ہم نے خود بہت سے حضرات میں اس کا مشاہدہ۔ اور تجربہ کیا ہے۔ آج بھی اگر کوئی خیر خواہ قوم و ملت جو معاشرہ کو اور ملک کو پاکیزہ، صاف و شفاف دیکھنا چاہتا ہو، وہ اس کیمیاوی نسخہ کو جس میں دن بھر میں صرف چند منٹ خرچ کرنے پڑیں گے آزما کر دیکھ لے، اپنے لیے، اپنے گھر کے لیے، اور شہر و ملک کے لیے ان مواعظ و ملفوظات کا مسلسل مطالعہ انشاء اللہ دینی انقلاب کا باعث ہوگا۔

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد   واللہ خلاف نیست کہ او عشقباز شد

حضرت علیہ الرحمۃ کی اصل کرامت تو وہ حضرات ہیں جو خود مجسم کرامت ہیں اور جو ہماری اور آپ کی طرح معمولی انسان تھے، اور حضرت علیہ الرحمۃ کی توجہ اور ان کی تعلیمات سے کہیں سے کہیں پہنچ گئے، کرامت کا اصلی مظہر تو یہی قابلِ دید ہستیاں ہیں جو اب بھی بفضلہٖ تعالیٰ پاک و ہند اور دوسرے ملکوں میں اپنی اپنی جگہ لوگوں کے دلوں کو دین و عشق حقیقی سے گرما رہے ہیں۔

مستجاب الدعاء:

اولیاء اللہ کی ایک ظاہری علامت جو ہر کس و ناکس کو معلوم ہو جاتی ہے ان کا مستجاب الدعوات ہونا ہے کہ ان کی دعائیں بارگاہِ الٰہی سے قبولیت کا تمغہ پالیتی ہیں۔ حضرتؒ کی یہ علامت ہزاروں واقعات سے ظاہر ہوئی، اور بے شمار افراد کو اس کا تجربہ ہوا، بعض باتیں تو ایسی ہیں جو آج تک محسوس کی جا سکتی ہیں۔ خانقاہ میں عصر کے بعد "ختم خواجگان" نامی ایک وظیفہ چند آیات و دعوات ماثورہ پر مشتمل، حضرتؒ کی ہدایت پر ہوتا تھا، اختتام وظیفہ پھر سب حاضرین دعا کیا کرتے تھے، اس میں ایک دعا یہ بھی ہوتی تھی کہ خانقاہ کے کنویں کا پانی میٹھا اور ٹھنڈا ہو جائے، میرے بچپن میں بلکہ اس سے قبل بھی اس کنویں کا پانی کھارا تھا، پینا مشکل تھا، اس پانی کی نمکینی سے لوٹوں کو بھی پھپھوندی لگ جاتی تھی۔

اس کے دیکھنے والے شاید اب بھی زندہ ہوں، مگر اب وہ پانی نہایت

ٹھنڈا اور میٹھا ہے کہ برف ذخیرہ نہ ہونے پر لوگ وہاں سے پانی بالخصوص رمضان المبارک میں روزہ کے افطار کے لیے لے جایا کرتے، جس کا جی چاہے اب بھی اس کا ذائقہ چکھ لے اور پیلے کا معلوم کرلے۔

ایک دعا یہ ہوتی تھی کہ تھانہ بھون کا اسٹیشن قریب اور جلد بن جائے اس زمانہ میں ریل کمپنی کی تھی۔ تھانہ بھون کا اور جلال آباد کا ایک ہی اسٹیشن تھا، یہ جلال آباد سے تو قریب تھا لیکن تھانہ بھون سے دور پڑتا تھا بظاہر کوئی صورت نہ تھی کہ ریل گورنمنٹ کی تو تھی نہیں کہ اس سے درخواست کی جاتی مگر اس دعا کا اثر سب نے دیکھا کہ تھانہ بھون کے قریب ہی ایک اسٹیشن بن گیا اور قدیم اسٹیشن جلال آباد کے لیے رہا۔ اسی ختم میں پاکستان بن جانے کے لیے بھی دعائیں ہوتی تھیں نتیجہ سب کے سامنے ہے، یہ تو عام دعائیں تھیں جن کا اثر عمومی انداز سے سامنے آگیا، خصوصی دعاؤں کا نتیجہ دعائیں کرانے والوں کو خوب معلوم ہے۔

لیڈروں کے دفن کردینے کے بعد پاکستان کا احیا :-

یوں کہنے کو جس کو جی چاہے بانیٔ پاکستان کہہ لیں یہ پروپیگنڈے کی باتیں ہیں۔ علماء حضرات، اور بزرگوں میں پروپیگنڈا نہیں ہوتا، مگر دنیا جانتی ہے کہ ابتدار سے ہی پاکستان کے حامی، دعا گو اور اس کے لیے کوشاں، مقبول الدعا لوگوں میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور

ان کے متعلقین کے سوا اور کون تھا گو بعد کے آثار دیکھ کر تو بہت لوگ میدانِ حمایت میں کود پڑے تھے۔ مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیعؒ کی تحقیقات بنام "افاداتِ اشرفیہ" دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ لیگ اور کانگریس یا جمعیت علماء ہند سے سیاسی معاملات کس نے کیے اور کس نے منوائے، بقول نواب جمشید علی خاں صاحب نواب باغپت مرحوم؛

"محمد علی جناح، لیگ کے جلسہ کے لیے دو، دو آنہ دے کر مزدوروں کو جمع کر کے دہلی میں جلسہ کا نام کرتے، اور اخباروں میں دیا کرتے تھے۔"

حضرت تھانویؒ کا پیام، اور مجلس صیانۃ المسلمین کا نظام جب سے دہلی کے جلسہ میں پڑھا گیا۔ اس کے بعد سے اس کے نواح میں، اور پٹنہ میں حضرت تھانویؒ کے پیام کے بعد اس کے گرد و نواح میں لیگ، لیگ، پاکستان پاکستان کا غلغلہ بلند ہوا تھا، ابھی کچھ ایماندار، اس بات کے جاننے والے موجود ہوں گے۔ ان سے اس بات کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ لیکن حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ تمام مسلمان لیڈروں نے زور و شور ہنگامہ آرائیاں کرنے کے بعد بھی ہندوؤں کی چال میں آکر پاکستان کو دفن کر ڈالا تھا، منہ سے گو نہیں کہا مگر عمل سے زیرِ خاک اسے پنہاں کر دیا تھا، اور وہ اس طرح کہ ہندوؤں نے اپنی سابقہ روایات کے مطابق غداری کی، اور وائسرائے کو باور کرا دیا کہ ہم آپ کی حکومت میں رہنا نہیں چاہتے اُوپر آپ کی حکومت رہے اور اندرونی اختیارات ہم کو دے دیئے جائیں۔ یہ اسکیم نہایت خطرناک اور مسلمانوں کو

بالکل کچل دینے والی تھی، مگر افسوس مسلمان لیڈر بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور طے پایا کہ کیبنٹ کی ممبریاں اس طرح تقسیم کر دی جائیں کہ چار کانگریس، چار مسلم لیگ، دو اچھوت، ایک سکھ وغیرہ وغیرہ۔ اور سب مسلمان لیڈر جن کو آج بانیٔ پاکستان سمجھا جا رہا ہے۔ اس اسکیم کو تسلیم کر چکے تھے اور گویا پاکستان کو دفن کر کے اس سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ ابھی ایسے بہت لوگ زندہ ہیں جو یہ تماشہ دیکھے ہوئے ہیں۔ ان سے بھی تصدیق ہو سکتی ہے کہ تمام مسلمان لیڈر اس اسکیم کو منظور کر چکے تھے یا نہیں۔ بالفاظ دیگر پاکستان کو دفن کر چکے تھے یا نہیں۔ تب آپ کو غلط تاریخوں، اور پروپیگنڈوں کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس اسکیم کی خبر جب تھانہ بھون پہنچی تو حضرت حکیم الامت اور دیگر اہل خانقاہ کو صدمہ ہوا مگر اہل اللہ کے لیے تو سوائے ایک دروازے کے دوسرا دروازہ ہی نہیں ؎

گریہ ہائے نیم شبی اور دعائے صبح گاہی

وظائف و اوراد، اس کے لیے تجویز ہونے لگے، حق تعالیٰ نے اس معاملہ میں بھی اپنی قدرت خاص، اور کرم کا ایک نمونہ دکھا دیا کہ مسلمانوں کے دشمنوں ہی سے کام لیا کہ ہندوؤں میں اختلاف پڑ گیا۔ اور انہوں نے اس اسکیم کا انکار کر دیا، اس لیے کہ انہیں چار سیٹوں میں سے ایک سیٹ مسلمان کانگریسی کو دینی پڑتی تھی۔ لیگ تو مخالف کانگریسی کو اپنی کوئی سیٹ نہیں دے سکتی تھی۔ مگر کانگریس بھی اپنے شریک کار بلکہ مدار کار مسلمانوں کو صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ایک سیٹ بھی نہ دے سکی۔ لیگ و کانگریس کی آویزش بڑھی اور بالآخر انکار

ہوگیا۔

پاکستان کے بارے میں پیشین گوئی

حاجی سعید احمد صاحب عثمانی جو میرے برادر نسبتی بھی تھے۔ بیان کرتے تھے کہ۔

"ایک شب دو بجے کے قریب پاکستان بننے سے برسوں پہلے ایک گفتگو میں جوش کے ساتھ فرمایا تھا کہ ۴۷ء میں پاکستان بن جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ"

حضرتؒ کی وفات ۶۲ھ مطابق ۴۳ء میں ہوگئی مگر اس دعا کی مقبولیت ناشکرگذار بھی دیکھ رہے ہیں۔ ہم اس کو کرامت یا برکت بھی نہیں کہتے اور نہ ہی یہ کہتے ہیں کہ بانی پاکستان کون ہے، کوئی نہیں، صرف حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور رحمت عظیمہ سے باوجود مسلمان لیڈروں کے ہاتھ دھو بیٹھنے کے، بخشا ہے۔ بس دراصل وہی بانیٔ پاکستان ہیں نہ کوئی جن، نہ انسان نہ ولی نہ شیطان۔

حقیقت توکل اور اس کے درجات

اللہ تعالیٰ کے سپرد کرکے مطمئن ہونے کا نام توکل ہے، اس کا وہ درجہ جو ہر ہر مسلمان پر فرض ہے یہ ہے کہ ہر معاملہ میں جس قدر تدبیریں کرسکتا ہو ضرور کرلے، لیکن کسی تدبیر کو بجائے خود موثر نہ مانے، موثر بالذات صرف ذات خداوندی

ہے۔ ان کو منظور ہوگا تو یہ کام ہوگا۔ اور اگر منظور نہ ہوگا تو یہ کام نہ ہوگا۔ اور ہونا یا نہ ہونا حکمت ہی حکمت ہوگا۔ کسی غیر کو موثر ذاتی سمجھنا شرک ہے۔

توکل کا دوسرا درجہ جسے ترک اسباب کہا جاتا ہے مستحب ہے، اور وہ بھی جب ہے کہ آدمی کا دل ایمانی قوت سے معمور ہو اور اسے ایمان کامل حاصل ہو۔ نیز اور بھی دیگر شرائط کے ساتھ یہ درجہ توکل مستحب ہوتا ہے یہ بڑے کمال کا درجہ ہے۔ لیکن بلا شرائط اس کا اختیار کرنا درست بھی نہیں ہے

موحد چہ برپائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد زکس
ہمین است بنیاد توحید و بس

اعلیٰ و مستحکم بنیاد توحید یہی ہے مگر اس کے شرائط کا پورے طور پر موجود ہونے کا حکم لگانا بڑے مبصر کے دیکھنے کا کام ہے ہر ایک کا نہیں امید اور خوف ہر دو شعبوں میں صرف خدا تعالیٰ ہی کا آسرا ہو۔ دوسرے پر نظر نہ ہو یہ توکل تو فرض ہے اور اسباب بھی بعد وجود شروط کے ترک ہوں یہ مستحب ہے۔

مدرسہ جامع العلوم کانپور کی ملازمت کے زمانہ میں جب حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئی تو

حضرت حاجی صاحبؒ نے واپسی کے وقت فرما دیا کہ کانپور کی ملازمت چھوٹ جائے تو پھر ملازمت نہ کرنا۔ قطبِ وقت شیخ نے مستحب درجہ کے شرائط توکل کے دیکھ لیے تو موجودہ سبب یعنی ملازمت چھوڑنے کو تو نہیں فرمایا البتہ اس کے نہ ہونے میں دوسری جگہ کی کوشش کے ترک کو فرمایا۔ حضرتؒ جب واپس آئے اور وہاں کی ملازمت ترک ہوئی تو پھر تمام عمر یہی صورت رہی، کوئی ملازمت یا جز وقتی کام نہیں کیا۔ اس دوران فقر و فاقہ میں امتحان بھی رہا۔ مگر اس درجہ توکل پر وفات تک ثابت قدم رہے، تو پھر خوب ملا۔

(خلافت کمیٹی) جس کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے جب کہ پورے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی اخبار "الامان" دہلی کے ایڈیٹر کو خلافتیوں نے قتل کرڈالا تو حضرت تھانویؒ کو بھی دھمکیاں ملنی شروع ہوگئیں کہ مخالفت ترک کرکے شرکت کریں، ورنہ ایڈیٹر "الامان" کا سا نتیجہ ہوگا لیکن حضرت اقدس پر اس کا کوئی اثر نہ تھا حتیٰ کہ صبح کو سیر کو تنہا جانے کا معمول بھی ترک نہ فرمایا۔ صبح کی مشی کا بھی یہ عجیب معمول تھا کہ فجر کے بعد حمائل شریف ہاتھ میں لے کر سیر کو جاتے تھے اور تلاوت فرماتے جاتے، جہاں متشابہ لگتا حمائل شریف میں دیکھ لیتے، اور جہاں تک جانے سے آدھی منزل پوری ہوتی وہیں سے واپسی ہوتی، اور واپسی میں بقیہ آدھی منزل ہو جاتی، ایک منزل روزانہ تلاوت ہوتی تھی، دھمکی کے خطوط آنے کے بعد اور تو کسی معمول میں کیا تغیر ہوتا اس کو بھی کبھی ملتوی نہ فرمایا۔ ایک روز ایک ہندو راجپوت

جنگل میں ملا۔ سلام کے بعد کہنے لگا مولوی جی! تمہیں خبر بھی ہے لوگ کیا کہتے ہیں؟ فرمایا ہاں چودھری صاحب مجھے بھی خبر ہے۔ مگر مجھے ایک اور بات کی بھی خبر ہے، بولا وہ کیا؟ فرمایا:

"جو وہ چاہتے ہیں وہ ہوتا ہے جو نہیں چاہتے وہ نہیں ہو سکتا"

بولا کہ پھر تمہیں کوئی جوکھوں (خطرہ) نہیں۔ اصلاحی تعلیمات کا اثر غیر مسلموں تک پر تھا۔ اب مسلمان بھی خالی خالی معلوم ہوتے ہیں۔

خلافت والوں نے دیکھا کہ کچھ اثر نہیں ہوتا تو پھر ایک تاریخ اور دن، مقرر کر دیا کہ فلاں دن سیر کے وقت جنگل میں آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ مولوی شبیر علی صاحب تھانویؒ جو حضرت کے بھتیجے تھے اور مثل بیٹے کے حضرت کے پاس ان کی پرورش میں ہی رہے تھے گھبرا اُٹھے۔ بار بار عرض کیا کہ حضرت مشی (سیر) کوئی فرض نہیں، واجب نہیں، سنّت یا مستحب نہیں۔ اگر آج تشریف نہ لے جائیں تو کیا حرج ہے۔ مگر منظور نہ فرمایا۔ آخر عرض کیا کہ اچھا مجھے اور فلاں کو اجازت ہو کر ساتھ چلیں؟ فرمایا:

"ہرگز نہیں، کوئی نہ جائے میں حسبِ معمول تنہا ہی جاؤں گا"

اس معمولی سے معمول میں بھی فرق نہیں ڈالا، مولوی شبیر علی صاحب آخر کو اولاد تھے صبر نہ ہو سکا، چپکے چپکے درختوں کی آڑ میں ہوتے ہوئے ذرا دور دور رہتے ہوئے چلے۔ مگر حضرت اپنی تلاوت میں مصروف رہے اور اپنے

معمول سے فراغت کے بعد واپس تشریف لے آئے۔

اخیر عمر میں بیماری کے زمانہ میں احقر خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ حضرت کو جب چلنے پھرنے سے معذوری ہو گئی تو بڑی اماں صاحبہ (بڑی پیرانی) کی اجازت سے چھوٹی اماں صاحبہ مدظلہا (پیرانی) کے یہاں ہی حضرت کا قیام رہتا تھا، اور مجھے چھوٹی اماں صاحبہ مدظلہا کا داماد ہونے کی وجہ سے حاضری میسر تھی۔ ایک دن چھوٹے گھر کے ملازم حاجی سلیمان مرحوم نے مجھے آواز دی، دروازہ پر گیا تو تین صاحبان کھڑے ہیں، تینوں بمبئی کے سیٹھ معلوم ہوتے تھے۔ باتیں کرنے پر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہ مسلمان نہیں آتش پرست ہیں انہوں نے حضرتؒ سے تنہائی میں ملنا چاہا، میں نے عذر کیا کہ حضرتؒ بیمار ہیں، گھر میں پردہ رہتا ہے، جو کچھ کہنا ہو آپ لکھ کر دے دیجئے، میں پیش کر دوں گا۔ جواب وہ خود لکھیں گے وہ آپ کو لا کر دے دوں گا، اور میں بقسم کہتا ہوں کہ نہ آپ کی تحریر کو دیکھوں گا نہ جواب کو، اور دل میں خطرہ یہ تھا کہ چونکہ اس وقت ہندو مسلم خلفشار چل رہا ہے۔ ایسا نہ ہو یہ کچھ حرکت کر بیٹھیں حضرت بیمار ہیں اور پھر تنہا اور یہ تین، میری ہمت نہ ہوئی کہ جانے دوں مگر انہوں نے خوشامد کی، ادھر حضرت کا ارشاد تھا کہ:

"مجھے اطلاع تو کر دیا کرو"

خیر میں نے جا کر عرض کیا کہ ایسے ایسے تین شخص ہیں غیر مسلم معلوم ہوتے ہیں تنہائی میں ملنا چاہتے ہیں میں نے عذر بھی کیا مگر وہ نہیں مانے فرمایا:

"بلا لو"

مگر میری ہمت پھر بھی نہ ہوئی چھوٹی اماں صاحبہ مدظلہا سے کہا کہ یہ واقعہ ہے اور کوئی اطمینان نہیں اور حضرت فرمارہے ہیں کہ بلالو، وہ حضرت کے پاس گئیں۔ اور آکر یہی کہا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ بلالو۔ بڑا دروازہ مشرقی جانب تھا، اور ایک چھوٹا دروازہ جنوبی جانب تھا———

———درمیان میں پردہ کی قنات ہوتی تھی، میں نے ملازم سے کہا چھوٹے دروازے سے لے آؤ، مگر تم کو آڑ کے پیچھے کان لگائے رہنا، میری آواز پر فوراً تیر کی طرح آجانا اور میں قنات کے پیچھے ہوکر دیکھنے کی کوشش کروں گا، وہ لوگ آئے اور دو منٹ بعد بڑے دروازے سے واپس آ گئے، پھر ملازم نے کھٹ کھٹ کی، میں حضرت کے پاس گیا تو ان میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ ان صاحب نے منت مانی تھی۔ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو اللہ کے کسی ولی کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ پیش کروں گا، اور جب تک پیش نہ کردوں گا کسی سے بات نہ کروں گا۔ ہم سارے ہندوستان میں ڈھونڈھ کر یہاں آئے ہیں۔ تم کسی طرح منظور کرادو، میں نے کہا کہ وہ اصول کے خلاف نہیں کرتے۔ ناواقف سے نہیں لیتے۔ گھر میں آکر پوچھا کہ حضرت سے ان کی بابت خطرہ کو کہا تھا یا نہیں بتایا کہا تھا فرمایا:

”میرے دل میں کوئی کھٹک نہیں ہوئی، بلالو“

یہ تھا حضرت کے توکل کا عالم اسے کہتے ہیں اسلامی توکل۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ حرص و آز تو پاس بھی نہ تھی۔ اوّل تو اس وقت کا ایک لاکھ آج کے ایک کروڑ کے برابر ہے۔ پھر خود حضرتؒ کی نظر میں

ایک لاکھ اور بھی عظیم تھا۔ ایک بار فرمایا:

"اگر میرے پاس ایک لاکھ روپیہ ہو تو سارے تھانہ بھون کو خرید کر وقف کر دوں۔"

میں دل میں سوچتا تھا کہ اللہ اللہ حضرت کے نزدیک ایک لاکھ اتنی رقم ہے کہ سارا قصبہ لیا جا سکے گا۔ پھر یہ رقم جو وہ صاحبان لائے تھے حرام نہ تھی، گناہ نہ تھی، ہدیہ تھا وہ بھی اشرافِ نفس (دل کے انتظار) سے نہ تھا کہ خلاف سنت ہوتا، گو کافر کا تھا۔ مگر اصولِ حقہ جو مقرر کر رکھے تھے ان کے خلاف ہونے سے دین کے اصول پر زد نہ پہنچے، ذرہ برابر اس کا خیال نہیں آیا۔

زُہد (دنیا سے بے رغبتی)

زُہد کے بھی دو درجے ہیں ایک درجہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ حرام اور حرام کے مشابہ ناجائز و مکروہ تنزیہی سے بچے یہ درجۂ زہد تو عام ہے ایک درجہ خاص ہے کہ مکروہ کے شبہ سے بھی بچا جائے بلکہ ایک درجہ اخص الخواص کا بھی ہے کہ ضرورت سے زائد سامان و اسباب سے بھی بچا جائے۔ اول درجے پر تو حضرتؒ کے یہاں عمل کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ ہاں شبہ میں یہ ہو سکتا تھا کہ ہدیہ دینے والا حرام یا مشتبہ مال سے دیتا ہو تو جہاں شبہ بھی ہو گیا واپس کر دیا گیا یہاں تک کہ کسی نے دعا کے لیے لکھا اور ہدیہ بھیج دیا تو ہدیہ واپس کر دیا۔ دعا کا وعدہ فرما لیا۔ ڈاک خانہ والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ہم نے کہیں اس قدر منی آرڈر واپس ہوتے نہیں دیکھے۔ حضرتؒ کی تقریباً ایک ہزار تالیفات ہیں لیکن کسی کے

ذریعہ ایک پیسہ تک کے روادار نہ ہوئے۔ حضرتؒ کے والد ماجدؒ ٹھیکیداری کرتے تھے۔ اس میں یہ دُور کا شبہ تھا کہ شاید شرائط میں کوتاہی ہو گئی ہو، جیسے عام ٹھیکیدار کر لیتے تھے۔ اس لیے صحرائی، سکنائی جائیداد اور نقد رقم میں سے میراث کا کوئی پیسہ نہیں لیا۔ گو بعض دفعہ تنگی اور فقر و فاقہ تک بھی نوبت پہنچی تھی، ایک دفعہ گنگوہ تشریف فرما تھے۔ کسی خیر خواہ نے حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ یہ اپنے باپ کی میراث بھی نہیں لیتے۔ آپ اُن کو سمجھا دیجئے تو فرمایا:

"ایک شخص تقویٰ پر عمل کرتا ہے تو کیا میں اس کو منع کر دوں کہ اس پر عمل نہ کرو۔"

بعد وفات ایک کاپی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ:

"تمام عمر جو آمدنی ہوئی اس کے چار حصے کیے، چوتھائی خیرات کا، چوتھائی ایک بیوی کو، چوتھائی دوسری کو، چوتھائی اپنا حصہ۔ مگر اپنا حصہ اکثر ضرورت مندوں کو ہی دیا جاتا تھا۔ اپنا خرچہ ہی بے انتہاء مختصر سا تھا۔"

○ ایک دفعہ آخری بیماری کے سفر میں ایک عالم کی بیوہ کا خط ضرورت کا ملا۔ دل کڑھا فرمایا:

"کچھ ہوتا تو بھیج دینا۔"

شام کو ایک قدیم خادم آئے اور دو سو روپیہ پیش کیے شرائط کے موافق ہدیہ تھا لے لیا ان کے جاتے ہی فرمایا:

"منی آرڈر فارم لاؤ اور دو سو۲ روپیہ کا منی آڈر ان بیوہ کو بھیجدیا"

گویا ایک منٹ بھی ضرورت سے زائد پاس نہ رکھا۔ ایسے ہی اور بھی ہوتا ہوگا۔ سامنے کا یہ قصہ دیکھا ہوا ہے۔

تقویٰ:

گناہوں سے بچنا اور خدا کا خوف رکھنا تقویٰ ہے۔ جس کا اصطلاحی مفہوم کبیرہ گناہ نہ کرنا اور صغیرہ پر اصرار نہ کرنا یا فوراً توبہ کرلینا یہ وہ درجہ ہے جو سب مسلمانوں پر فرض ہے اور شبہات تک سے بچنا اعلیٰ درجہ ہے۔ حضرتؒ کے یہاں اس کا ہر وقت مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔ ہندوؤں کے یہاں سے زیور لیا جاتا تو بیع صرف (سونے چاندی کی خرید و فروخت) کے مسائل کے موافق کردیا جاتا جس سے وہ حیران ہوتے تھے۔ کیونکہ اس وقت روپیہ غالب چاندی کا تھا اس سے چاندی خریدنے میں دست بدست اور برابری ضروری تھی مگر چاندی کا نرخ چھ آنہ، آٹھ آنہ تولہ تھا اس لیے بغیر فقہی تدبیر کے نہ ہوسکتا تھا۔ ایسے ہی نوٹ مال نہیں رسید ہے۔ اس سے خریدنا دست بدست نہ ہوتا تھا یہ ادھار بن جاتا تھا جو بیع صرف میں سود کی طرح حرام ہوتا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے فقہی تدبیر کی ضرورت تھی اور غیر مسلموں سے معاملہ تھا۔ مگر اس کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ گو اب روپیہ چاندی کا نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ضرورت نہیں رہی۔

ایک سفر میں سہارنپور اسٹیشن سے ایک صاحب نے وہاں کے گنتے

جو اپنی عمدگی میں بہت مشہور تھے پیش کیے۔ قبول فرما لیے، ایک ساتھی سے کہا کہ:

"ان کو وزن کرا کے محصول ادا کر دو"

اتنے میں ٹی ٹی آ گیا۔ اس نے عرض کیا ایسے ہی رکھ لیں، لکھنؤ تک میں چل رہا ہوں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ فرمایا:

"آگے کیا ہو گا"

عرض کیا کہ کانپور تک دوسرا ٹی ٹی ہو گا۔ اس سے کہہ دوں گا۔ فرمایا:

"آگے کیا ہو گا"

عرض کیا سفر آپ کا کانپور تک کا ختم ہو گیا، فرمایا:

"نہیں میرا سفر آخرت تک ہے"

اس لیے جاؤ تلواؤ اور محصول ادا کر کے لاؤ"

اسٹیشن پر لوگ دیکھ رہے تھے کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ملازم گندم لے کر چکی پر گیا۔ اور جلد ہی آٹا لے کر آ گیا فرمایا۔

"یہ کیسے جلد ہو گیا"

عرض کیا اس نے گندم رکھ لیے اور آٹا دے دیا فرمایا:

"واپس کر کے آؤ وہ آٹا دوسرے کا ہے اس کا نہیں اسے حق نہیں"

خود میں نے ایک بار ایک شخص سے سوختہ لیا اور کہا پانچ روپیہ کا پچیس من تم دے دو میں فلاں درخت کٹوا رہا ہوں تم کو پانچ روپیہ کا پچاس من گیا سوختہ

دے دوں گا یا نقد پانچ روپیہ جو تم چاہو گے۔ کسی نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ اس نے پچیس من خشک سوختہ پچاس من تر سوختہ کے عوض ادھار لیا ہے۔ یعنی دو رہا ہو گئے ہم جنس میں دوگنا ہے اور اُدھار ہے۔ میں حاضر ہوا تو فرمایا تم نے سوختہ کس طرح لیا ہے۔ اس اطلاع دینے والی کی بات پر وثوق نہیں فرمایا مجھ سے دریافت فرمایا۔ میں نے صورتِ مذکورہ عرض کر دی۔ فرمایا:

"ہاں یہ تو جائز ہے مجھے کسی نے غلط خبر دی تھی کہ پانچ من کا دس دینا کر کے لیا ہے"

○ ایک ہندو بزاز کے یہاں سے کپڑا منگایا اس نے بل ساتھ بھیجا، خود حساب لگایا تو چند پیسے کم کا تھا۔ حضرتؒ نے وہ رقم اور زائد پیسے بھیج دیئے اس نے پیسے سے انکار کر دیا کہ میرا حساب ٹھیک ہے۔ پھر حساب جانچا تو غلط تھا۔ پھر بھیجا، اس نے پھر لینے سے انکار کر دیا۔ حضرتؒ نے اس کے بعد پھر بھیجے اور یہ کہلا بھیجا کہ میرے حساب میں یہ پیسے زائد ہوتے ہیں میں واپس نہیں لوں گا تم لے لو۔ نہیں رکھتے ہو تو کسی غریب کو دے دو اور لے جانے والے سے فرما دیا کہ:

" واپس مت لانا"

○ سفر میں ایک اسٹیشن پر گاڑی بدلنے کے لیے ٹھہرنا پڑا کئی آدمی ساتھ تھے سردی تھی۔ گودام خالی تھا اس میں ہوا سے بچاؤ ہو سکتا تھا، اسٹیشن ماسٹر سے اجازت لے کر اس میں قیام کیا۔ اسٹیشن ماسٹر لالٹین جلا کر لایا اور رکھ دی۔

فرمایا:

"یہ لے جائیے، یہ ریلوے کی لالٹین ہے، ریلوے کا تیل ہے ہم مسافروں کے لیے نہیں۔"

اور واپس کر دی اندھیرے گذارہ کیا۔

○ مسجد میں حضرتؒ کے وضو کے لیے کسی صاحب نے لوٹے میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ مسواک اس پر لے جا کر رکھ دی۔ حضرتؒ ذرا دیر میں تشریف لائے تو لوٹا، مسواک دیکھی فرمایا:

"یہ کس نے رکھا ہے؟"

وہ صاحب حاضر ہوئے عرض کیا:

"میں نے۔"

فرمایا:

"مسجد کا لوٹا سب کے لیے وقف مشترک ہے۔ دیر تک روک کر رکھ دینا کہ دوسرا استعمال نہ کر سکے درست نہیں۔ جب خدمت کا سلیقہ نہیں تو خدمت کے لیے کہا کس نے ہے۔"

○ کتابوں پر تقریظیں لکھنے کا عام معمول ہے۔ بلکہ لوگوں نے جہاں اور الفاظ کے مفہوموں میں تحریف کی ہے۔ اسی طرح لفظ تقریظ کا معنیٰ بھی بدل کر رکھ دیا ہے کہ تقریظ کے معنیٰ تعریف کرنے کے کر لیے ہیں۔ حالانکہ تقریظ درست کرنے کے معنیٰ میں ہے قرظ (بیری کے پتوں سے کھال کو درست کرنا) سے ماخوذ ہے۔ ایسے ہی لفظ تنقید میں تحریف کر کے اس کے معنیٰ عیب جوئی

کے کر رکھے ہیں ۔ حالانکہ اس کے معنی پرکھنے کے ہیں ۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ :

"تقریظ اس معنی میں بھی تو ایک شہادت ہے کہ مذکورہ کتاب شروع سے آخر تک درست و صحیح ہے ۔ اگر ساری کتاب نہ دیکھ پائے اور تقریظ لکھ دے ، یا خود اس کتاب کی پرکھ کے قابل نہ ہو اور تقریظ لکھ دے تو اس کی تقریظ جو درحقیقت شہادت ہے جھوٹی ہوگی ۔"

اس لیے حضرتؒ سے جب کوئی تقریظ کے لیے کہتا تو فرماتے کہ :

"آپ صفحات متعین کر دیں تو میں ان کو دیکھ کر صرف ان کے متعلق لکھ دوں گا ۔"

یہ مسئلہ وہیں معلوم ہوا ورنہ کسی کی نظر ہی اس طرف نہیں جاتی تھی ۔ جیسے ووٹ ایک شہادت ہے اور لاعلمی سے جھوٹی شہادت بن جاتی ہے ۔ غرض روز ، روز معمولی سے معمولی ، بڑی سے بڑی ، ہر بات پر کڑی نظر رہتی ۔ اور جہاں ذرا سا تقویٰ کے خلاف ہوا رد فرما دیا ۔

○ تمام عمر کبھی ڈاکٹری علاج نہ کیا ۔ ایلو پیتھک ہو یا ہومیو پیتھک کیونکہ سیال دواؤں میں الکحل شامل ہوتی ہے ۔ اور خشک دوائیں انہیں سیال ادویات کی مدد سے بنتی ہیں ۔ الکحل شراب کی ایک قسم ہے ۔ ٹنچر کبھی استعمال نہ کیا ، اور کیا تو فوراً پاک کرا دیا ۔ کیونکہ الکحل انگور یا کھجور سے نہیں بنائی جاتی جو سب کے نزدیک بالاتفاق ایک ایک قطرہ تک حرام اور ناپاک ہے اور دوسری شرابوں

میں اختلاف ہے کہ قدرِ نشہ سے کم استعمال درست ہے یا نہیں، حنفیہ کے یہاں درست نہیں۔ بعض ائمہ کے نزدیک درست ہے صرف قدرِ نشہ حرام ہے۔ جیسے جامدات نشہ آور کا حکم ہے۔ دواؤں کی ضرورتیں عام ابتلاء کی ہورہی ہیں اس لیے فتویٰ تو دوسروں کے مذہب کی گنجائش لے کر جواز کا ہے مگر تقویٰ یہ ہے کہ نہ ایلوپیتھک علاج ہو نہ ہومیوپیتھک، چنانچہ تقویٰ پر عمل کرتے ہوئے حضرت نے کبھی نہیں کیا۔ البتہ وفات سے چند روز پہلے اعزہ کو اجازت دے دی تھی کہ ان کو حسرت نہ رہ جائے، ان کے حقوق کی ادائیگی میں فتویٰ پر عمل فرمادیا تھا۔

ادائے حقوق:

حقوق العباد کا بے انتہا اہتمام تھا۔ اپنے لیے بھی، زیرِ تربیت و اصلاح کے لیے بھی، کہ حقوق اللہ کی کوتاہی میں توبۂ صحیحہ سے اور بلا توبہ بھی معافی کی اُمید ہے مگر کوئی بندہ اپنا حق اور پھر نفسا نفسی کے وقت معاف کردے، مشکل کام ہے۔ اپنی بیویوں کے تو مہر خود ہی ادا کر دیئے تھے۔ اپنے والد صاحبؒ مرحوم جنہوں نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں اور یہ معلوم نہ ہوا کہ مہر سب کے دیئے یا نہیں دیئے، تو حضرتؒ نے ہر والدہ کے تمام وارثوں کی تحقیق کرائی۔ مہروں کی مقدار کی تحقیق کی اور فرائض کے موافق خود رقم دے کر حصے نکلوائے (مسئلہ بتانا تو واجب ہے اگر کوئی دوسرا نہ ہو مگر لکھ کر دینا واجب نہیں۔ اس لیے لکھوانے کی اُجرت لینا، دینا درست ہے) اور سب وارثوں کو خواہ کتنا دور کے

بھی ان کے حصے کے نکلے بذریعہ منی آرڈر بھیجے یہ بھی نہیں کیا کہ سب وارثوں سے معافی کی درخواست ہو کہ اس میں یہ شبہ رہتا ہے کہ اہل حق دوسرے کے لحاظ واثر سے معاف کردیں گے تعلیم و تربیت میں تہذیب اخلاق اور حقوق العباد پر بہت زور دیا جاتا تھا، تاکہ مسلمان اذیت رسانی سے جو کہ گناہ ہے باز رہ سکیں۔

معمولات یومیہ:

صبح صادق سے تقریباً گھنٹہ بھر پہلے بغیر کسی الارم، ٹائم پیس وغیرہ خود بیدار ہوتے گو نیند کی کمی کی اور نیند نہ آنے کی شکایت عام ہونے پر سونے میں دیر لگ جائے۔ مگر برابر وقت پر بیداری تہجد اور ذکر و مراقبہ، اذان کے بعد سنتیں پڑھ کر مسجد جانا، اگرچہ بعض مرتبہ بارش کی وجہ سے پانی پورے راستہ میں ٹخنوں سے یا اس سے بھی زیادہ اونچا ہوتا تھا۔ اگر اذان سے پہلے پہنچ گئے تو مسجد کا دروازہ نہ کھلواتے۔ برابر کی چوکی پر بیٹھے کام میں مشغول رہتے۔ کھلنے پر اندر جاتے اپنی سہ دری میں اسی کام میں مصروف رہتے۔ نماز کے لئے مسجد میں اور نماز کے بعد چھڑی اور حمائل لے کر مشی (سیر) اور تلاوت کے لئے روانہ ہو جاتے۔ واپسی پر اشراق اور مناجات مقبول کی منزل سے فراغت پر دونوں گھروں میں تشریف لے جاتے۔ گھڑی جیبی ڈبہ میں ہاتھ میں ہوتی جتنی دیر ایک گھر قیام ہوتا اتنی ہی دیر دوسرے گھر قیام ہوتا تھا۔ جس روز جہاں کھانا ناشتہ ہوتا وہاں دو انڈے کا ناشتہ ہوتا۔

اور پھر خانقاہ واپس تشریف لے آتے۔ راہ میں کسی کی عیادت وغیرہ یا صلہ رحمی سے جانا ہوتا ہو آتے۔ خانقاہ پہنچ کر اگر کوئی تحقیقی استفسار ہوا تو اس کی تحقیق ورنہ تصنیف وتالیف وغیرہ کا کام، اور اس کے بعد بعض خاص مہمانوں کے لیے مجلس کا وقت دیا جاتا۔ دوپہر کے قریب جس گھر کھانا ہوتا وہاں کھانا کھا کر پھر دوسرے گھر تشریف لے جاتے۔ اس درمیان میں ڈاک جہاں مل جاتی فوراً بالائی لفافہ چاک کر کے اندرونی جواب کے لفافہ میں پلٹ دیتے اور سرسری نظر خطوں پر ڈال لیتے تھے۔ بعض خط ایسے اہم ہوتے کہ فوراً توجہ نہ فرمائی جاتی تو اس کی جان کا اندیشہ ہوتا اس کو جواب میں مقدّم کر کے باقی ڈاک ہمراہ لے کر خانقاہ تشریف لے آتے۔ دوپہر کا قیلولہ وہیں ہوتا۔ کوئی اہم مشورہ یا اہم ملاقات ہوتی تو اس وقت بھی ہو جاتی تھی، ورنہ ظہر کی اذان پر استنجا، پیشاب، وضو، سنّت سے فراغت کے بعد مسجد میں اور نماز کے بعد کی سنّت ونفل کے بعد سہ دری میں مجلس کے لیے تشریف فرما ہوتے۔ اور عصر کی اذان تک مجلس جیسے پہلے عرض ہو چکا ہے۔ سب کاموں کا مجموعہ ہوتی۔ عصر کے بعد کوئی خصوصی مہمان ہوا یا خصوصی مشورہ یا کام تو اس میں، ورنہ دونوں گھر برابر برابر وقت کے لیے تشریف لے جاتے اور مغرب خانقاہ میں ہوتی۔ مغرب بعد دیر تک نمازوں میں مشغولی، پھر کھانا کھانے کے لیے جس گھر کا نمبر ہوا وہاں پھر اسی قدر دوسرے گھر، پھر خانقاہ۔ اس درمیان میں خصوصی، اصلاحی وعلمی باتیں بھی رہتیں۔ عشاء کی نماز کے بعد اگر کوئی اہم مشورہ یا مہمان نہ ہوا تو گھر تشریف لے جاتے۔ اور ایک بار فرمایا کہ:۔

"عشاء کے بعد کوئی بات کرتا ہے تو ایسا ناگوار ہوتا ہے کہ

گولی مار دوں"

عشاء بعد غیر ضروری باتیں مکروہ ہیں اور صبح اُٹھنے میں مانع ہوتی ہیں۔ اس وقت کے لطف میں رخنہ پڑنے پر ناگواری اسی نعمت میں خلل کی وجہ سے ہے جس کو حضرت پیرانِ پیر یوں فرماتے ہیں ؎

نزا نگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب

من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم!

اس راز و نیاز کی خلوت سے محرومی کے کام پر جتنی بھی ناگواری ہو بعید نہیں۔ مگر اس کا ادراک تجربہ کار کو ہی ہو سکتا ہے۔

ان معمولات ظاہرہ کے علاوہ ہر وقت باطنی مراقبہ رہتا تھا جس میں عجیب مضامین و نکات وارد ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح کوئی منٹ عبادات و ادائے حقوق سے غیر رمضان میں بھی خالی نہیں رہتا۔ یہ ہے الاستقامۃ فوق الکرامۃ۔ (استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے)

رمضان:

طاقت و قوت کے زمانہ تک ہر رمضان میں خود قرآن شریف سنایا کرتے تھے۔ اور کم از کم ایک سامع ضرور ہوتا، چونکہ سامع کو بھی اُجرت لینا جائز نہیں اس لیے کوئی اُجرت نہیں دی جاتی تھی۔ ختم قرآن پر کسی چیز کے تقسیم کرنے کا التزام و دوام تو نہ تھا البتہ کبھی جی چاہا تو کوئی چیز

ختم قرآن کے موقع پر تقسیم کردی اور وہ بھی چندہ سے نہیں، جو کچھ ہوتا خود اپنے پیسوں سے کرتے۔ اسی طرح تقسیم کے لیے شیرینی کی ہی تخصیص نہ تھی۔ ایک دفعہ تو کباب بنوا کر تقسیم فرمائے۔ رمضان میں بعض اکابر حضرات کے خاص خاص معمولات سننے میں آتے ہیں۔ مگر حضرتؒ کے یہاں معمولات میں رمضان ہی کی تخصیص نہ تھی۔ وہاں تو روزمرّہ کے معمولات ہی دن بھر کے تمام اوقات کو محیط تھے۔ کوئی منٹ عبادت ذاتی و متعدی سے خالی نہیں جاتا تھا صبح اُٹھنے سے لے کر مثنوی کے ختم تک تو ذاتی عبادت ذکر، تلاوت، اشراق ایک منزل یومیہ از مناجات مقبول کے بعد ادائے حقوق اور مہمانوں کے ساتھ خصوصی مجلسیں یا تالیف و اثناء پھر دوپہر کے کھانے کے بعد ڈاک پر سرسری نظر درمیان میں انفرادی تربیت، روک ٹوک، خانقاہ پہنچ کر قیلولہ، ظہر سے عصر تک مجلس عام، عصر کے بعد کوئی خاص تحقیق، خاص مشورہ، یہ نہ ہوا تو ادائے حقوق کے لیے گھر بعد مغرب نوافل اور وظائف سے فارغ ہونے پر کسی سے خصوصیت سے ہر بات میں تلقین، نصیحت اور خیر خواہی پھر کھانے کے لیے مکان کو روانگی، (اور اس روانگی میں بھی کسی کو ہمراہ ہونے کی اجازت نہ تھی۔) اس دوران میں بھی بعض بعض وارد ایسے عجیب و غریب ہوتے جو ملفوظات میں اس حوالہ سے بیان ہوتے کہ فلاں جگہ فلاں مسئلہ سمجھ میں آیا یہ آنا جانا بھی باطنی مشغلہ سے خالی نہ ہوتا تھا، غرض ہر منٹ ہر سیکنڈ ذاتی یا متعدی عبادات میں مصروف، رمضان بھی یہی معمولات کہ جن میں ایک منٹ کی کمی بیشی کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ ویسے توجہ باطن میں اور

خصوصی عبادات میں کیا کیا ہوگا، کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ بعض بزرگوں کا یہ حال سُنا کہ وہ رمضان میں نہ خط لکھتے ہیں نہ کسی سے بات کرتے ہیں تو فرماتے کہ:

"نہ معلوم کیوں ایسا کرتے ہیں یہ خطوط جو مسائل کے ہیں یا اصلاح کے ہیں یہ بھی بڑی عبادت ہیں۔ جو اہل حاجت ملتے ہیں، ان کی دینی و دنیوی حاجات کی مدد بھی تو عبادت ہے۔ رمضان میں جیسے ذاتی ہر عبادت کا اجر بڑھتا ہے ان کا بھی تو بڑھتا ہے اس ماہ مبارک میں بھی تو امر بالمعروف نہی عن المنکر بڑے اعمال میں سے ہے۔"

بعض بزرگوں کے رمضان کے بڑے معمولات کا ذکر فرماتے تو فرماتے:

"اس سے دوسرے بزرگوں کو کم مرتبہ نہ سمجھا جائے، بعض بزرگ ہر وقت باطنی ترقی میں لگے رہتے ہیں، ان کا مرتبہ بہت اُونچا ہوتا ہے مگر اس کی اطلاع دوسروں کو نہیں ہو سکتی، اس لیے ہرگز ایسی صورت نہ ہو کہ ظاہری اعمال کو دیکھ کر فضیلت کو قیاس کر لیا جائے۔"

تربیّتِ سالکین:

تصوّف کا مقصد عقائد و اعمال کی درستی کے بعد تمام باطنی امراض بُری عادات کی جڑیں اکھاڑنا عمدہ عادات کا راسخ ملکہ پیدا کرنا ہے اور ہر وقت

خدا تعالیٰ کے حضور میں حضوری اور شدید ترین یہ تصور کہ وہ سامنے ہیں۔ یہ تصور نہ ہو پائے تو یہ کہ ہم سامنے ہی وہ دیکھ رہے ہیں جیسے حدیث میں احسان (عمدہ عبادت) کی تعریف کہ؛

"ایسے عبادت ہو کہ تم ان کو دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو تو یہ کہ وہ دیکھ رہے ہیں۔"

بلکہ ہر وقت یہی کیفیت رہے اس کے چار طریقے عموماً ہوتے ہیں۔ چشتی۔ قادری۔ نقشبندی۔ سہروردی۔ مگر ان میں مقصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ سب میں شریعت کے مطابق عقائد و اعمال کے بعد ان میں خلوص و دل جمعی اور باطنی کام کے طریقے الگ الگ ہیں۔ کسی طریقہ میں اوّلاً بُری عادتوں کا چھڑانا ہے۔ کسی میں عمدہ عادات پیدا کرانا ہے۔ کسی میں اوّل ہی سے ذکر و شغل کرانا ہے کہ پھر عادات کا کام ہو مقصد سب کے ایک ہیں کہ دین تو صرف اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا ہے شریعت یہی ہے اس پر عمل کرنے اور دل کی گہرائیوں سے عمل کے طریقوں کا نام طریقت ہے انہیں سے کوئی بات مقدم کوئی موخر، سو اس سے اصل مقصد میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے سب الگ الگ ہو کر بھی مقصد کی وجہ سے ایک ہی ہیں۔ پہلے زمانوں میں مشاغل کم قویٰ مضبوط اور عمریں کافی ہوتی تھیں یہ صورتیں ہو سکتی تھیں۔ اب بزرگوں نے چاروں طریقوں کو، عمر کم، مشاغل زائد اور قویٰ کی کمزوری کی وجہ سے جمع کر دیا ہے۔ اب ذکر، اذکار اور اصلاح و تربیت ساتھ ساتھ کر دیئے۔

اور اس کی ضرورت بعد کے زمانوں میں اس لیے ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سیکنڈ کی صحبت سے جو دل کی دنیا میں کایا پلٹ ہوتی اور وہ صورت خلوص کامل کی پیدا ہو جاتی ہے کہ:

"صحابی کا ایک مُدّ (نصف سیر) خرچ کرنا دوسرے کے اُحد پہاڑ کے برابر خرچ سے زیادہ ثواب پاتا تھا"

ایک نگاہِ قدسی میں وہ کامل ہدایت یافتہ بلکہ مقتدائے عالم بن جاتا تھا جیسے کہ حدیثوں میں یہ سب موجود ہے۔ جوں جوں زمانہ دور ہوتا جاتا ہے وہ اثرات کم ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی قدرے تلافی کے لیے بزرگوں نے آیات و احادیث سے ہی سمجھ کر (جن کی تفصیل حضرت اقدس کی کتاب "التشرف باحادیث التصوّف" سے معلوم ہوگی) یہ طریقے دل کو کندن بنانے کے اختیار کئے ہیں۔ اور حقیقی مشائخ میں صدیوں سے یہ معمول ہیں۔

لیکن باقاعدہ منظم شکل سے صرف حضرت تھانویؒ نے ہی تعلیم و تلقین عام دل نشین، سہل اور مختصر زمانہ کی مختصر وقت میں کی تجویز فرمائی ہے کہ:

"اوّل ذکر کی خاص خاص صورت کی ہدایت کی پھر بد خصلتوں میں سے ایک ایک کا پیش کرنا علاج معلوم کر کے اس پر عمل کرنا اور ہر حال کی اطلاع و اصلاح کرانا، جب وہ خوب کمزور ہو جائے دوسری، تیسری، چوتھی سلسلہ وار اصلاح کے لیے پیش کرتے رہنا اور ساتھ ساتھ ہی نیک خصلتوں کا نہ ہونا ظاہر کر کے ان کی تدابیر معلوم کر کے عمل کرنا ہے یہ "تربیت السالک" کے نام سے

یہ مجموعہ ڈیڑھ ہزار صفحات کا ملتا ہے۔ وہاں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے کیسے مشکل کام کی گرہیں کیسے کیسے سہل طریقوں سے کھولی جاتی ہیں۔ اور آوارہ سے آوارہ کس طرح تمام کام اور مشغولیاں رکھتے ہوئے بھی نہایت آسانی سے معراج ولایت حاصل کر لیتا ہے۔"

جن حضرات نے یہ کام کیا ہے وہ تو اپنے دل کے حالات کو جانتے ہی ہیں۔ جنہوں نے اب تک نہیں کیا وہ کم سے کم اس کتاب سے اوروں کا کام اور حال دیکھ سکتے ہیں۔ اور مشکلات کے لیے "التکشف عن مہمات التصوّف" کو۔

تاثیر:

دل جس قدر حب الٰہی، حضوری اور ان کے انعامات سے سرشار ہو گا، اسی قدر اس کی باتوں، وعظوں، تحریروں میں دلوں پر وہ تاثیرات ہوں گی جو دلوں کو خدا تعالیٰ کی طرف کھینچ ڈالتی ہیں۔ حضرت پیر پیران شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے صاحبزادہ علوم حاصل کر کے آئے لوگوں نے وعظ کی درخواست کی، حضرت نے اجازت دے دی، وعظ ہوا بڑے بڑے نکتے، بڑے اسرار، نہایت علمی وعظ تھا۔ سب بہت خوش ہوئے مگر کسی کی آنکھ تر نہ ہوئی تو حضرتؒ منبر پر تشریف لے گئے فرمایا:

"رات روزہ رکھنے کا ارادہ تھا، سحری کو اور کچھ نہ تھا ذرا سا۔

دودھ رکھا تھا۔ رات کو بلّی نے اس پر حملہ کیا کچھ پیا کچھ گرا دیا تو آج
بغیر سحری کے ہی روزہ رکھا ہے یہ فرمایا اور منبر سے نیچے تشریف
لے آئے۔ لیکن مجمع کا یہ حال تھا کہ ہر شخص تڑپ رہا تھا صاحبزادؒ
سے فرمایا "یہ بات پیدا کرو۔"

دل گوشت کے لوتھڑے ہی کا نام نہیں اس میں کچھ نورانیت ہے
جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیمیا دی نظر سے چمک اُٹھتا تھا۔ اب ذکر و شغل
سے وہ نہ سہی کافی چمک اور پھر تاثیر عجیب ہوتی ہے۔ آخر حضرات صحابہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایک ایک، دو دو لفظ کہتے تھے اور سننے والے مسلمان ہو
جاتے تھے۔ آج ہم گھنٹوں تقریر کریں تو کسی کی آنکھ نہیں پسیجتی۔ یہی بات تو
تھی کہ وہاں دل میں عشقِ الٰہی کی آگ تھی یہاں راکھ بھی نہیں۔ یہ آگ بزرگوں کی
صحبت اور تعلیم و تلقین سے ہی سُلگ جاتی ہے۔

زیرِ تربیّت و اصلاح کا روز کا تجربہ ہے کہ حضرت کے ایک ایک
لفظ نے دل میں کتنا گہرا مقام حاصل کر لیا ہے ویسے بھی معمولی خط و کتابت تک
میں یہ اثرات تھے۔ ایک صاحب نے لکھا کہ:

"میری بیوی جاہل ہے قرآن شریف بھی نہیں پڑھا۔ بہت کہتا
ہوں تو کہتی ہے بوڑھے طوطے بھی کہیں پڑھتے ہیں۔"

اس کے جواب میں لکھا:

"وہ تو مینا ہیں۔"

پھر خط آیا کہ سُنتے ہی پڑھنے لگی۔ ہر شخص کا بار رہا کا تجربہ ہے کہ

"جب کوئی قلبی مرض، گھٹن یا پریشانی پیش آئی سینکڑوں میں دور سے خط لکھا جو وقت خط کے دستِ اقدس میں پہنچنے کا تھا اسی وقت سے یہاں بالکل سکون ہو گیا۔ جواب کئی دن بعد پہنچے گا سکون فوراً پہنچ گیا۔ صدہا بلکہ ہزاروں ایسے واقعات ہیں سب کے تجربہ میں ہیں"

تاثیرِ تبلیغ:

ہندوستان میں ہندوؤں نے شدھی سنگھٹن کی تحریک شروع کی اور مسلمانوں کو مرتد بنانا شروع کر دیا۔ یہ واقعہ آگرہ اور متھرا کے قریب تھا۔ جگہ جگہ سے علماء گئے، تھانہ بھون سے بھی مولانا عبدالکریم صاحب مفتی خانقاہ اور مولانا عبدالمجید صاحب کو بھیجا گیا۔ پھر حضرت خود تشریف لے گئے اور پانچ گھنٹہ وعظ ہوا (جو آج بھی "محاسنِ اسلام" نام سے طبع شدہ دستیاب ہے)۔ اور کایا پلٹ ہو گئی۔ بعض بے علم بڈھے تو یہ کہنے لگے اگر اس بڈھے کا دین سچا نہ ہوتا تو یہ پانچ گھنٹہ نہ بول سکتا۔

شروع شروع جوانی کا عالم کانپور کا قیام وہاں نماز کی فضیلت اور ضرورت پر کئی وعظ ہوئے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ:

"تانگے والے بھی سواریوں سے پوچھ پوچھ کر نمازیں یاد کرنے لگے تھے"

سینکڑوں مواعظ ہزاروں مجلسوں کے ملفوظات دلوں کو کندن بناتے

تھے۔ آج بھی مطبوعہ میں بڑی تاثیر ہے۔ وعظ میں مثنوی شریف کے اشعار اکثر ہوتے تھے اگر چار پانچ شعر بھی ایک ساتھ پڑھ دیتے تو مجمع کا مجمع آبدیدہ ہو ہو جاتا تھا خواہ فارسی نہ جانتا ہو۔ اور وعظوں میں جو چند تقریباً ۴۷۵ طبع شدہ ہیں۔ اور روزمرہ کی گفتگو جو ملفوظات کے عنوان سے طبع شدہ ہیں جس کا جی چاہے پڑھ کر دیکھ لے۔ مگر ایک کثیر تعداد میں پڑھے پھر دیکھے کہ اس کے دل نے کس قدر کروٹ لے لی ہے۔ یہ ہر شخص آج بھی اور تاقیامت تجربہ کر سکتا ہے۔ یا گھر میں یا مسجدوں یا محفلوں میں سنوا کر پڑھے اور پھر اس کی تاثیر آنکھوں سے دیکھ لیں۔ لوگ معاشرہ کی شکایت تو کرتے ہیں مگر یہ کیمیاوی نسخہ استعمال کرنے کا انتظام ہر مسجد و محفل میں کریں تو نتیجہ آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

توجّہ:

یہ تاثیر تو معمولی توجّہ سے ہوتی ہے۔ اور ایک درجہ قوی ترین توجّہ کا ہوتا ہے۔ اور بعض بزرگوں کا معمول ہے مگر ہمارے بزرگوں میں معمولی نہیں۔ اور اس لیے نہیں کہ اس میں چند خرابیاں ہیں۔ توجّہ دینے والے کے لیے بھی توجّہ لینے والے کے لیے بھی اس لیے ہمارے بزرگوں کا معمول نہیں کوئی ضرورت ہوئی تو ہلکی سی ہو گئی اور یہ بہت ہلکی جسے اُوپر تاثیر سے تعبیر کیا ہے یہ تو ہمیشہ یا اکثر رہتی ہے بقول کسی کے ؎

بندۂ پیر خرا باتم کہ لطفش دائم است!

زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ است وگاہ نیست

وہ توجہ کامل پیر کے کامل متوجہ ہونے سے ہوتی ہے جس میں اس کی حضوری میں کمی یا فرق آگر اس کے لیے مضر ہوتی ہے اور مرید کو اس وقت تو دل میں لگن بلکہ آگ محسوس ہونے لگتی ہے مگر بعد میں کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اور اُلٹا اثر ہونے لگتا ہے۔ جیسے سردی کے زمانہ میں بھٹی کے سامنے پسینہ آجاتا ہے مگر الگ ہونے پر کم ہوتے ایسا ہو جاتا ہے کہ پہلے سے بھی زائد سردی لگنے لگتی ہے۔ اور اگر معجون قوی و گرم کھلائی جائے تو رفتہ رفتہ قوت و گرمی آئے گی۔ مگر وہ دائمی ہوگی ہر وقت رہے گی کبھی زائل نہ ہوگی۔ ہمارے بزرگوں کی تاثیرات اور تعلیمات یہ کام دیتی ہیں یہی طالب کے لیے زیادہ مفید ہے۔

حضرت گنگوہیؒ سے ایک دفعہ حضرت قاضی محمد اسماعیل خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب جو حضرت حاجی صاحبؒ کے پیر بھائی تھے کہنے لگے مولوی جی کبھی توجہ بھی دے دیا کرو، فرمایا مجھ سے نہیں ہوتا یہ جوگیوں کا سا کام۔ ادب سے خاموش ہو گئے۔ دوسروں سے شکوہ کیا۔ دارالعلوم دیوبند کا جلسہ ہوا اس میں حضرت گنگوہیؒ کا وعظ ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا تو ہزاروں کا مجمع تھا، تڑپنے لگا۔ آپ خاموش ہو گئے (ورنہ نامعلوم کتنوں کی جان نکل جاتی)، سکون کے بعد کچھ اور فرما کر وعظ ختم کیا۔ تو قاضی اسماعیل آئے، بولے ہاں، مولوی جی! کبھی کبھی یوں کر دیا کرو۔ فرمایا میں نے کیا کیا۔

تھانہ بھون میں رمضان کی ۲۹ تاریخ تھی خلفاء حضرات بھی اعتکاف میں جمع تھے۔ بات یہ ہوئی کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

"جس نے رمضان کو پایا اور اس کی مغفرت نہ ہوئی وہ خسارہ میں رہا۔"

آج انتیس ہے اگر چاند ہو گیا تو رمضان ختم ہو جائے گا۔ اب کیا کریں طے یہ ہوا کہ حضرتؒ سے درخواست کریں۔ مولانا ظفر احمدؒ بھی اعتکاف میں تھے ان کو انتخاب کیا گیا۔ ظہر بعد مجلس کے وقت یہ حدیث پڑھ کر عرض کیا کہ شاید آج رمضان ختم ہو جائے تو کیا کرنا چاہیئے فرمایا:

"جو وقت رہ گیا ہے غنیمت سمجھیں اور استغفار وغیرہ کریں۔"

عرض کیا کہ منجملہ اعمال کے دعا بھی ہے۔ حضرت دعا فرما دیں فرمایا:

"عصر کے بعد یاد دلانا۔"

عصر کی نماز پڑھائی تسبیحات کے بعد یہ حدیث پڑھی اور وقت کو غنیمت سمجھنے کی ہدایت کی اور فرمایا سب حضرات "اللّٰھم اغفرلنا وارحمنا" ستّر ستّر مرتبہ پڑھ لیں اور خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے پڑھنا شروع کیا۔ اندر کی صفیں تو تڑپنے لگیں۔ پانچویں باہر کی صف والوں کو لفظ تو سنائی نہیں دیتے صرف اتنا معلوم ہوا کہ کچھ فرمایا ہے۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ دو چار منٹ بعد فرمایا:

"الحمدللہ، امید سے زیادہ عطا ہو گیا ہے۔"

اور شکر کی تلقین فرمائی تو سکوت ہو گیا۔ کئی روز تک حاضر باش کہتے رہے کہ اب تک اس لطف و کیف کا اثر موجود ہے۔

خدمت لینا:

جاہ واثر کی وجہ سے خدمت لینا منظور نہ تھا۔ اس لیے ہر کام کے واسطے ملا نیاز اور سلیمان جو بڑے گھر اور چھوٹے گھر کے کاموں کے لیے ملازم تھے۔ آواز دیتے اور ان کو کام فرماتے تھے۔ دوسروں سے کبھی نہیں فرماتے تھے۔ خود کوئی درخواست کرتا اجازت لے لیتا اور وہ خدمت کا طریقہ بھی جانتا تو گاہ گاہ اجازت ہوتی تھی۔ یہ مسئلہ یہیں معلوم ہوا کہ جاہ کا عوض درست نہیں۔ اکثر خدمت سے منع فرما دیتے تھے۔ صبح کی مشی اور گھر جاتے آتے میں یا کسی کی عیادت یا عرض پر جانے میں کسی کو ہمراہ جانے کی اجازت نہ تھی۔ گو وہ کسی خدمت کے لیے ہی جانا چاہتا ہو۔

دعوت:

سفر میں یا وطن میں اگر کسی نے دعوت کی تو قبول کرنا مسنون ہے۔ قبول ہوتی مگر صرف اپنی ہی اگر وہ اوروں کو عرض کرتا تو فرماتے کہ:

"تم خود ان سے کہو وہ چاہے منظور کریں چاہے نہ کریں"

پھر وہ صاحب بھی اجازت لیتے تو ساتھ جا سکتے تھے۔ کسی شخص کے یہاں بھی کسی کو ساتھ خود سے نہیں لیتے تھے۔

پسند کی چیزوں کے سوال پر فرماتے:

"تم جو تیار کرانا چاہتے ہو ان کے نام لو ان میں سے پسند

کو بتادوں گا۔ اور اس پر اکثر ماش کی دال کو پسندیدہ فرماتے تھے"
اس معمول مبارک سے آنکھیں کھل گئیں کہ مجمع کا مجمع لے کر کسی کے یہاں جانے سے اس پر بارِ عظیم ہوتا ہے گو وہ ادب لحاظ میں کچھ نہ کہہ سکے مگر بعض دفعہ سخت پریشانی اور ہمت سے زیادہ خرچہ کا زیر بار ہوتا ہے۔ ایسے ہی فرمائش کرنے سے بعض دفعہ میزبان کو بہت تنگی اور پریشانی ہوتی ہے مگر ان صورتوں میں نہیں ہوگی۔

بعض دفعہ تو پریشانی اور زیر باری کی وجہ سے آئندہ کے لیے توبہ کر لیتا ہے اور مقروض ہو جانا الگ ہے۔

ملاقات کے لیے سفر:

قاعدہ تھا کہ آنے سے پہلے آنے کی اجازت لے لی جائے اور آتے ہی وہ خط دکھایا جائے۔ خط میں آنے کی غرض اور اپنی گنجائش بھی لکھی جائے بعض لوگ ایسے ہی آجاتے تھے۔ مگر جب پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرتؒ سفر میں ہیں تو ان کو تکلیف بھی ہوئی۔ خرچہ بھی ہوا، سب بیکار گیا۔ بڑا زرّیں اصول تھا۔

قاعدہ تھا کہ ملاقات کے وقت اپنا پورا تعارف کرادیں خط اجازت کا دکھلادیں۔ اور غرض بھی بتادیں تاکہ غرض حاصل نہ ہو تو رنج نہ ہو جائے اور حضرت کا برتاؤ بھی اس کے موافق ہو۔

بیعت کرنا:

بیعت دراصل ایک معاہدہ ہے۔ باطنی علاج کرانے اور کرنے کا، اس سے ذمہ داری طرفین پر عائد ہوتی ہے اور یہ بیعتِ توبہ کہلاتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں یہی بیعتِ توبہ بہت دفعہ ہوئی ہے۔ اور ایک کسی خاص کام مثلاً جہاد کے لیے بھی بیعت ہوتی ہے مگر بیعت جہاد کے لیے تو جہاد کی قدرت طرفین میں ہونا شرط ہے۔ اس کے بغیر اس کی کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی ورنہ محض نام ہی نام ہے۔ اور ایسے ہی شخص سے بیعت ہو سکتی ہے جو قدرت رکھتا ہو۔ بیعت توبہ میں یہ بات نہیں توبہ کی قدرت سب میں ہے۔ ہر مسلمان ایسے سے بیعت کر سکتا ہے جو اصلاحِ اعمال و اصلاحِ باطن کا ماہر ہو۔ پھر یہ معاہدہ جیسے دست بدست ہوتا ہے۔ خط سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ بھی معمول تھا، جیسے عورتوں سے مصافحہ ناجائز ہے تو صرف زبانی ہی بیعت ہوتی ہے۔ ایسے ہی دُور والوں سے بذریعہ خط ہوتی ہے۔ اس کی اصل بھی "التشرف" میں مذکور ہے۔ مگر جب تک وہ اصل مقصد بیعت کا نہ سمجھے ہوئے ہو بیعت نہیں فرماتے تھے۔

کچھ رسائل کا مطالعہ کراتے جن سے کام اور غرض معلوم ہو سکے۔ پھر سمجھ لینے کے بعد بیعت کرتے۔ لیکن اصلاح معاہدہ پر موقوف نہیں اس لیے بلا بیعت بھی اصلاح کو مقدم رکھتے تھے۔ اور سفر میں کم سے کم

بیعت فرماتے۔ فرماتے تھے کہ:

"سفر میں آدمی کے حالات پورے معلوم نہیں ہو سکتے اس لیے تھانہ بھون آؤ، رہو میں تم کو دیکھوں، پرکھوں، تم مجھ کو، پھر بیعت ہو سکتی ہے۔"

فرمایا کرتے تھے:

"کہ اس فن اصلاح و تربیت میں مناسبت شرط ہے۔ اگر مناسبت پہلے سے ہو یا کچھ دن رہنے سے ہو جائے تو مفید ہے۔ ورنہ بیکار۔"

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے بیعت ہونا چاہا تو عدم مناسبت سے انکار کر دیا۔ پھر یہ حضرات مولانا عبد القادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے۔

ایک بار کسی نے عرض کیا کہ حضرت بیعت فرما لیتے تو عوام کا بہت نفع ہوتا، فرمایا:

"کہ بیعت اس کو کیا جاتا ہے جسے آدمی یوں تو کہہ سکے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ورنہ بیکار ہے۔"

مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ اور مولانا عبد الباری ندویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو سفارشی لے کر بیعت کے لیے حاضر ہوئے، تو فرمایا:

"آپ ہی بیعت کر لیں مجھے مناسبت نہیں، آپ سے مناسبت ہے۔ یہ بھی خادمِ قوم۔ آپ بھی خادمِ قوم، میں نادمِ قوم ہوں۔"

حضرت مدنی رحمۃ اللہ نے عرض کیا حضرت میں اس قابل کہاں ۔ فرمایا :

"مجھ میں نہ تواضع ہے نہ تکبر، ان کی خدمت کے قابل آپ بھی ہیں، میں بھی ہوں، اور کامل نہ آپ نہ میں، مگر مناسبت آپ سے ہے"

پھر دیو بند جاکر یہ دونوں حضرت مدنیؒ سے بیعت ہوئے، لیکن مولانا عبدالباری ندویؒ نے اصلاح و تربیت کا تعلق حضرتؒ سے رکھا اور عرصہ بعد خلیفہ و مجاز قرار پائے، مولانا عبدالماجدؒ گو تھانہ بھون آتے اور رہتے تھے مگر علمی باتیں رہتی تھیں۔ ایک روز خود میرے سامنے فرمایا کہ :

"نہ معلوم یہاں کیوں آتے اور رہتے ہیں نہ کبھی کوئی حالت بیان کرتے ہیں نہ کچھ پوچھتے ہیں"

میں نے ان سے اس کو نقل نہیں کیا اپنے منصب کے خلاف سمجھا تھا۔

آخری بیماری میں علاج کے لیے لکھنؤ کا سفر کیا وہاں "تکمیل الطب" میں بڑے بڑے حکیم تھے اور حضرت ڈاکٹری علاج نہیں کیا کرتے تھے سہارنپور کے اسٹیشن پر مولانا ظہور الحسن مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں سفر کا ہمراہی تھا کہ یہاں ایک بزرگ نے کہا ہے کہ علاج کا تو بہانہ ہے حضرتؒ کسی اور کام کے لیے جارہے ہیں خیال رکھنا، مگر اثنار سفر میں کوئی بات مجھے معلوم نہ ہوئی صرف اتنا تو ہوا کہ علمائے ندوۃ العلمار و فرنگی محل و مولانا عبدالشکور صاحب مع لواحقین آئے تھے، ملے تھے۔

دوسری بار کے سفر میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندویؒ

تھانہ بھون پہنچے۔ کیونکہ حضرتؒ کے سفر کی اطلاع اخبارات وغیرہ میں نہ ہوتی تھی۔ معلوم ہوا کہ حضرت لکھنؤ ہیں تو وہاں حاضر ہوئے اور کچھ دن بعد بیعت کی درخواست کی۔ جواب ملا گیا کہ سفر میں ٹھیک نہیں میرا کوئی ٹھکانہ ہے وہاں یہ بات کی جائے تھانہ بھون کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد دونوں صاحب آئے۔ اور مولانا مسعود علی صاحب کا ایک ملازم بھی آیا۔ قیام کیا، ملازم نے بیعت کی درخواست کی فوراً قبول ہو گئی۔

مولانا مسعود علی صاحب کو رشک آیا کہ یہ بیعت ہو گیا اور میں اب تک لٹک رہا ہوں۔ مجھ سے ذکر کیا تو میں نے عرض کیا کہ:

"مدار دل کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ اس کا کوئی حال بتایئے کہنے لگے یہ میرا باغ کا ملازم ہے۔ پہلے سفر کے وقت اس کو اطلاع نہیں ہوئی۔ جب اسے لکھنؤ آنا اور اس کا نہ مل سکنا معلوم ہوا تو اس کو بے حد قلق ہوا تھا۔ اب میرا ارادہ معلوم کر کے پوچھا کہ میاں آپ کسی ملازم کو ہمراہ لیں گے میں نے کہا "ہاں" بولا مجھے لے چلیں تو مہربانی ہو۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ یہی تو خلوص اور سلامتی دل کی دلیل ہے۔ اس کا اندازہ ہو گیا، بیعت فرما لیا۔"

روز ایسے واقعات پیش آتے رہتے۔ جس کو انکار فرمایا تو عرصہ بعد معلوم ہوا اس کی نیت میں خلل تھا۔ پھر استعدادِ دین بھی الگ الگ ہوتی ہے میرے جاننے والوں میں دو صاحب ایسے بھی ہیں جو بیعت ہوئے، اور ایک ہفتہ بعد ہی ان کو خلافت عطا ہو گئی۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ادب :

کئی بار فرمایا :

" کہ مجھے جو کچھ حاصل ہوا بزرگوں کے ادب سے ہوا میں
سب بزرگوں کا ادب کرتا رہا "

ادب و احترام کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی ملازم کو تنخواہ ہاتھ سے ہاتھ میں نہیں دی کہ اُوپر نیچے کے ہاتھ کا فرق ہوتا تھا۔ سامنے رکھ دیتے تھے۔ وہ اٹھا لیتا تھا۔ جب چارپائی پر کھانا کھایا تو (سرہانے) کھانا رکھا خود پائنتی پر بیٹھے ریاست رامپور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جبّہ مبارک تھا۔ وہ کسی تقریب پر جلال آباد بھی آیا کرتا تھا اور وہاں سے تھانہ بھون بھی زیارت کرانے لایا جاتا تھا۔ حضرت گنگوہیؒ سے دریافت کرنے پر معلوم ہو گیا تھا کہ منکرات سے بچ کر زیارت نصیب ہو سکے تو ضرور کرنا۔ چنانچہ زیارت ہوتی اور بلانے والوں کو ہدایت کہ ۸ ۔ ۱۰ آدمیوں کی جس روز کسی کے یہاں دعوت نہ ہو ہمارے یہاں سے کھانا آیا کرے گا۔ تم اطلاع کرا دیا کرو۔ جس مسجد میں ان کا قیام اور جبّہ شریف بھی ہوتا تھا کبھی اس طرف کو پاؤں نہیں پھیلائے حالانکہ وہ گھر سے بہت فاصلے پر تھی۔ یہ عالم ان عالِم کا تھا۔ جنہیں بعض کم نصیب لوگ گستاخِ رسول کہتے ہیں۔ یہ ان میں سے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر

کی وہ مٹی جس سے جسدِ اطہر متصل ہے۔ اس کو عرشِ اعظم سے افضل جانتے ہیں۔ مگر بعض نگاہوں میں گستاخ ہیں۔

اصلاح و تربیت کے لیے گاہ گاہ ڈانٹ ڈپٹ بھی ہوتی تھی جو ان کے لیے کیمیاوی اثر رکھتی تھی۔ فرماتے تھے:

"ڈانٹ کے وقت بھی میرے ذہن میں یہ رہتا ہے کہ یہ مجھ سے بہت افضل ہے۔ مگر شریعت کی پابندی کے لیے شرعی ضرورت سے کرنا ہوتا ہے۔"

لوگ ناواقفی سے اس کو تیز مزاجی اور غصہ وری سمجھ جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود ایک انجکشن ہوتا تھا اور سینکڑوں عیب اس سے ترک کرائے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے لکھا کہ مجھے اسلام کے متعلق شبہات ہیں اور آپ سے ہی حل ہونے کی توقع ہے۔ اجازت ہو تو لکھوں۔ جواب دیا کہ زبانی معلوم کر لیے جائیں تو فوری کام ہو سکتا ہے یہاں آجایئے" وہ آگئے۔ تنہائی میں بٹھا کر فرمایا:

"ایک شبہ پیش کرو اور جب تک میں اس پر پوری بات نہ کر لوں خاموش سنتے رہنا۔ بات ختم ہونے پر جو کہنا ہو کہنا"

عرض کیا بہتر۔ بات شروع ہوئی مگر درمیان میں بولنے لگے فرمایا:

"دیکھیے میں نے پہلے عرض کیا تھا درمیان میں نہ بولیں"

وہ خاموش ہو گئے۔ پھر درمیان میں بولے پھر تنبیہ کی پھر خاموش

پھر تیسری بار بول پڑے تو فرمایا:

"جا دور ہو جا نکل جا یہاں سے، وہ کچھ ڑکے تو ایک دھپ لگایا اور نکال دیا۔"

واپس چلے گئے۔ تین چار روز بعد خط آیا کہ آپ کے ایسا کرنے سے سارے شبہات دُور ہو گئے اور بہت شکریہ ادا کیا۔ اس کی قدر صاحبِ واقعہ کو ہی ہوتی ہے۔ دوسرے لوگ حقیقت ناشناسی سے کچھ اور سمجھ کے زبان چلا بیٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں معاف کریں۔

بعض کم نصیب نفس کے غلام بے اعتقادی سے اس کو ناگوار سمجھ کر جھنجھلا جاتے ہیں۔ ایک صاحب آئے بدتمیزی کی اس پر ڈانٹ ہوئی تو بولے علم کا ادب کرتا ہوں ورنہ بتا دیتا۔ اور لوٹ گئے چلے گئے۔ چار پانچ روز بعد خط آیا کہ جب سے وہاں سے آیا ہوں میری نظر کم ہونے لگی ہے میں اس گستاخی کی سزا سمجھتا ہوں۔ اللہ کے لیے معاف فرما دیجئے۔ جواب لکھا کہ:

"یہ محض تمہارا خیال ہے باقی اطمینان رکھو میری طرف سے معاف ہے علاج کراؤ۔"

ضبطِ اوقات:-

سورہ "والعصر" میں عصر یعنی وقت کی قسم کھانا وقت کے بہت قابلِ قدر ہونے کا اشارہ رکھتا ہے۔ نمازوں کے اوقات، روزوں کا وقت متعین

ہونا، حج کے زمانہ کی تعیین، زکوٰۃ کے قمری سال پر فرض ہونے بلوغ و فرضیت احکام وغیرہ کے قوانین سے اشارہ ملتا ہے کہ وقت کی قدر اور اس کی ہر ہر مقدار کو کام میں لگانا ہی کامیابی اور بڑے بڑے کاموں کا ذریعہ ہے۔

حضرتؒ کے یہاں تمام معمولات کے اوقات، ملاقات کے اوقات و جواب خطوط کے اوقات، فتاویٰ و تالیف کے اوقات سب منضبط رہتے تھے۔ اور خانقاہ میں ضبطِ اوقات کا اعلان بھی لگا ہوتا تھا تاکہ سب کو سہولت رہے۔ یورپ سے مرعوب لوگوں نے ضبط اوقات کو یورپ کی ایجاد سمجھ کر اپنے گھر سے غافل ہو کر کچھ باتیں بھی کہنی سننی شروع کی تھیں۔ مگر اس قدر تالیفات، اس قدر ملفوظات، مواعظ ہزاروں کی تربیت، سینکڑوں کو شیخِ وقت بنا دینا، علاوہ دل کی خاص لگن کے ضبطِ اوقات کا بھی نتیجہ ہے۔

انکساری:

علم و عمل ظاہر و باطن کے کمالات کے پہاڑ، مگر مشوروں سے کام لینا اپنے چھوٹوں بلکہ بے انتہا چھوٹوں سے بھی مشورہ لینا بلکہ پوچھ لینا، معمولِ مبارک تھا، خود مجھ سے جس کا علم و عمل میں کوئی درجہ بھی نہ تھا، مسائل میں لوگوں سے برتاؤ میں، مشورہ فرما لیتے تھے۔ گو یہاں سے لاعلمی کا ہی جواب پیش ہوتا تھا۔

کھانا ساتھ کھانے میں کبھی ہاتھ دھلانے چاہے تو منظور نہ فرماتے،

آخر عرض کرتا کہ ایسے دونوں ہاتھ سہولت سے دھل جائیں گے اور چونکہ صابون کی جگہ بھنی ہوئی کھلی سے ہاتھ منہ دھوئے جاتے تھے، میں عرض کرتا کہ ایسے دونوں ہاتھ دُھل جائیں گے، تب اجازت ملتی۔

لکھنؤ میں ایک صاحب نے ایک مسئلہ پوچھا تو فرمایا:

"مجھے معلوم نہیں اپنے بزرگوں سے پوچھ کر بتا سکتا ہوں۔"

اکثر باتوں کے جواب میں فرما دیتے کہ:

"میں ایک طالب علم ہوں۔"

حالانکہ علوم دینیہ تحصیلیہ اور لدنیہ سے تمام تالیفات، مواعظ اور ملفوظات اس قدر پُر ہیں کہ شاید اس زمانہ میں تو کیا، قدیم و قریب زمانہ میں بھی اس کی مثال نہ مل سکے۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ نے نشر الطیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح دیکھی تو خود خرید لی۔ فرمایا:

"مجھے معلوم نہ تھا کہ اُردو میں بھی ایسی علمی کتابیں ہیں۔"

شاہ صاحب اُردو کتاب کو حقیر سمجھ کر دیکھا ہی نہ کرتے تھے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علوم عربی میں ہی ہیں۔ اُردو میں نقالی بھی کمزور ہو رہی ہے۔

خطوط کے جوابات

ظہر سے عصر تک کی مجلس میں تیس۳۰ چالیس۴۰ خطوط کے جوابات بھی پورے ہوتے تھے۔ اور بھی بہت کچھ ہوتا تھا۔ معمول یہ تھا کہ نہ گتہ پر رکھ کر نہ

کتاب کے اوپر صرف ہاتھ میں لے کر ہر خط کے ہر جملہ پر حاشیہ میں خط کھینچ کر جواب ارقام فرماتے تھے۔ اور جواب بھی نہایت جامع، نہایت لطیف اور بہت معنی خیز، اور ایسی ایسی گرفتیں کہ انسان تلملا اُٹھتا تھا اور اصلاح کی تاثیر محسوس کرتا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی بڑے مصنف، بڑے ادیب، بڑے فصیح بلیغ، بڑے مورخ تھے۔ ایک دفعہ خط میں تحریر کیا:

"کہ لڑکی کی شادی کی، لڑکا "الٰہ آباد" پڑھتا تھا، مولانا محمد علیؒ (خلیفہ حضرت اقدس) کا شاگرد تھا، مولانا بھی تشریف لائے تھے۔ پہلی بار ملاقات ہوئی بالکل اپنے شیخ کی تصویر پایا۔"

مولاناؒ نے ان کی تعریف میں خصوصیات علم و عمل کے کمال کی انتہا کو ایک لفظ میں سمو دیا تھا۔ حضرتؒ نے خط کھینچ کر اُوپر لکھا:

"مگر تصویر میں آیندہ ترقی کی قابلیت نہیں ہوتی۔"

قابل آدمی کو اپنے علم و قابلیت پر فطرۃً ایک ناز اور بعض دفعہ غرور تک ہو جاتا ہے۔ ایک ہی جملہ میں کیسی اصلاح فرمائی کہ تڑپ ہی اُٹھے ہوں گے اور نہ معلوم ان کے خطوط میں ایسے ایسے اصلاح کے لطیفے کس قدر ہوتے ہوں گے جن سے مولانا مجبور ہوئے کہ خط میں "از ہیچمدان محمد سلیمان" لکھا کرتے تھے۔ اُسی خط میں لکھا تھا کہ حضرت مولانا محمد عیسےٰ صاحب نے تقلیل مہر کی فضیلت پر تقریر فرمائی اور احقر نے بجائے خاندانی پانچ ہزار کے پانچ سو روپیہ مہر مقرر کیا اس پر تحریر فرمایا:

"آپ نے زہد عیسوی کو ملک سلیمانی پر ترجیح دی مگر ایک
خاموش حیادار پر ظلم ہوا"

اور حاضرین سے اس کی شرح فرمائی کہ عورت کا اصل حق "مہر مثل" (دادھیالی
اس جیسی لڑکیوں کے مثل مہر) ہوتا ہے۔ اس وقت وہ بول نہیں سکتی جو کچھ
کہا جاتا ہے خاموشی سے قبول کر لیتی ہے۔ مگر اس کا اصل حق مارا گیا۔ اور احادیث
میں جو تقلیل مہر کا حکم ہے وہ ہر شخصی مہر کے لیے نہیں ہے بلکہ خاندانوں
کو ارشاد ہے کہ وہ خاندانی مہر کم کریں جب تک خاندانی کم نہیں ہوا وہی اصلی
مہر ہے۔

یہ مسئلہ اسی روز معلوم ہوا۔ ورنہ غلط فہمی میں میں کیا نہ جانے کتنے
مبتلا ہوں گے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ اصل مہر "مہر مثل" ہی لڑکی کا حق ہے۔ چنانچہ
اگر کوئی نکاح کر دے اور مہر کا ذکر ہی نہ کرے یا صاف نفی کر دے کہ کچھ مہر نہ
ہوگا تب بھی "مہر مثل" ہی فرض ہوتا یہ فقہ میں سب جگہ موجود ہے مگر اس
طرف نظر حضرت کے ہی ارشاد سے گئی۔ ہزاروں خطوط میں کیا کیا ہوگا۔
کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ بجز چند مطبوعہ کے۔

قبول عام :

باوجود اس کے کہ دنیوی قبولیت کے ذرائع جمع نہیں کئے گئے
تھے نہ بازاری زبان نہ ادیبوں کے طور طریق، نہ طباعت، کتابت،
جلد دیدہ زیب، نہ تقریر لچھے دار، دلآویز وعظ و ہر کتاب جو تاثیرات

سے پُر ہوتی تھی دل میں گھر کرتی جاتی تھی اور قبول عام سے پھیلتی تھی۔
حضرت مولانا انور شاہ محدث وقتؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

"اللہ کی دین ہے کہ مولانا تھانویؒ ایک سطر لکھ دیں تو دنیا بھر میں پھیل جائے ہم (یعنی علماء) کتابیں کی کتابیں لکھ دیں تو کوئی نہیں پوچھتا"

بقول حافظ شیرازی:

"قبول خاطر و حسن سخن خداداد است"

آج مواعظ و ملفوظات کا یہی عالم ہے جو بہت سے شائع شدہ ہیں۔ دل پر ایسی کوئی شے اثر انداز نہیں جیسے یہ ہیں۔ جس کا جی چاہے خود پڑھ کر اپنے دل سے پوچھ لے۔ یا مجمع کو روز سنا کر اندازہ کر لے۔

بیویوں میں عدل:

ہر مرد کو چار بیویوں تک کرنے کی اجازت ہے، مگر ان میں عدل و مساوات کی شرط بہت سختی سے ہے اگر عدل نہ کرسکیں تو صرف ایک رکھیں۔ پہلی اہلیہ سے اولاد نہیں ہوئی تو ایک صاحبِ اولاد بیوہ سے نکاح فرمایا لیکن باوجود اس کے کہ عدل و مساوات صرف شب باشی اور نفقہ میں ضروری ہے۔ ہر بات میں ضروری نہیں مگر اختیاری امور میں اتنا اہتمام تھا کہ جتنے منٹ ایک کے یہاں ٹھہرتے، گھڑی دیکھ کر اتنے ہی منٹ دوسری کے یہاں سونا اور کھانا ہموار ہوتا تھا۔ مہمانوں کے کھانے کے پیسے معین کر

رکھے تھے۔ جس کے نمبر ہیں جتنے مہمان ہوئے ان کے حساب سے
ان کو زائد خرچ دیا۔

خود خانقاہ میں ایک ترازو رکھی رہتی تھی جو چیز گھروں میں بھیجنی ہوتی
تھی تول کر برابر کر کے بھیجی جاتی۔ اگر کپڑا ہوا اور برابر نصف نہ نصف ہو سکا
تو کر دیا ورنہ فروخت کرا کے قیمت برابر برابر تقسیم کر دی۔ ایک دفعہ تحفہ میں
ایک شال آئی تھی۔ اس کے ۲ دو ٹکڑے کرنے چاہیے گھر والیوں نے کہا کہ
دو ٹکڑے ہو کر وہ کسی کے بھی کام کی نہ رہے گی۔ اور پسند تھی تو فروخت
کرانے کو بھی پسند نہ کیا۔ طے یہ ہوا کہ بازار سے اس کی قیمت لگوا دی جائے
اور ہر ایک کو اختیار ہو کہ نصف قیمت دے کر لے سکے۔ ایسا ہی کیا گیا۔

پھل یکساں ہوتے تو تول میں برابر کر دیئے جاتے اگر فرق ہوتا تو
چاقو سے نصف نصف کر کے تول کر برابر کر دیا جاتا تھا۔

باہر کے لوگ یہ تماشہ دیکھتے تو حیران رہ جاتے لوگوں سے پوچھتے
تو معلوم ہوتا کہ یہ عدل و مساوات کا طریقہ ہے جو چند بیویوں میں کرنا
چاہیئے۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے عرض کیا:

"کہ آپ نے دوسرا نکاح کر کے لوگوں کو اس کا راستہ
دکھا دیا"

فرمایا:

"نہیں بلکہ میں نے راستہ بند کر دیا۔ کر کے دکھلا دیا کہ ڈویا

زیادہ بیویاں کریں تو اس طرح عدل و انصاف کیا کریں، ورنہ دوسری تیسری کا نام نہ لیں"

ذاتی خرچ :

اوپر عرض کر دیا گیا ہے کہ آمدنی سے چوتھائی (۱/۴ حصہ) خیرات۔ چوتھائی ایک اہلیہ کو، چوتھائی دوسری اہلیہ کو، اور چوتھائی اپنے خرچ کے لیے رکھا جاتا تھا۔ مگر اس میں بھی اپنا خرچ صرف دھوبی، حجام وغیرہ کا ہوتا تھا یا دواؤں کا۔ آخری بیماری میں لکھنؤ علاج کے لیے تشریف لے گئے وہاں خرچ سب میرے ہاتھوں ہوتا تھا اور ہفتہ وار حساب ملاحظہ فرماتے، خرچہ دوا کا ڈھائی روپیہ روز کا دیکھا تو فرمایا کہ :

"حکیم صاحب سے کہہ دینا میں اتنے گراں علاج کا متحمل نہیں ہوں گا۔"

اور جیسے اوپر عرض ہوا کہ ایک عالم کی بیوہ کا خط ضرورت کا آیا تو دو سو روپیہ منی آرڈر کرا دیا۔ اسی طرح اور بھی عطائیں غریبوں کو ہوتی تھیں۔ جن کا کسی کو پتہ نہیں۔ اپنی ذات پر ڈھائی روپیہ روز کی دوا تک منظور نہیں۔ اور خیرات میں سب منظور۔ ہم سب کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ ہم ان کا برعکس کیوں کر رہے ہیں۔

سیاسی نظریہ:

مسلمانوں کی ہر پریشانی، زبوں حالی، کمزوری سے بے حد پریشان، مگر کسی ایسی صورت کو گوارا نہیں کیا جس میں مسلمانوں کا خون بہہ جائے اور فائدہ نہ ہو، یا ہو مگر معمولی ہو، مسلمانوں کی جان بہت قیمتی ہے اسے ہلکا نہ سمجھا جائے، اور نہ کوئی ایسی صورت ان کی ترقی کے لیے گوارا کی جس سے مسلمانوں کے ایمان و تقویٰ میں رخنہ پیدا ہو جائے۔ مرکز ہو، قوت ہو، طاقت ہو تو جہاد ورنہ صبر و سکون۔

مسلمانوں کی جان، اس کا ایمان، اس کا تقویٰ معمولی چیز نہیں جسے اوہام میں ضائع کرا دیا جا سکے۔ ہاں ظلم شدید کے دفعیہ کے لیے جو ہو سکے کرنا ہے شرعی احکام پر غور کرنے سے یہی راستہ صحیح نظر آئے گا۔

اس لیے بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ "صراطِ مستقیم" تمام مذہبوں میں مذہبِ اسلام، تمام فرقوں میں اہل السنۃ والجماعۃ اندرونی مذہبوں میں مذہب حنفی، اس کے اندرونی اختلاف میں طریقہ علمائے دیوبند اس کے اندرونی مسلکوں میں "مسلک اشرفی" ہی ہے۔ "اھدنا الصراط المستقیم"

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مقالہ نمبر

ذکر

حکیم الامت

از

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

ذکرِ حکیم الامت

اس ناکارہ کے اکابر شموس و بدورِ ہدایت ہر ایک اپنے علوم و معرفت اور علو شان فقہ و سلوک تفسیر و حدیث میں ممتاز ہے

اولٰئک اٰبائی فجئنی بمثلھم　　اذا جمعتنا یا جریر المجامع

الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں　　کہ ہر اک دست بوسی کیا قدم بوسی کے قابل ہے

یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر　　ان ہی کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی

انہیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے　　انہیں کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی

رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں　　پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی

اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے　　اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

لیکن اس کے باوجود گلدستہ کے پھولوں کی طرح سے ہر ایک کی بو الگ، نظافت و لطافت الگ اور گلدستہ جب ہی کامل و مکمل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں مختلف رنگوں کے اور مختلف خوشبوؤں اور اداؤں کے پھول ہوں ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن　　اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

میرے جملہ اکابر کی سوانح عمریاں مختصر و مفصل بہت سی لکھی گئی ہیں جن میں اُن کے علمی کمالات، عملی ریاضات معارف و علوم و حکمت پر مختصر مفصل سب ہی کچھ لکھا گیا ہے لیکن ان سب کا احاطہ نہ ہو سکتا ہے اور نہ مجھ جیسے ناقص العلم والفہم کے ادراک میں آسکتے ہیں۔ مگر میرا جی یہ چاہا کرتا ہے کہ ان اکابر کے تاریخی حالات نہایت اجمالی طور پر

ضرور دوستوں کو مستحضر ہیں کہ اس سے دَور اور زمانے کا علم تو ہوتا رہے۔ اسی لئے میں نے اپنے اکابر کا حال جس تذکرہ میں عربی میں یا اُردو میں لکھا بہت مختصر لکھا۔ چونکہ خوانِ خلیل حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی تالیف ہے اور حضرت حکیم الامت کی سوانح عمریاں مختصر و مطول ہندو پاک میں بہت سی لکھی جا چکی ہیں اور گو کمالات علمیہ اور عملیہ تو ان میں بھی نہ آئے۔ ان میں اشرف السوانح مؤلفہ محبی و مخلصی جناب الحاج خواجہ عزیز الحسن بہت ہی مکمل اور قابل اعتماد ہے کہ خود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے زمانۂ حیات میں لکھی گئی اور خود حضرت کی نظر ثانی دو حصّوں پر ہوئی۔ اس کے بعد جتنی لکھی گئیں وہ سب اسی سے ماخوذ اور ان کا چربہ ہیں جو مختلف اہلِ ذوق نے اپنے ذوق کے موافق لکھی ہیں۔ میرا ذوق جیسا کہ میں نے اُوپر لکھا نہایت مختصر تاریخی حالات لکھ دینے کا ہے اسی لحاظ سے اس مختصر مضمون میں خوان خلیل کے مصنف حضرت اقدس حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے مختصر تاریخی حالات لکھنے کا ہے۔

یہ تو مشہور ہے کہ آپ کی پیدائش ایک صاحب خدمت مجذوب حافظ غلام مرتضٰے پانی پتی کی دُعا سے ہوئی۔ اس لئے کہ آپ کے والد صاحب نے مرضِ خارش سے تنگ آکر اطباء کے مشورے سے کوئی دوا قاطع النسل کھالی تھی جس کی وجہ سے اولاد کے پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ آپ کی نانی صاحبہ بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے اپنی لڑکی (یعنی آپ کی والدہ ماجدہ) کے لئے دُعا کرائی۔ ان مجذوب نے پیشین گوئی کی کہ اس لڑکی سے دو لڑکے پیدا ہوں گے۔ ایک میرا ہوگا جو مولوی، عالم، حافظ ہوگا۔ اس کا نام اشرف علی رکھنا اور دُوسرا دنیا دار ہوگا اس کا نام اکبر علی رکھنا۔ حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے کہ مَیں جو کسی وقت اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں تو انہیں مجذوب صاحب

کی روحانی توجّہ کا اثر ہے جن کی دُعا سے میں پیدا ہوا ہُوں کیونکہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔

تاریخ ولادت

۵ ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ کو بُدھ کے دن صُبح صادق کے وقت آپ کی ولادت ہوئی۔ تاریخی نام کرم عظیم ہے۔ دادھیالی نام عبدالغنی تجویز ہُوا اور ننہیالی اشرف علی، پھر اسی کو غلبہ ہُوا۔

حضرت کا تعلیمی دَور قرآن شریف سے ہُوا۔ چند پارے آپ نے کھتولی، ضلع مظفر نگر کے رہنے والے اخون جی سے پڑھے۔ پھر حافظ حسین علی صاحب جو دہلی کے رہنے والے تھے اور میرٹھ میں قیام تھا۔ آپ نے دس سال کی عُمر میں حفظ سے فراغت پالی تھی۔ فارسی کی تعلیم میرٹھ کے استاذوں سے حاصل کی اور پھر متوسطات تھانہ بھوا نیں حضرت مولانا فتح محمد صاحب سے پڑھیں۔ اور انتہائی کُتب فارسی ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو ادب فارسی کے استاذ کامل تھے۔ اس کے بعد دیوبند تشریف لے گئے۔ عربی کی ابتدائی چند کتابیں مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے پڑھیں اور فارسی کی چند کتابیں سکندر نامہ وغیرہ بھی دیوبند میں مولوی منفعت علی صاحب سے پڑھیں۔ دیوبند کا داخلہ آخری ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں ہے وہاں جا کر حضرت نے نورالانوار ملاحسن مشکوٰۃ شریف مختصر المعانی شروع کی اور پانچ سال تک مسلسل دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن دوران تعلیم میں حضرت کو خارش کا مرض لاحق ہُوا جب کہ حضرت کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ چھٹی لے کر اپنے مکان تھانہ بھون تشریف لے گئے اور چونکہ طالب علمی کا زمانہ شروع ہو چکا تھا اور خالی رہنا مُشکل تھا اس لئے بطور مشغلہ کے مثنوی زیروبم تصنیف فرمائی جس کا

پہلا شعر جو اُس کی تمہید ہے یہ ہے ؎

ہمی گوید گرفتار درد و نالہ ! نادان ہشتدہ[۱۸] سالہ !

۱۳۰۱ھ میں جب کہ حضرت کی عمر بیس سال کی تھی علوم ظاہریہ سے فراغت حاصل کی حضرت حکیم الامتؒ کی۔ طالب علمی کے زمانے میں اُن کی تائی صاحبہ نے فرمایا کہ بھائی تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کھائے گا اور بڑا عربی پڑھ رہا ہے اس کی گزراوقات کی کیا صُورت ہوگی؟ کیونکہ جائیداد وارثوں میں تقسیم ہوکر قابل گزارہ کے نہ رہے گی۔ یہ بات والد صاحب کو بہت ناگوار ہوئی اور باوجود اس کے کہ تائی صاحبہ کا بہت ادب کرتے تھے۔ یہ سُن کر جوش آگیا اور کہنے لگے کہ بھابی صاحبہ یہ تم نے کیا کہا؟ خدا کی قسم! جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو ایسے ایسے اس کی جُوتیوں سے لگے پھریں گے اور یہ اُن کی جانب رُخ بھی نہ کرے گا۔ یہ مقولہ نقل کر کے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ بات کوئی درویش کہتا تو اُس کی بڑی کرامت سمجھی جاتی۔ لیکن والد صاحب تو دُنیا دار سمجھے جاتے تھے۔

دیوبندی دور کے اساتذہ کرام

(۱) حضرت اقدس نانوتوی قدس سرہٗ: حضرت حکیم الامت نے ان سے کوئی سبق تو نہیں پڑھا لیکن درس جلالین میں شرکت کیا کرتے تھے۔

۲۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اوّل جو حضرت حاجی صاحب کے اکابر خلفاء میں شمار ہوتے تھے اور اسباق میں بھی علوم ظاہریہ کے ساتھ علوم باطنیہ سے بھی طلباء کو مستفید فرماتے تھے۔

۳۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مدرسِ چہارم جب کہ حضرت

حکیم الامت ۱۲۹۵ھ میں دیوبند میں داخل ہوئے تو حضرت شیخ الہند کے پاس مختصر المعانی اور ملاحسن کے اسباق پڑھے۔ حضرت حکیم الامت نے اپنی تعلیم کی تفصیل سبع سیارہ میں لکھی ہے۔ ان دو کے علاوہ حضرت کے اساتذہ میں مولانا سیّد احمد صاحب مدرس دوم اور ملا محمود صاحب مدرس سوم اور مولانا عبدالعلی صاحب بھی تھے۔ ذکر محمود میں ہے کہ ابتداء حاضری سے فراغ تک حضرت شیخ الہندؒ کے پاس میرے اسباق رہے جن میں، حمداللہ میر زاہد رسالہ میر زاہد ملا جلال اور فقہ میں ہدایہ اخیرین اور حدیث کی متعدد کتب پڑھیں جن کی تفصیل سبع سیارہ رسالہ میں ہے اور قرأت کی مشق مکہ مکرّمہ کی حاضری پر شیخ القراء قاری عبداللہ صاحب مہاجر مکّی سے کی۔ اشرف السوانح میں تحریر ہے کہ جب مدرسہ صولتیہ کے بالائی حصّہ پر قاری صاحب حضرت تھانوی کو مشق کراتے تو نیچے سے سُننے والے کو بسا اوقات استاذ و شاگرد کی آواز میں اشتباہ ہوتا تھا۔

دارالعلوم سے فراغ پر آخر صفر ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ فیض عام کانپور کی صدر مدرسی پر بمشاہرہ پچیس روپے تشریف لے گئے۔ حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم کے زمانے میں اپنے لئے زیادہ سے زیادہ دس روپے تنخواہ ہی کافی سمجھا کرتا تھا۔ پانچ روپے اپنی ضرورت کے لئے اور پانچ روپے گھر والوں کی ضرورت کے لئے فیض عام میں تشریف لے جانے کے تین چار ماہ بعد مواعظ کی شہرت ہوئی تو اہل مدرسہ نے اس پر زور دیا کہ حضرت اپنے مواعظ میں مدرسہ کے لئے چندہ بھی کیا کریں جس کو حضرت نے قبول نہیں کیا اس پر اختلاف ہوا اور حضرت استعفےٰ دے کر چلے آئے۔ مگر چونکہ اہل کانپور گرویدہ ہو چکے تھے اس لئے

جب حضرت واپسی کے لئے اس نیت سے کہ پھر ادھر آنا ہو یا نہ ہو گنج مراد آباد حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت کے لئے پہنچے اور زیارت وغیرہ کے بعد دوبارہ کانپور سامان لینے کے لئے پہنچے تو حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے اپنے محلہ کی جامع مسجد محلہ ٹپکاپور میں ایک مدرسہ جامع العلوم کے نام سے تجویز کیا اور اس میں باصرار حضرت سے قیام کی درخواست کی۔ چنانچہ پچیس روپے پر حضرت نے وہاں قیام منظور فرمالیا اور جامع العلوم کے قیام کے دوران میں حضرت کو خیال ہوا کہ تنخواہ لے کر دین کی خدمت گو جائز ہے لیکن جی اس کو پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے کچھ دنوں بعد دہلی جاکر حکیم عبدالمجید صاحب سے طب کی تعلیم شروع کی تاکہ گذر اوقات مطب ہو اور خدمتِ دین لوجہ اللہ تعالےٰ۔ لیکن حضرت کے دہلی جانے پر اہل کانپور مضطربانہ دہلی پہنچے اور واپسی پر اصرار کیا۔

دہلی کے دوران قیام میں حضرت کے ہم سبق جناب الحاج حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی نور اللہ مرقدہٗ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ طب کا مشغلہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے کہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مطب کے ساتھ دین اور علم دین کی خدمت نہیں ہوتی۔ (از زکریا عفی عنہٗ، حضرت اقدس قطب الارشاد حضرت گنگوہی کا مشہور مقولہ ہے کہ جسے دُنیا سے کھونا ہو کسی خانقاہ میں بٹھادو، اور علم دین سے کھونا ہو تو علم طب پڑھا دے اور دونوں سے کھونا ہو تو شاعری سکھادے۔) حضرت حکیم الامت نے از خود استاد سے سبق چھوڑ کر واپس آنا خلاف ادب سمجھا اس لئے اہلِ کانپور سے کہا کہ تم استاذ سے خود اجازت لو۔ ان کے اصرار پر حکیم عبدالمجید صاحب نے حضرت حکیم الامت سے فرمایا کہ اگر تم ترقی کرنا نہیں چاہتے تو اجازت ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ

نے ۱۵ روز دہلی میں قیام کے بعد کانپور مراجعت فرمائی۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کو جب مشغلۂ طب چھوڑ کر کانپور مراجعت کی اطلاع ہوئی تو حضرت نے بہت اظہار مسرّت فرمایا اور فرمایا کہ طبابت کے شغل کو ترک کر کے کانپور آ کر دینیات کے شغل کا حال معلوم ہو کر بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالےٰ آپ کی خدمات میں برکت فرمادے۔ آپ کے فیوض و برکات سے لوگوں کو بہت مستفیض فرمائے۔ میں نے آپ کو پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ دین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیئے۔ دُنیا خود ہی اچھی صُورت میں خدمت کے لئے حاضر رہا کرے گی۔ بہرکیف آپ لوگ علماء ورثۃ الانبیاء ہیں آپ لوگوں کو اللہ تعالےٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لئے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کئے ہیں۔ پس اپنے مقصُود کا خوب خیال رکھنا چاہیئے۔

(مکتوبات امدادیہ ص۳ مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ)

طالب علمی کے آخری دور میں دیوبند کے قیام میں ایک مرتبہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی دیوبند تشریف آوری پر بیعت کی درخواست کی تھی۔ لیکن حضرت قطب عالم نے یہ کہہ کر کہ طالب علمی کے زمانہ میں شغل باطن مخل تحصیل علم ہوگا انکار فرمادیا تھا جس کو حضرت تھانوی نے دفع الوقتی پر محمل فرمایا جس کی تفصیل یاد یاراں میں مذکور ہے۔ لیکن اسی زمانہ میں ایک دُوسرے طالب علم کو حضرت نے بیعت فرما لیا جس سے حضرت تھانویؒ کو بہت قلق ہُوا۔ اور ۱۲۹۹ھ میں حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ تیسرے حج کو تشریف لے گئے تو حضرت تھانوی نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے ہاتھ ہی دستی خط حضرت شیخ المشائخ مہاجر مکی کی خدمت میں

لکھا کہ میں نے مولانا سے درخواست بیعت کی تھی مولانا نے انکار کر دیا جناب سفارش فرمادیں اور اعلیحضرت کی حضرت قطب عالم سے جو گفتگو ہوئی وہ تو معلوم نہیں لیکن حضرت تھانوی کے خط کا جو جواب حضرت شیخ المشائخ نے مرحمت فرمایا تھا اس میں بجائے سفارش کرنے کے خود ہی خط سے بیعت فرمالیا اور اس سے بہت قبل حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت حکیم الامت کے والد کو ایک خط لکھا تھا کہ جب تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر آنا حالانکہ حضرت شیخ العرب و العجم کو اس وقت حضرت تھانویؒ سے کوئی خصوصی تعارف بھی نہ تھا۔ خط سے بیعت کے بعد منجانب اللہ حاضری کی صورت بھی پیدا ہوئی وہ یہ کہ اس زمانے میں دیوبند میں کوئی کمپنی قائم ہوئی تھی جس میں فی حصہ پانچ سو روپے کا تھا اور ایک شخص کو ایک حصہ سے زائد لینے کا حق نہ تھا مگر حضرت تھانویؒ کے والد صاحب نے اپنے تمول کی وجہ سے تین حصے اس طرح لئے۔ ایک اپنے نام سے دوسرا حضرت تھانوی کے نام سے اور تیسرا حضرت کے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی کے نام سے۔ اور کچھ عرصہ بعد بعض وجوہ سے اس رقم کو واپس لے لیا۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے اپنے والد صاحب کو لکھا کہ جو حصہ آپ نے میرے نام سے جمع کیا تھا اور اب واپس لے لیا وہ میری ملک ہے یا آپ کی؟ اس پر والد صاحب نے جواب دیا کہ اب تک تو میری ملک تھی اور مصلحتاً تمہارا نام لکھا تھا لیکن تمہاری ملک ہے۔ اس پر حضرت تھانوی نے لکھا اب تو اس رقم کی زکوٰۃ بھی مجھ پر واجب ہے اور اس کی وجہ سے مجھ پر حج بھی فرض ہو گیا۔ والد صاحب نے زکوٰۃ کی رقم تو نقد بھیج دی اور حج کے متعلق لکھا کہ میں تمہاری چھوٹی بہن یعنی والدہ ماجدہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی (شیخ الاسلام پاکستان) کے نکاح سے فارغ

ہو جاؤں تو آئندہ سال حج کے لئے جاؤں گا۔ اس وقت تم بھی ساتھ چلنا۔ حضرت تھانویؒ نے لکھا (اگرچہ والد کا ادب بھی بہت کرتے تھے اور ڈرتے بھی بہت تھے) آپ مجھے یہ لکھ دیجئے کہ تو آئندہ سال تک زندہ رہے گا۔ اس پر والد صاحب نے لکھا کہ یہ میں کیسے لکھ سکتا ہوں تو حضرت تھانوی نے لکھا کہ پھر حج کو کیسے مؤخر کر سکتا ہوں۔ اس پر والد صاحب نے بہت ہی عجلت کی حالت میں شوال ۱۳۰۱ھ میں نہایت عجلت میں اپنی صاحبزادی کا کھڑے کھڑے نکاح پڑھ دیا اور شادی کی تقریبات سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت تھانوی کے ساتھ حج کو روانہ ہو گئے۔ جب کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو کانپور کی ملازمت کو چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس سال دریا میں طغیانی بہت شدت سے تھی۔ راستہ میں والد صاحب کے دوستوں نے بھی طغیانی سے ڈرایا۔ مگر والد صاحب نے فرمایا کہ اب تو ارادہ کر لیا ہے۔ واقعی سمندر میں بہت زیادہ طغیانی تھی اور حضرت کا جہاز حیدری نام بہت چھوٹا جہاز تھا جو طغیانی کا تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی ادھر جھکتا کبھی ادھر۔ موج کا پانی جہاز کے اُوپر کو گزرتا اور سب سامان کو بھگو دیتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہایت عافیت کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ جب اوّل بار بیت اللہ پر نظر پڑی ہے تو اس طرح کیفیت انجذابیہ شوقیہ ہوئی کہ پھر عمر بھر بھی کبھی نہیں ہوئی۔ اعلیٰحضرت مہاجر مکیؒ کو بھی حضرت کی حاضری پر نہایت مسرت ہوئی اور ارشاد فرمایا کہ تم چھ ماہ میرے پاس رہ جاؤ لیکن والد نے مفارقت گوارہ نہ کی تو اعلیٰحضرت نے فرمایا کہ اب تو والد کی اطاعت کرو پھر کبھی موقعہ ہُوا تو چھ ماہ آکر رہ جانا۔ اس سفر میں تجدید بیعت دست بدست بھی ہو گئی اور حضرت حکیم الامت کے والد بھی اسی سفر میں مشرف بہ بیعت ہوئے۔ باوجود اعلیٰ حضرت کی خواہش کے والد صاحب نے مفارقت گوارہ نہ کی۔ اس

لئے واپس آنا پڑا۔ لیکن باوجودیکہ حجاز سے واپسی پر جامع العلوم کانپور میں درس و تدریس کا سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن دن بدن طبیعت پر علوم باطنی کی طرف میلان بڑھتا رہا اور ۱۳۰۷ھ میں ذکر و شغل کی طرف جب زیادہ میلان بڑھ گیا تو حاجی صاحب سے ترک ملازمت کی اجازت چاہی لیکن حاجی صاحب نے منظور نہیں فرمایا۔ جو مفصّل تو مکتوبات امدادیہ میں ہے اور مختصر اشرف السوانح میں ص۲۳۷ پر فارسی میں بھی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے :

ذوق و شوق کے حالات سے ترقی کا اندازہ ہوا۔ البتہ ملازمت کا ترک تعلق مناسب نہیں کہ یہ تجردانہ زندگی کے مناسب ہے۔ اہل وعیال کو مضطرب چھوڑنا ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ والانامہ ۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ کا ہے۔ اسی ذوق و شوق میں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری کے عرائض بار بار لکھے اور چونکہ ۱۳۰۵ھ میں والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے اجازت کا مسئلہ بھی نہ تھا۔ ۱۳۱۰ھ کے آخر میں حج کے لئے روانہ ہوئے اور اعلیٰ حضرت کی تمنّا کہ چھ ماہ میرے پاس رہو کو پورا کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں جانے کے بعد اعلےٰ حضرت کے ایسے منظور نظر بنے کہ لوگوں کو رشک ہی نہیں حسد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ حضرت خود فرمایا کرتے تھے کہ میں یہ چاہا کرتا تھا کہ حضرت میرے اوپر سب کے سامنے اتنی شفقت نہ فرمایا کریں تو اچھا ہے۔ آخر میں حضرت تھانویؒ کو حاسدین سے اتنا اندیشہ ہو گیا تھا کہ پورے چھ ماہ کا ارادہ پورا نہ ہو سکا اور ہفتہ عشرہ پہلے ہی تشریف لے آئے کہ ابھی تو میں حضرت کے یہاں مقبول ہوں آئندہ کہیں لگائی بجھائی کرنے والے حاسدین حضرت کو میری طرف سے مکدر نہ کر دیں۔ اس لئے انشراح کی حالت میں ہی رخصت ہو جانا چاہیئے اور اسی سفر میں اعلیٰ حضرت کی طرف سے اجازت بیعت بھی حاصل ہو گئی۔ واپسی پر اپنے مشغلہ علمیہ میں مشغول رہے۔ اسی دوران میں حضرت کے ماموں پیرجی امداد علی جو

عرصہ سے حیدرآباد میں مقیم تھے اور نہایت مغلوب الحال والمقال تھے حیدرآباد سے واپسی میں کانپور کو قصداً اس تمنا میں گزرے کہ بھانجے کو بھی جن کا شہرہ سُن رہے تھے مُلاقات کروں، وہ کانپور میں آکر سرائے میں ٹھہرے اور حضرت کو اطلاع دی کہ اگر تم اپنی وضع کے خلاف نہ سمجھو تو مجھ سے سرائے میں آکر مل جاؤ۔ حضرت ملنے تشریف لے گئے اور باصرار اپنے مکان پر لے آئے۔ ماموں صاحب نے فرمایا بھی کہ میاں تم عالم باعمل ہو مجھے اپنے یہاں نہ لے جاؤ کہ دیکھنے والے یہ کہیں گے کہ کس لُچے کو لے آئے۔ مگر حضرت کے اصرار پر پیر صاحب مع اپنے ساز و سامان کے جس میں آلاتِ سماع بھی تھے مکان پر آگئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ماموں صاحب میں اتنی سوزش تھی کہ کلمات سے آگ سی نکلا کرتی تھی جس پر حضرت تھانویؒ کو ایک جوش پیدا ہُوا کہ جس طرح بھی ہو ان سے عشق کی آگ لی جائے اور بے اختیار ماموں صاحب کی طرف رجوع کر لیا۔ حضرت تھانویؒ کا یہ رجوع دُوسری مرتبہ تھا۔ پہلی مرتبہ سفرِ حج ثانی ۱۳۱۰ھ سفر اجازت بیعت سے پہلے کا ہے۔ اس کا بیان اشرف السوانح ص۲۱۵ پر ہے۔ بعض حضرت تھانویؒ کے سوانح لکھنے والوں نے دونوں کو خلط کر دیا۔ اسی دُوسرے رجوع پر حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی وہ خط و کتابت ہے جو تذکرۃ الرشید میں مفصّل موجود ہے۔ حضرت تھانویؒ کے اس رجُوع پر حضرت گنگوہیؒ نے مولانا منور علی صاحب کے واسطے سے حضرت تھانویؒ سے شکوہ کیا۔ جس کا مختصر ذکر یادِ یاراں میں بھی ہے۔ اشرف السوانح میں تو یہ قصّہ بہت مختصر ہے اور خط کی طرف صرف اشارہ ہے۔ لیکن تذکرۃ الرشید ص۱۱۴ جلد اوّل پر یہ تذکرہ حضرت گنگوہیؒ و حضرت تھانویؒ کی مکرر سہ کرر مراسلت کے ذیل میں مذکور ہے۔ البتہ اشرف السوانح کی ترتیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ و ہنگامہ حضرت تھانویؒ کے دوسرے سفرِ حج اور اجازت سے قبل کا

ہے۔لیکن تذکرۃ الرشید میں ان خطوط پر جو تاریخیں درج ہیں اُن میں حضرت تھانویؒ کے سب سے پہلے خط پر ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۱۴ھ ہے۔اور حضرت گنگوہیؒ کے جواب پر ۵ ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ ہے اور حضرت گنگوہی کا جواب ۵ محرم الحرام کا ہے اور تیسرا عریضہ حضرت تھانوی کا ۸ محرم ۱۳۱۵ھ کا ہے اور اس پر حضرت گنگوہیؒ کا جواب ۱۲ محرم ۱۳۱۵ھ کا ہے۔

اس کے بعد بھی کئی مکاتبتیں ہیں۔آخری مکاتبت میں حضرت تھانویؒ کا رجوع اور حضرت گنگوہیؒ کا اس پر تشکر ہے جو بہت طویل خط و کتابت ہے جو تذکرہ الرشید میں دیکھی جا سکتی ہے لیکن اس ناکارہ زکریا کے خیال میں ۱۱ھ میں مکہ مکرمہ سے واپسی پر اعلیٰ حضرت نے جو دو وصیتیں فرمائی تھیں میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی عجلت نہ کرنا اور کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دُوسری جگہ تعلق نہ کرنا (اشرف السوانح ص۲۲) توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔اس سفرِ حج سے واپسی کے بعد سے حضرت کا تبتّل کا میلان تو بڑھتا ہی گیا۔حضرت تھانویؒ کا خود ارشاد ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت سے واپسی کے بعد ایک سال کے قریب میں نے وعظ نہیں کہا لوگ بہت اصرار کرتے تھے مگر مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی کہ ایسے خراب شخص سے کیوں وعظ کے لئے کہتے ہیں۔ایک مرتبہ بہت اصرار کیا تو میں رونے لگا۔ اس کے بعد اصرار نہیں ہُوا۔ (حسن العزیز جلد اوّل ملفوظ ص۳۰۶، ص۱۶۶)

اس دوران میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے ترک ملازمت کی دو مرتبہ اجازت بھی چاہی جو مجھے تذکرۃ الرشید میں یاد ہے۔مگر حضرت گنگوہیؒ نے دونوں مرتبہ ہی اجازت نہیں فرمائی اور تیسری مرتبہ حضرت تھانویؒ نے ترک ملازمت کے بعد یہ لکھا کہ حضرت مجھ سے تحمل نہیں ہُوا میں چھوڑ کر چلا آیا تو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بہت دُعائیں دیں۔

میرے والد صاحب حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاتب خطوط نے پہلے دو خطوں پر بھی بہت سفارش کی کہ اللہ کا نام ایک شخص توکلاً علی اللہ بلا معاوضہ سکھانے کا ارادہ کرتا ہے تو حضرت کیوں منع فرماتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ جو میں کہتا ہوں لکھ دو اور تیسرے جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بہت دعائیں دی تو میرے والد صاحب نے پھر عرض کیا کہ پہلے دو خطوں میں تو حضرت نے یہ لکھوایا تھا اور اب اظہار مسرت کیا تو حضرت نے فرمایا کہ آدمی مشورہ جب کیا کرتا ہے جب تردد ہو۔ اور جب تک تردد ہو توکل ٹھیک نہیں۔ یہ قصہ میں نے بڑی تفصیل سے اپنے والد صاحب سے بھی سُنا تھا اور تذکرۃ الرشید میں بھی یاد ہے مگر اس وقت مراجعت دشوار ہے۔ بہر حال حضرت حکیم الامت اوائل ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے ترک ملازمت کر کے تھانہ بھون تشریف لائے جس کی تفصیل اشرف السوانح ص ۲۲۹ پر ہے۔ تھانہ بھون تشریف آوری کے بعد حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ پر کچھ قرضہ ہوا۔ جس کی دعا کے لئے اعلیٰ حضرت کو مکہ مکرمہ اور قطب الارشاد کو گنگوہ لکھا۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا جواب تو یہ آیا کہ آپ کی استقامت اور توکل میں کامیابی کی دُعا کرتا ہوں۔ مختصر مکتوب ص ۳۷ ۶ رجب ۱۳۱۵ھ اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ اگر کہو تو مدرسہ دیوبند میں تمہارے لئے مدرسی کی تحریک کروں۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے عرض کیا کہ میرا تو عرض کرنے کا مقصد صرف دُعا ہے۔ باقی حضرت حاجی صاحب نے بعد ترک تعلق کانپور کسی اور جگہ کوئی تعلق کرنے کی ممانعت فرمادی ہے لیکن اگر حضرت کی یہی تجویز ہے تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحب ہی کی تجویز سمجھوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ حضرت حاجی صاحب ہی نے اپنی پچھلی تجویز کو منسوخ فرما کر اب یہ صورت تجویز فرمادی ہے۔ یہ سُن کر حضرت مولانا گنگوہیؒ

نے فوراً گھبرائے ہوئے سے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں نہیں، اگر حضرت حاجی صاحب کی ممانعت ہے تو میں ہرگز اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا۔ میں دُعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ قرض سے سُبکدوش فرمائے۔ چنانچہ دونوں حضرات کی دُعا کی برکت سے قرضہ سے جلدی سُبکدوشی ہوگئی اور پھر بفضلہٖ تعالیٰ کبھی تنگی نہیں ہوئی۔ (اشرف السوانح ص۲۳۵)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے دو نکاح ہوئے۔ پہلا طالب علمی کے دوران میں جس کو حضرت تھانویؒ نے یادیاراں میں اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ جب احقر کا گنگوہ میں نکاح ہُوا غالباً ۱۲۹۸ھ تھا والد صاحب مرحوم کی درخواست پر شیخ غلام محی الدین مرحوم رئیس اعظم چھاؤنی میرٹھ کہ والد مرحوم ان کی ریاست میں مختار تھے والد صاحب کی درخواست پر انہوں نے نکاح میں شرکت کی۔ نکاح حضرت گنگوہیؒ نے پڑھا تھا۔ جب حضرت قدس سرہٗ مجلس نکاح سے واپس ہوگئے تو شیخ صاحب صاحب بھی ساتھ ساتھ چلے گئے۔ شیخ صاحب نے خود مجھ سے ایک دفعہ کہا کہ میں نے بہت سے بزرگ دیکھے بڑے بڑے حکام سے ملا لیکن جو رُعب و ہیبت حضرت کی دیکھی وہ کسی میں نہیں دیکھی۔ یہ حالت تھی کہ بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ ان کی یہ شہادت ایک باوقعت شہادت تھی الخ۔ دُوسرا نکاح اپنی ہمشیرزاد مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ برادر بزرگ مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان کی بیوہ سے ہُوا۔ یہ نکاح وسط رمضان ۱۳۲۴ھ میں ابتداءً وکالت کے ذریعہ سے ہُوا تھا۔ لیکن ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے حضرت نور اللہ مرقدہ کو ایک طلاق دینی پڑی اور اس پر اہلیہ اولیٰ نے خود کیرانہ جا کر سب کو از سرِ نو راضی کر کے اور حضرت کو بُلا کر تجدید نکاح کی۔ اس میں بھی بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے اس سلسلہ میں ایک مستقل رسالہ

بھی الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ تحریر فرمایا۔ وصال کے وقت دونوں اہلیہ حیات تھیں۔ بڑی اہلیہ محترمہ کا چند سال بعد تھانہ بھون میں انتقال ہوچکا۔ دوسری اہلیہ محترمہ تقسیم ہند کے بعد اپنے داماد مفتی جمیل احمد صاحب مفتی جامعہ اشرفیہ کے ساتھ لاہور تشریف لے گئیں جو اس رسالہ کی تالیف تک بقید حیات ہیں۔

حضرت حکیم الامت اصلاح و رشد و ہدایت کے ساتھ خانقاہ امدادیہ کی زینت بنے رہے اور سلسلۂ علالت تو کچھ دنوں پہلے سے شروع ہوگیا تھا اور بڑی اہلیہ کی اجازت سے اہلیہ محترمہ صغری کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ علالت زور پکڑتی رہی۔ مختلف علاج تجویز ہوتے رہے کہ ۱۵ ر رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹ ر جولائی ۱۹۴۳ء یوم دوشنبہ کی صبح ہی سے حضرت فرمانے لگے کہ آج ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔ ظہر کے بعد سے سوء تنفس پیدا ہوگیا فرمایا کہ اتنی تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی۔ لیکن بجائے کراہنے کے لفظ "اللہ" درد کے ساتھ زبان سے نکلتا تھا اور دوشنبہ سہ شنبہ کی درمیانی شب میں ساڑھے دس بجے وصال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا شبیر علی صاحب برادر زادہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت قدس سرہٗ نے گویا متبنی بھی بنا رکھا تھا۔ پیر کی صبح کو سہارن پور دوائیں لینے کے لئے آئے ہوئے تھے، حضرت قدس سرہٗ نے بار بار اُن کو طلب کیا کہ کچھ معاملات فرمانا چاہتے تھے مگر مولانا شبیر علی صاحب مرحوم وصال کے بعد پہنچے اور اُن ہی کی تجویز سے تدفین صبح کے بعد قرار پائی۔ منگل کی صبح نماز سے پہلے سہارنپور آدمی پہنچ گیا۔ اور بھی قرب وجوار میں بجلی کی طرح سے اطلاعیں پہنچ گئیں۔ یہ ناکارہ تو خبر سنتے ہی فوراً اسٹیشن روانہ ہوگیا اور عین گاڑی کی روانگی کے وقت بلکہ چلتی گاڑی میں

سوار ہوگیا اور دس بجے کے قریب تھانہ بھون حاضر ہوگیا۔ لیکن گاڑی کوئی اور تھانہ بھون جانے والی نہیں تھی اس لئے اہل شہر کی مساعی سے تھانہ بھون کے لئے دو اسپیشل یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ پہلا اسپیشل تو ۱۲ بجے کے بعد جب کہ جنازہ عیدگاہ میں تدفین کے لئے لایا جاچکا تھا پہنچ گیا تھا اور کچھ لوگ جو جلال آباد کے اسٹیشن سے اتر کر پیادہ تھانہ بھون بھاگ گئے تھے وہ تو نماز میں بھی شریک ہوگئے اور جو اسپیشل ہی میں گئے وہ دفن میں تو شریک ہوگئے مگر جنازہ میں شریک نہ ہوسکے لیکن دوسرا اسپیشل تدفین کے بعد پہنچا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شیئ الی اجل مسمی کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔

۲۹ر ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ

دوشنبہ

اعلیٰ حضرت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، قدس سرہٗ کا زمانہ بہت پایا، اور حضرت کی شفقتیں بے پایاں، چونکہ حضرت سہارنپوری کے زمانے میں حضرت اقدس کی سہارنپور میں آمد بکثرت ہوتی تھی اور یہ معمول تھا کہ جب بھی سہارنپور کی طرف کو پورب لائن یا پنجاب لائن جانا ہوتا یا وہاں سے واپسی ہوتی تو شباب کے زمانے میں مدرسے تشریف لائے بغیر روانگی نہیں ہوتی تھی بہت ہی شاذ ونادر ایسا ہوتا کہ وقت کی قلت کی وجہ سے مدرسے تشریف نہ لانا ہوا اگر کبھی ایسا ہوتا تو ہم خدام اسٹیشن پر ضرور حاضر ہوا کرتے۔

ایک دفعہ یہ ناکارہ اسٹیشن پر حاضر ہوا۔ بڑا مجمع موجود تھا جب میں نے مصافحہ کیا تو مصافحے کے ساتھ ہی حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اکابر کے یہاں تربیت کے بھی طریق عجیب اور مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اکتساب بھی ایک طریقہ ہے وہ زمانہ بذل المجہود کی اس سیہ کار کی کتابت کا تھا اسی زمانے میں اس ناکارہ کو تھانہ بھون حاضری کی کثرت سے نوبت آتی تھی اس لئے کہ اس زمانے میں بذل المجہود مولانا شبیر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پریس تھانہ بھون میں طبع ہوتی تھی چونکہ بذل کا مسودہ بھی یہی ناکارہ لکھتا تھا اور پندرہ بیس دن میں تھانہ بھون پھر اس کے بعد دہلی طباعت کے لئے بار بار جانے کی نوبت آتی تھی۔ لیکن یہ محض اللہ کا احسان ہے اور میرے حضرت نوراللہ مرقدہ کی توجہ وبرکت کہ جس پریس میں بھی بذل کا کام ہوتا وہ اپنے سب کام چھوڑ کر بذل کا کام شروع کر دیتا تھا۔ تھانہ بھون کے بعد دہلی میں دریبہ کلاں میں ایک ہندوستانی پریس تھا جو کہ بہت بڑا تھا اور اس میں بیک وقت آٹھ

دس مشینیں چلتی تھیں اس کا مالک اور سارا عملہ غیر مسلم تھا مگر اس کے مالک کے دل میں اللہ نے کچھ ایسی محبت ڈال دی تھی کہ میرے پہنچتے ہی وہ اپنے منیجر سے نہایت زور سے یہ کہتا کہ اتنے ان مولانا صاحب کا کام نہ ہو کسی مشین پر کوئی نیا پتھر نہیں چڑھے گا اس کے بھی عجیب قصے ہیں اور بہت ہی مالک کے احسانات لاتعداد لاتحصی ہیں۔

لیکن اس وقت یہ ناکارہ حضرت تھانوی کے حالات لکھوا رہا ہے تھانہ بھون کی طباعت کا قصہ ۳۸ھ یا ۳۹ھ کا ہے۔ تھانہ بھون میں عموماً علی الصباح پہنچتا اس زمانے میں چھوٹی لائن کی گاڑیاں دن رات میں کئی چلتی تھیں۔ گو اب وہ مرحوم ہو چکی ہے اور سالِ رواں میں یکم ستمبر ۷۰ء سے سب بند کر دی گئی ہیں اگرچہ لوگ کہتے ہیں کہ عارضی بند ہوئی ہے اور موٹروں کی کثرت نے اس کو فیل کر دیا ہے۔ سہارنپور تا دہلی میں کئی نوع کی موٹریں سرکاری وغیر سرکاری چل پڑیں اور اس سے زائد ٹیکسیوں کی بھرمار، بہرحال یہ ناکارہ علی الصباح تھانہ بھون پہنچتا اور مولانا شبیر علی صاحب مرحوم حضرت قدس سرہ کی وجہ سے میرے جاتے ہی میری سب کاپیاں چھپوا دیتے اور ظہر کے وقت تک مجھے چھ سات پُروف مل جاتے اور شام تک ان کی واپسی کا تقاضا ہوتا تاکہ اگلے دن ان کی سنگ سازی اور طباعت شروع ہو جائے اس لئے یہ ناکارہ مسجد کے شمالی جانب سہ دری میں رہتا تھا گرمی کا موسم تھا اور اس زمانے میں مجھ ناکارہ کو پسینہ اتنا کثیر آیا کرتا تھا ہر سفر میں ایک پاجامہ بالکل گل جایا کرتا تھا۔ یہاں تو میں پائجامہ پہنتا ہی نہ تھا دو لنگیاں میرے استعمال میں رہتی تھیں جب دو تین گھنٹے میں وہ بالکل بھیگ جاتی تو اس کو دھوپ میں ڈال دیتا اور دوسری استعمال کرتا اور جب دو تین گھنٹے

میں وہ دوسری لنگی بھیگ جاتی تو وہ لے لیتا شب و روز میں سات مرتبہ ٹھنڈے پانی سے غسل کا دستور تھا اور یہاں پائجامہ پہن کر نہیں سوسکتا چونکہ میں اپنے کمرے میں اکیلا ہوا کرتا تھا اس لئے چاروں طرف سے کواڑ لگا کر سو جاتا۔ مگر سفر میں محض لنگی باندھے سونے پر قادر نہیں تھا کیونکہ میرے اندر ایک مرض بچپن سے اب تک یہ ہے کہ جب لنگی باندھ کر سوتا ہوں تو صبح کو کروٹوں میں نہ معلوم کس طرح لنگی پیٹ پر آجاتی ہے اور ٹانگیں کھل جاتی ہیں اس لئے سفر میں ہمیشہ سوتے وقت پائجامہ پہننے پر مجبور رہا لیکن دن میں ہمیشہ لنگی ہی ہوا کرتی تھی۔

تھانہ بھون کی حاضری میں گرمی کی شدت کی وجہ سے میں خالی سہ دری میں کرتہ نکال کر اور پردوں کو بہت غور سے نہایت جھک کر عصر کے وقت تک دیکھتا رہتا اور یہی ظہر سے لے کر عصر تک کا وقت حضرت اقدس حکیم الامت کی عام مجلس کا تھا مجھے اس کا بہت قلق رہتا تھا کہ تھانہ بھون رہتے ہوئے بھی حضرت کی خدمت میں حاضری کا وقت نہیں ملتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ بہت قلق کے ساتھ حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے عرض کیا کہ لوگ تو بہت دور دور سے حاضر ہوتے ہیں لیکن یہ ناکارہ یہاں رہ کر بھی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتا میرے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے ایسا جواب مرحمت فرمایا کہ میری مسرت کے لئے مرنے تک کافی ہے حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب اس کا بالکل فکر نہ کیجئے۔ آپ اگرچہ میری مجلس میں نہیں ہوتے۔ مگر میں ظہر سے عصر تک آپ ہی کی مجلس میں رہتا ہوں میں بار بار آپ کو دیکھتا رہتا ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ کام تو یوں ہوتا ہے میں آپ کو ظہر سے عصر تک اپنے اوراق سے سر اٹھاتے نہیں دیکھتا۔

ایک دفعہ اس سیہ کار نے حضرت سے دریافت کیا کہ شرح صدر کے خلاف کرنے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ حضرت قدس سرہ نے فرمایا کہ اہل نسبت کو شرح صدر کے خلاف نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سے کبھی جسمانی نقصان پہنچ جاتا ہے اس کے بعد فرمایا ایک بزرگ تھے ان کا خیال ہوا کہ فلاں عالم صاحب کی عیادت کرنی چاہئے وہ عالم ہیں چناں ہیں چنیں ہیں، مگر طبیعت نے شدت سے انکار کیا کئی دفعہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ اول تو عیادت سنت اور پھر عالم کی۔ اپنے شرح صدر کے خلاف چل دیئے۔ چند قدم چلے تھے کہ پاؤں پھسل گیا اور گر پڑے۔ لوگ اٹھا کر گھر لے آئے۔ اس سیہ کار کا خیال یہ ہے کہ یہ اونچے لوگوں کی باتیں ہیں جس کا شرح صدر "گفتۂ او گفتۂ اللہ بود" کا مصداق ہو لیکن اس سیہ کار کو باوجود نااہلیت کے اس کا تجربہ بہت ہے کہ جب کوئی شرح صدر کے خلاف سفر کیا یا تو جانے سے پہلے ہی بیمار ہوا۔ یا دوران سفر وغیرہ ہوا اس کو بہت ہی بھگتنا پڑا۔ پھر سفر کے بعد کئی دن خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جب بھی کوئی قصہ پیش آیا تو حضرت تھانوی کا ارشاد یاد آیا۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس سیہ کار سے فرمایا اور میں تنہا ہی حاضر ہوا تھا کہ مولوی زکریا ایک اشکال بہت دن سے پیش آرہا تھا۔ کئی دفعہ اس کو سوچ چکا ہوں کہ دنیا بھر کے سارے پاگل ایک ایک ہو کر میرے ہی پاس کیوں آتے ہیں اور پھر ایک قصہ سنایا کہ ایک حکیم غالباً جالینوس کا نام لیا تھا مجھے اس وقت مغالطہ ہے شاید بقراط ہو۔ وہ جا رہا تھا راستے میں کسی پاگل نے اس کو سلام کر لیا اس حکیم کو بہت ہی فکر ہوا کہ اس پاگل نے مجھے سلام کیا کہیں مجھ میں تو جنون کا اثر نہیں، گھر جا کر غسل کیا اور دافع جنون دوا کھائی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بالکل نہیں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب دام مجدھم بھی ہر وقت یہی فرماتے ہیں کہ سارے پاگل چن چن کر میرے پاس ہی کیوں آتے ہیں حضرت حکیم الامت

قدس سرہ نے فرمایا۔ اچھا! دوسروں کے پاس بھی جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت سب کو یہی شکایت ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تم کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ مجھے تو یہ خیال تھا کہ صرف میرے ہی پاس آتے ہیں۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو مجھ سے بچپن سے بہت محبت تھی اگرچہ آخیر زمانے میں لیگ اور کانگریس کے جھگڑے کی وجہ سے اس میں کمی آگئی تھی[لے] جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے ساتھ اس ناکارہ کے خصوصی تعلق کی بناء پر بار بار میرے شدید ترین کانگریسی ہونے کی شکایات پہنچتی رہتی تھیں۔ اور حضرت حکیم الامت کو کانگریس سے ایسی نفرت تھی جیسی اس سیہ کار کو اسٹرائیک سے۔ چنانچہ جب مجلس دعوۃ الحق حضرت نے قائم فرمائی اس کے ممبران میں کسی نے اس ناکارہ کا نام بھی پیش کیا۔ تو حضرت نے بڑے تعجب سے یہ کہہ کر کہ وہ تو مولوی حسین احمد کا خاص آدمی ہے اس ناکارہ کا نام لکھنے سے انکار کر دیا اور چند روز بعد ہمارے مدرسے کے مفتی اور میرے رشتے کے ماموں مولانا اشفاق الرحمٰن مرحوم جو حضرت تھانوی کے مخصوص خدام میں سے ہیں جب وہاں حاضر ہوئے تو حکیم الامت قدس سرہ نے بڑے استعجاب سے ان سے یہ کہا کہ میری مجلس میں فلاں صاحب نے مولوی زکریا کا نام بھی بتایا ہے تو مولوی اشفاق الرحمٰن نے کہا کہ حضرت وہ تو بغیر تلی کا بُنڈہ ہے۔ ہر ایک کے ساتھ لڑھک جاتا ہے حضرت والا کے ساتھ تعلق اس کو مولوی حسین احمد صاحب سے کم نہیں مگر حضرت قدس سرہ نے سابقہ

لے یہ حضرت شیخ کا تاثر ہے جو اپنی جگہ درست اور سر آنکھوں پر۔ لیکن حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے اگر کبھی حضرت شیخ اس بارے میں استفسار فرما لیتے تو اس عاجز کو یقین ہے کہ اس لفظ کے تحریر کرنے کی نوبت نہ آتی۔ ۱۲

روایات کثیرہ کے مقابلے میں اس کو اہمیت نہ دی[1] اور ان روایات کا محمل بھی صحیح تھا اس لئے کہ حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہ کی تو تقریباً روزانہ نہیں تو ہر دوسرے تیسرے روز آمد و رفت ضرور رہتی تھی اس لئے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا دستور یہ تھا کہ دہلی سے پنجاب یارڈ کی لائن پر جب بھی جانا ہوتا ہے اگر دو گھنٹے کی بھی گنجائش ملتی تو حضرت میرے گھر ہو کر ضرور تشریف لے جایا کرتے اور اس کے علاوہ رئیس الاحرار کا جب بھی رائے پور آنا جانا ہوتا تو میرے پاس ضرور قیام ہوتا۔ ایسے ہی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی جب رائے پور کی آمد و رفت ہوتی یا مستقل لوگ انہیں سہارنپور بلاتے تو ہر صورت میں قیام کثیر و قلیل جتنا ہوتا میرے گھر پر ہوتا۔

عطاء اللہ شاہ بخاری کا تو مشہور مقولہ تھا کہ کچا گھر (یعنی میرا گھر) جو اس زمانے میں بالکل کچا تھا اور اسی نام سے اب تک مشہور ہے۔ مشترک پلیٹ فارم ہے ساری گاڑیاں اسی پلیٹ فارم سے گذرتی ہیں۔ کبھی کہتے یہ تو جنکشن ہے ساری گاڑیاں اسی اسٹیشن پر ہو کر گزرتی ہیں لیگ کی ہو یا احرار کی کانگریس کی ہو یا جمعیت کی۔

شاہ صاحب مرحوم کی ابتدائی آمد کا بھی ایک عجیب لطیفہ ہے سب سے پہلی آمد جو

---

[1] غالباً حضرت شیخ نے یہ لفظ اس لئے تحریر فرما دیا کہ حضرتؒ نے مولانا اشفاق صاحبؒ کی گفتگو کے بعد بھی حضرت شیخ کا اسم گرامی داخل مجلس دعوۃ الحق نہ فرمایا۔ ورنہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کا معمول یہ تھا کہ صرف کسی کی روایت کی وجہ سے کسی سے بدظن نہیں ہوتے تھے اور نہ متاثر ہوتے تھے۔ اگر ایسی روایات کثرت سے پہنچتیں اور اندیشہ سوءِ ظنی کا ہوتا تو جب تک صاحب معاملہ سے منہ در منہ بات نہ کرا لیتے، ہرگز متاثر نہ ہوتے۔ پھر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے بھی حضرت کو باوجود سیاسی اختلاف کے، تعلق تھا، محبت تھی۔ چنانچہ مولانا عبدالباری

باقی حاشیہ ص ۲۱۵

ان کی اہم جلسے میں ہوئی (اور جس کی تاریخ میرے رجسٹر میں درج ہوگی) سہارنپور کے لوگوں نے بہت اصرار، تمنائیں، درخواستیں ان کو بلانے کی کیں اور جب انہوں نے سہارنپور پہنچنے کا وعدہ کرلیا تو وہ چونکہ رئیس البغاۃ تھے گورنمنٹ کی نگاہ میں بہت مخدوش، اب مسئلہ یہ مشکل ہوا کہ ان کا قیام کہاں ہو؟ اس لئے کہ ان کو ٹھہرانا ہر شخص کو مخدوش معلوم ہوتا تھا اور یہ ڈر تھا کہ ان کے ساتھ میں بھی نہ گرفتار ہو جاؤں۔ اس واسطے جتنے بلانے والے تھے۔ وہ سب مل کر (ایک وفد) حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ شاہ صاحب چناں ہیں چنیں ہیں، ہمارے مکانات ان کی شان کے مناسب نہیں ہیں۔ مدرسے ہی ان کی شان کے مناسب ہے ناظم صاحب کی ایک ادا تھی وہ نہایت بے تکلفی سے بلا جھجک یہ کہہ دیتے تھے کہ اتنے میں شیخ الحدیث سے بات نہ کروں اتنے کچھ نہیں کرسکتا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ انہیں ابھی بلالیجئے۔ ناظم صاحب نے فرمادیا کہ یہ وقت ان کی مشغولی کا ہے۔ شام کو خبر لے لیں۔ ان لوگوں کے جاتے ہی حضرت ناظم تشریف لائے اور فرمایا کہ فلاں فلاں آئے تھے بہت اصرار اس پر کر رہے ہیں کہ شاہ صاحب کا قیام مدرسے میں رہے میں نے عرض کر دیا کہ آپ ان سے بے تکلف میری طرف سے کہہ دیجئے کہ مدرسے میں ان کا قیام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مدرسے کو ان کے قیام سے نقصان کا اندیشہ ہے البتہ کچے گھر میں ہوسکتا ہے۔ اس لئے یہ تو ہے ہی باغیوں کے لئے ٹھکانا۔

حضرت مدنی کا قیام تو ہر وقت کا تھا رئیس الاحرار کی بھی کثرت سے آمد و رفت تھی میری شاہ صاحب سے اس سے پہلے کوئی ملاقات نہ تھی نام طرفین کا ایک دوسرے نے سن رکھا تھا میں نے ان دعوت دینے والوں کو یہ بھی کہا کہ جب تمہارا حوصلہ ٹھہرانے کا

(حاشیہ) ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کو حضرت مدنی کی خدمت میں بغرض اصلاح و بیعت حاضر ہونے کی ہدایت فرمائی۔ وغیرہ۔ نجم الحسن تھانوی۔ ۱۲

نہیں تھا تو دعوت دینے کی کیا مصیبت پڑ رہی تھی؟ شاہ صاحب تشریف لائے اور ان کی آمد پر بڑا جلوس نکالا اور وہ جلوس ان کو مدرسے تک لایا۔ جب مدرسے میں پہنچے تو ناظم صاحب نے ان سے کہہ دیا شاہ صاحب کے سامنے ہی۔ کہ شاہ صاحب کا قیام تو شیخ الحدیث صاحب کے مکان پر طے ہوا ہے۔ شاہ صاحب میرا نام تو پہلے ہی سنے ہوئے تھے اور جنہوں نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں وہ خوب واقف ہیں کہ ان کو تعریف اور مذمت دونوں میں کمال کا درجہ حاصل تھا۔ اللہ ان کو بلند درجات عطا فرمائے اس زور و شور سے میرے گھر قیام پر مسرّت کا اظہار فرمایا کہ کچھ انتہا نہیں۔ ہوشیار تھے، سمجھدار تھے، دنیا کو دیکھے ہوئے تھے، جلوس تو ختم ہو گیا وہ چند آدمیوں کے ساتھ میرے مکان پر تشریف لے آئے اور میرا مکان اس زمانے میں اسم بامسمّیٰ کچا گھر تھا صرف ایک کوٹھری تھی وہ بھی کچّی، شاہ صاحب مع سامان آ کر بوریئے پر بیٹھ گئے۔ اول تو انہوں نے میری تعریف میں آسمان کے قلابے ملائے۔ اس کے بعد میرے مکان کی تعریفیں شروع کیں کہ نانے ابا صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کی یاد تازہ ہو گئی۔ حضرت کیا عرض کروں؟ کتنی مسرت اس مکان کو دیکھ کر ہوئی، اسلاف کا دور آنکھوں میں پھر گیا چناں چنیں، یہ، وہ۔ پھر کہنے لگے حضرت یہ لوگ مجھے شوق میں تو بلا لیتے ہیں، مگر مجھے ٹھہراتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اسی واسطے میں جاتے ہوئے بہت انکار کرتا لیکن جب وعدہ کر لیتا ہوں تو ان بلانے والوں کو نانی یاد آتی ہے کہ اس باغی کو کہاں ٹھہرادیں۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی، خوش بختی، نہ معلوم کیا کیا کہا کہ جب میں دیوبند جاتا ہوں۔ تو بھی وہاں کے شیخ الحدیث حضرت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کا مکان میری قیام گاہ تجویز ہوتی ہے اور یہاں کے شیخ الحدیث کا مکان میری خوش قسمتی سے میری قیام گاہ تجویز ہوا۔ قیام تو ان کا

میرے ہاں برائے نام ہی ہوا۔ اس لئے کہ تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ کہیں کسی صاحب کے یہاں دعوت میں چلے گئے۔ وہاں سے لوگ اپنے اپنے یہاں لئے پھرے پھر جلسہ ہو گیا کچھ معمولی کھانے پینے کی تواضع میں نے بھی کی اس کے بعد کئی دفعہ رائے پور آتے جاتے قیام ہوا۔

یہ سب روایات حکیم الامت قدس سرہ تک پہنچتی رہتی تھیں اس لئے میرا کانگریسی یا جمعیتی ہونا حضرت قدس سرّہ کے ذہن میں بہت مستحکم تھا[1] کچھ دنوں بعد جناب الحاج شیخ رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھانہ بھون حاضر ہوئے جو حضرت حکیم الاُمت کے یہاں بہت معتمد اور اونچے سمجھے جاتے تھے دہلی کی لیگ کے صدر تھے مسٹر جناح کے خاص دوست اور حضرت تھانوی قدس سرّہ کی مجلس دعوت الحق کے رکن رکین، حضرت قدس سرّہ نے بہت ہی استعجاب سے شیخ جی سے یہ کہا کہ فلاں شخص نے مجلس میں مولوی زکریا کا نام بھی پیش کیا مجھے بہت تعجب ہوا۔ وہ تو مولوی حُسین احمد کا خاص آدمی ہے[2] تو شیخ جی نے بہت زور سے نام پیش کرنے والے کی تائید کی اور عرض کیا کہ حضرت میں تو ان

---

[1] یہاں بھی حسب سابق یہی عرض کرنا ہے کہ کاش! حضرت شیخ اس امر میں حضرت تھانوی قدس سرّہ سے استفسار فرما لیتے۔ ۱۲

[2] حضرت تھانوی قدس سرہ کے اس جملے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ حضرت مدنی سے خصوصی تعلق ہے اس لئے حضرت شیخ کو مجلس کا کام کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ ورنہ شیخ رشید احمد صاحب مرحوم کی وضاحت کے بعد کسی قسم کی غلط فہمی باقی رہ جانے کا کوئی امکان نہیں۔ ۱۲۔ نجم الحسن تھانوی

کا نام خود ہی پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ان کو مولانا حسین احمد صاحب سے جتنا بھی تعلق ہو لیکن جناب والا سے بھی عقیدت کم نہیں ہے اور جتنا کسی کا انگریسی یا جمعیتی سے تعلق ہو، اس سے زیادہ مجھ سے ہے میں اس سے خوب واقف ہوں، مگر چونکہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے پاس روزانہ حضرت مدنی کی آمد اور میری حضرت مدنی قدس سرہ کے ساتھ قرب وجوار کے اسفار میں معیت خوب پہنچتی رہتی تھی اور پہنچانے والے بھی حواشی سے پہنچاتے تھے چنانچہ ایک صاحب نے اللہ انہیں معاف کرے۔ حضرت تھانوی قدس سرہ کی مجلس میں اس سیہ کار پر یہ افتراء کیا کہ وہ تو یوں کہتا ہے کہ تھانہ بھون جا کر کیا کرو گے[1]۔ دیوبند حضرت مدنی کی خدمت میں جاؤ۔ جن صاحب نے مجھ سے یہ نقل کیا، وہ حضرت کی مجلس میں اس وقت موجود تھے اور حضرت کے خاص لوگوں میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے بہت ہی اس روایت پر قلق ہوا اور اس پر تعجب بھی ہوا کہ اکابر کے حاشیہ نشین اس قدر دروغ گو بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے تمہارا حضرت تھانوی

---

[1] یقین ہے کہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس روایت واحد کا ہرگز کوئی اثر نہیں لیا ورنہ وہ اپنے اصول کیمطابق حضرت شیخ سے ضرور پوچھتے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت کا اصول ہی یہ تھا (جس کے خلاف وہ کرتے ہی نہ تھے) کہ جب کوئی شخص کسی کی شکایت کرتا، تو اگر اس سے متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا تو اس شکایت کرنیوالے سے پوچھتے کہ یہ بات تم ان کے سامنے کہہ سکتے ہو؟ اگر وہ آمادہ ہو جاتا تو آمنا سامنا کرانے کا اہتمام فرماتے اور آمنا سامنا ہونیکے بعد اگر دوسرا شخص انکار کر دیتا کہ میں نے ایسا نہیں کہا، تو پھر بھی فرماتے تھے کہ میں یہی سمجھتا ہوں کہ شکایت کرنے والے کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر وہ سامنا کرنے کو تیار نہ ہوا تو پھر جس کی شکایت کی ہے اس سے بدظن نہیں ہوتا۔ نجم الحسن تھانوی۔

کے ساتھ تعلق عرصے سے معلوم ہے میں نے تردید کا ارادہ بھی کیا مگر جرأت نہ ہوئی غرض اسی قسم کے واقعات حضرت حکیم الامت قدس سرّہ کو کثرت سے پہنچتے رہتے تھے جن کی بنا پر اس سیہ کار کو حضرت مدنی کے خاص لوگوں میں سمجھنا بے محل نہیں تھا اور حضرت مدنی قدس سرہ کے ساتھ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کا اس زمانے میں مسلک کا شدید اختلاف تھا اس سلسلے میں کئی رسالے اس زمانے میں شائع ہوئے تھے جس میں سے ایک رسالہ البوادر النوادر شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس لئے جس شخص کا بھی حضرت مدنی قدس سرہ سے خصوصی تعلق معلوم ہوتا تھا وہ حضرت حکیم الامت قدس سرّہ کے یہاں پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر ان حضرات اکابر کا آپس کا اختلاف ہم جیسے نااہلوں کا اختلاف نہیں تھا بلکہ اس نوع کا اختلاف تھا جس کی نظیر جنگ جمل[1] جنگ صفین میں گذر چکی ہے اور اس کے متعلق میں مفصل کلام اپنے رسالے اعتدال میں کر چکا ہوں۔

جب یکم محرم الحرام ۱۳۵۰ھ میں سول نافرمانی اور قانون شکنی کے جرم میں مظفر نگر

---

[1] اسی لئے اس عاجز کو یہ اصرار ہے کہ حضرت تھانوی قدس سرّہٗ کو حضرت مدنی قدس سرہٗ سے باوجود شدید سیاسی اختلاف کے تعلق تھا اور خود حضرت تھانوی قدس سرہ کے خدام میں بہت سے ایسے تھے جن کو حضرت مدنی قدس سرہ سے بھی والہانہ تعلق تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جو لوگ اپنے بچوں کے لئے حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے مشورہ لیتے کہ کہاں بھیجیں تو سہارنپور کے مدرسہ میں بھیجنے کا مشورہ دیتے لیکن اگر کسی نے اپنے بچے کو بغرض تعلیم دیوبند کے مدرسے میں بھیجا تو بھی اس سے نہ کوئی باز پرس کی اور نہ کسی قسم کی ناگواری کا اظہار فرمایا اور نہ تعلق اور برتاؤ میں کوئی فرق آیا۔ ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ نجم الحسن تھانوی۔۱۲۔

کے اسٹیشن پر سے حضرت مدنی کو گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو اس کی اطلاع ملی تو ظہر سے عصر تک کی مجلس میں حضرت مدنی کی گرفتاری پر نہایت ہی رنج و غم اور قلق کا اظہار فرماتے رہے اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس کا احساس نہیں تھا کہ مجھے حسین احمد سے اتنا تعلق ہے[1] اور جب کسی شخص نے حاضرین مجلس میں سے یہ عرض کیا کہ حضرت گورنمنٹ نے کوئی ظلم تو نہیں کیا اس نے دہلی کے داخلے پر پابندی لگائی تھی وہ تو خود ہی قانون شکنی کے لئے تشریف لے گئے۔ تو حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ آپ اس فقرے سے مجھے تسلی دینا چاہتے ہیں حضرت امام حسین بھی تو یزید کے مقابلے کے لئے خود ہی تشریف لے گئے تھے۔ یزید نے ان کو زبردستی قتل نہیں کیا تھا۔ لیکن امام حسین کا غم تو ساری دنیا آج تک نہیں بھولی ...... میں بھی کہاں سے کہاں چلا گیا۔ لکھ تو یہ رہا تھا کہ ابتداء حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو اس سیہ کار سے بہت ہی تعلق محبت اور شفقت تھی میری ابتداء سہارنپور کی حاضری میں حضرت قدس سرہٗ نے میرا ایک امتحان بھی لیا۔ اس شعر کا مطلب پوچھا تھا۔

اگر بر جفا پیشہ بشتافتے　　　　که از دست قہرش اماں مافتے

میں نے فوراً مطلب بتا دیا تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ نے یہ فرمایا کہ آپ نے سمجھا ہوگا کہ کسی جاہل کا پڑھایا ہوا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا، کیوں نہیں ماشاء اللہ آپ کے عالم ہونے میں کیا شک ہے۔ میرے والد صاحب کا برتاؤ حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کے ساتھ بہت ادب کا تھا حضرت سہارنپوری کی

---

[1] یہ بھی فرمایا کہ جب سے مولوی حسین احمد کی گرفتاری کی خبر ملی ہے، کھانا حلق سے نہیں اترتا (مطلب یہ کہ شدید صدمہ ہے)۔ نجم الحسن تھانوی۔

طرف تو حضرت قطب عالم حضرت گنگوہی کے وصال کے بعد ہی رجوع کر لیا تھا اور اجازت و خلافت بھی انہی سے ملی تھی۔ لیکن اعلیٰ حضرت رائے پوری سے محبت ابتدائً سے زیادہ تھی۔ اور ابتداً بے تکلفی بھی بہت تھی لیکن کچھ عرصے ہی بعد حضرت قطب عالم گنگوہی کی طرف سے ایک صاحب کشف قبور نے یہ پیغام دیا تھا کہ مولوی یحیٰ سے کہہ دیجئے کہ مولانا رائے پوری کے ساتھ بے تکلفی نہ کیا کریں اس وقت سے کچھ احترام شروع ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت حکیم الاُمت قدس سرّہ کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ اخیر تک رہا اور بہت زیادہ، جو ہم جیسے بچوں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور فقرے نقل کرانے بھی مشکل ہیں اسی کا اثر تھا کہ حضرت حکیم الاُمت کے ساتھ بہت ہی محبت اور تعلق تھا۔ میرے والد صاحب کے حضرت حکیم الاُمت کے ساتھ بے تکلفی کے واقعات بہت زیادہ ہیں۔ دو لکھواتا ہوں۔ ایک مرتبہ میرے والد صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ افطار کا وقت ہوا۔ حضرت تھانوی سے پوچھا کہ آپ کے یہاں افطار کا کیا دستور ہے حضرت حکیم الاُمت نے فرمایا کہ گھنٹے اور جنتریوں کے بعد میں شرح صدر اور اطمینان کے لئے انتظار کرتا ہوں۔ میرے والد صاحب نے گھڑی دیکھی اور آسمان کی طرف اِدھر اُدھر دیکھا اور افطار شروع کر دیا اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے خدام نے بھی شروع کر دیا اور حضرت اقدس تھانوی اور اُنکے خدام انتظار میں رہے۔ ایک دو منٹ کے بعد حضرت تھانوی قدس سرّہ نے ارشاد فرمایا کہ اتنے میرا شرح صدر ہوگا اتنے یہاں تو کچھ رہنے کا نہیں۔

تراویح کے بعد حضرت تھانوی نے میرے والد صاحب سے پوچھا کہ مولانا سحر کا کیا معمول ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ ایسے وقت پر ختم کرتا ہوں کہ دن بھر یہ خیال رہے کہ روزہ ہوا کہ نہیں (یہ تو مبالغہ تھا ورنہ دو تین منٹ صبح صادق سے پہلے ختم کرنے کا معمول

تھا) حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا کہ میرا صبح صادق سے ایک گھنٹہ قبل فارغ ہونے کا ہے والد صاحب نے کہا کہ آپ اپنے وقت پر کھالیں۔ میں اپنے وقت پر ڈیڑھ دو دن کا روزہ میرے بس کا نہیں حضرت تھانوی نے فرمایا یہ تو نہیں ہوگا۔ کھاویں گے تو ساتھ ایسا کریں کہ ایک دن کے لئے آپ کچھ مشقت اٹھالیں

——— اور ایک دن کے لئے میں آپ کی خاطر مشقت اٹھالوں اس پر فیصلہ ہوا کہ پون گھنٹے پہلے شروع کر دیا جاوے تاکہ پندرہ بیس منٹ کھانے میں لگیں اور تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے فراغت ہو جائے۔

والد صاحب کی اس بے تکلفی کا ایک اور واقعہ لکھواتا ہوں کہ جب اعلیٰ حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ ۱۳۳۳ھ میں طویل سفر حجاز کے لئے تشریف لے گئے تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنی اسی بے تکلفی کے سلسلے میں جو نہایت ہی زیادہ تھی اور اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ اب تک تو آپ حضرت سہارنپوری قدس سرہ کی وجہ سے رڑکی یا پنجاب جاتے ہوئے بہت اہتمام سے مدرسے تشریف لاتے تھے لیکن اب حضرت تو طویل قیام کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے۔ اور یہ میری بہ نسبت آپ کو سفر آسان ہے اس لئے اب آپ کو ہر ماہ میری زیارت کے لئے سفر کرنا ہوگا اور حکیم الامت قدس سرہ نے اس تعلق اور بے تکلفی کی بنا پر تحریر فرمایا کہ بڑی خوشی سے، لیکن چند شرائط ہیں، جب میں کہیں آگے جا رہا ہوں گا، تب تو میرا کرایہ اس کے ذمہ ہوگا جہاں میں جا رہا ہوں گا

——— لیکن جس ماہ میں آگے جانا نہیں ہوگا، اور صرف آپ کی ملاقات کے لئے سہارنپور آؤں گا، تو میرا اور میرے ایک رفیق سفر کا آمد و رفت کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ آپ کو دینا ہوگا، اور جب میں واپس آؤں گا تو ایک مٹی کی ہانڈی میں ماش

کی دال ناشتے میں دینی ہوگی اور وہ ہانڈی واپس نہیں ہوگی، حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو ماش کی دال بہت پسند تھی، یہاں میں نے دیکھا کہ حضرت قدس سرہٗ کی تشریف آوری پر دسترخوان پر بہت ہی لذیذ چیزیں جمع ہوتی تھیں، فیرنی بھی، شاہی ٹکڑے بھی، مگر حضرت قدس سرہٗ اڑد کی دال کی رکابی لے کر اس کو فیرنی کی طرح چمچے سے نوش فرماتے، بعض مرتبہ تو میں نے دیکھا کہ روٹی کے صرف ایک دو لقمے کھا کر نہ پلاؤ کھائی نہ فیرنی کھائی، اڑد کی دال کی دو تین رکابیاں فیرنی کی طرح کھالیں، یوں ارشاد فرمایا کرتے کہ اپنے گھر میں جب دو تین روز ماش کی دال نہ پکتی تو میں مطالبہ کرتا کہ اللہ کی ہر نعمت پکتی رہتی ہے، اُڑد کی دال نہیں پکتی،

میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے دور میں تو اس معاہدے پر دو تین بار عمل ہوا، لیکن اس گستاخ و بے ادب نے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کے وصال کے بعد اعلیٰ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کو اپنی حماقت سے لکھا کہ حضرت والد صاحب کے اس وعدے میں میراث جاری ہوگی یا نہیں؟ اعلیٰ حضرت نے تحریر فرمایا کہ ضرور ہوگی، حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا یہ والا نامہ میرے اکابر کے خطوط میں موجود ہے، مگر اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، اس پر عمل کی تو نوبت میرے ساتھ نہیں آئی، البتہ ایک اہتمام اس سیہ کار کی طرف سے چند سال تک رہا، کہ ماش کی دال جب تک میری والدہ حیات رہیں، میں تشریف بری پر پیش کر دیتا اور ایک اہتمام حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے کئی سال تک مسلسل رہا کہ یہاں کی تشریف آوری پر اگر کوئی شخص حضرت کی دعوت کرتا جس کے واسطے اس کو بہت پہلے سے خط لکھنا پڑتا، کہ معلوم ہوا کہ حضور کی تشریف آوری فلاں وقت ہو رہی ہے، اگر حضور والا مکان پر قدم رنجہ فرمادیں، تو زہے عزت، ورنہ میں

کھانا مدرسہ ہی میں پہنچا دوں گا، حضرت قدس سرہٗ کا جواب یہ ہوتا کہ میں مستقل مہمان مولوی زکریا کا ہوں، تم ان سے اجازت لے لو، اور جو مجھ سے اجازت لیتا تو میں اسی بڑی عادت کے موافق جو مہمان کے متعلق میری ہے، اجازت تو ضرور دے دیتا، اگرچہ میرا دل بالکل نہیں چاہتا تھا، لیکن اس خوف سے کہ مبادا حضرت کو تشریف بری میں دقت ہو، یہ شرط کر لیتا کہ کھانا مدرسہ قدیم میں آوے، حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کا نام میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے بعد برفی رکھ رکھا تھا، جب میں حاضر ہوتا، تو نہایت تبسّم کے ساتھ لذّت کے ساتھ برفی کا لفظ دو دو دفعہ فرما کر وعلیکم السلام فرمایا کرتے،

اس کا شان نزول یہ ہے کہ جب میں کاندھلہ جاتا تھا تھانہ بھون کے اسٹیشن پر گزر ہوتا اور اسٹیشن پر سے کوئی شخص حضرت قدس سرہٗ کی زیارت کے لئے جانے والا ہوتا تو میں ریل پر سے خرید کر اس کے ساتھ تین چار سیر برف بھیج دیتا، لیجانے والا اپنے کسی کپڑے میں لپیٹ لیتا، وہاں پہنچ کر پیش کرتا اور اپنا کپڑا دھوپ میں ڈال دیتا، وہ سوکھ جاتا، ایک مرتبہ ایک مخلص حاجی محمد جان صاحب محلہ نئے بانس کی مسجد کے امام تھانہ بھون کے اسٹیشن پر اترے، میں نے اپنی حماقت سے حسب عادت ان کو برف دے دیا، اور یہ نہ دریافت کیا کہ آپ کے پاس کوئی کپڑا ہے یا نہیں، ان کے پاس، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، کوئی کپڑا تو تھا نہیں، کسی کا غذیا پتے پر رکھ کر کھلا ہوا لے گئے۔ ان بے چاروں کا ہاتھ بھی ٹھٹھر گیا ہوگا، ایسی حالت میں جب وہ خانقاہ پہنچے اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا، تو حضرت قدس سرہٗ نے دریافت فرمایا کہ اسی طرح اسٹیشن سے لا رہے ہو، انہوں نے عرض کر دیا حضرت کوئی کپڑا تھا نہیں، حضرت کو جلال آگیا کہ تمہارے

پاس کوئی کپڑا تھا نہیں، تو اس سے عذر کیوں نہ کر دیا، یہ اسٹیشن سے یہاں تک آتے ہوئے جتنا گلا ہے وہ کس کا گیا، ان بے چاروں کے عتاب کا جب خیال آتا ہے تو مجھے بہت رنج ہوتا ہے کہ میری وجہ سے ان پر ڈانٹ پڑی اور میرا نام کئی سال تک برفی رہا۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مدرسے کے ایک ملازم کے متعلق جو حضرت ناظم صاحب کے عزیز بھی تھے مجھے راز میں ایک خط لکھا اور یہ قصہ چونکہ ان کے عزیز کا تھا، اس لئے یہ بھی لکھ دیا کہ مولوی عبداللطیف صاحب کو اس خط کی خبر نہ ہو تو زیادہ اچھا ہے، مبادا ان کو تکلیف ہو، بشرطیکہ یہ تغیر آپ اپنی رائے سے کر سکتے ہوں، میں اس زمانے میں نظامت اور مدرسے پر جتنا حاوی تھا، وہ تو اس زمانے کے سب ہی آدمیوں کو معلوم ہے، میں اپنی تجویز سے تغیر بالکل بے تردد کر سکتا تھا، اور اس پر ناظم صاحب کو کوئی گرانی بھی نہ ہوتی، مگر میں نے ناظم صاحب سے عرض کیا کہ آپ سے راز میں ایک خط ہے، میرے پاس جو آپ کو دکھلانا ہے اور عمل مجھے کرنا ہے، حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا، ضرور یہ تغیر کر دو، اس کو تو میرا بھی دل چاہتا ہے، مگر تم سے مشورے کا سوچ رہا تھا، موقع نہیں ہوا تھا، اب تو مؤکد ہو گیا، میں نے ایک حکم نامہ لکھ دیا کہ فلاں صاحب کو فلاں جگہ منتقل کر دیا جائے، حضرت ناظم صاحب نے اس پر دستخط فرما کر لکھ دیا کہ ضرور کر دیا جائے، حضرات سرپرستان سے منظوری لے لی جائے گی، صاحب قصہ بے چارے ہمیشہ ہی مجھ سے ناراض رہے اور ان کی ناراضی بجا ہے، کہ وہ تفصیل سے ناواقف اور میرے پاس وہ راز ہے، میں کیسے ظاہر کرتا۔

یہ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ ان اکابر اربعہ کے درمیان میں حضرت سہارنپوری،

حضرت شیخ الہند اور اعلیٰ حضرت رائے پوری اور حضرت حکیم الامت تھانوی اعلی اللہ مراتبہم ونور اللہ مراقدہم کے یہاں جب ایک دوسرے کے یہاں کوئی مہمان ہو تو گویا عید آتی، ایک مرتبہ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ تھانہ بھون تشریف لے گئے یہ سیہ کار بھی ہمراہ تھا، حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تھانہ بھون کے ایک معروف ومشہور معمر بزرگ کو ان کی علوئے شان کی وجہ سے بلالیا اور کھانے میں اتنی انواع تھی کہ لا تعد ولا تحصی مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے، ان صاحب نے اس دعوت پر بڑی سخت تنقید اپنی مجالس میں کی، کہ یہ علماء سادگی اور زہد پر تقریریں تو ایسی ایسی لمبی کریں، میں نے رکابیاں گنیں، صرف چار آدمی تھے، اور اتنی رکابیاں تھیں مجھے صحیح تعداد یاد نہیں، باسٹھ یاد پڑتا ہے، آٹھ دس طرح کی تو چٹنیاں اور اچار تھے، کئی طرح کے مربّے، کئی طرح کے سالن چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں، حضرت تھانوی کو ان کی تنقید اور عیب جوئی پر قلق بھی ہوا، اپنی مجالس میں اس پر رنج بھی فرمایا کہ میں نے تو ان کا اعزاز کیا اور وہ رکابیاں گننے ہی میں رہے، میرے حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا جو مجھے اب تک بھی خوب محفوظ ہے کہ حضرت یہ تکلف میں نے نہیں کیا، آپ نے کرایا، اگر حضرت کی تشریف آوری جلدی جلدی ہو تو پھر اتنا تکلف کیوں ہو یہ سارا واقعہ حضرت کے کسی ملفوظ میں بھی طبع ہو چکا ہے،

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا معمول ہم مخصوص خدّام کے ساتھ یہ تھا کہ اگر ہم دو تین ہوتے تو زنانہ مکان میں کھانا ہوتا، ایک مرتبہ یہ ناکارہ اور حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ مہمان تھے، اور چھوٹے گھر میں مغرب کے بعد کھانے کے لئے حاضر ہوئے حضرت قدس سرہٗ خود ہی اندر سے کھانا لا رہے تھے، اور مجھے بہت ہی شرم آ رہی تھی۔

ایک دفعہ یہ ناکارہ اور حضرت ناظم صاحب حاضر خدمت ہوئے، حضرت قدس سرہٗ نے کھانے سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے ٹھنڈا پانی پیا، اور کھانے کے وقت میں فرمایا کہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کو دل چاہ رہا تھا، اسی لئے قصداً بغیر پیاس کے ٹھنڈا پانی پیا تھا کہ شاید بھوک لگ جائے، مگر اس سے بھی نہ لگی، اس لئے ساتھ کھانے سے تو معذور ہوں، اسی وقت پہلی دفعہ یہ بات معلوم ہوئی کہ ٹھنڈے پانی کو بھوک کے لگنے میں خاص دخل ہے، میرے استفسار پر حضرت نے اس کی تصدیق کی اور فرمایا کہ ٹھنڈے پانی کو بھوک کے لگنے میں خاص دخل ہے، ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ نے اس ناکارہ سے ازراہ شفقت یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ تم میرے یہاں کے قوانین سے مستثنیٰ ہو، اس کے باوجود یہ ناکارہ خانقاہ کے قوانین کا حتی الوسع بہت اہتمام کرتا تھا، اس لئے حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور حضرت میرٹھی کے یہاں جب بھی بلا اطلاع کھانے کے وقت میں جانے کی نوبت آتی بلا بھوک ایک دو لقمے ضرور کھا کر جاتا، اور حضرت کے استفسار پر کہ آپ نے آج صبح ہی کھالیا تھا، میرا یہ جواب ہوتا کہ حضرت رات کو کھانے کی نوبت نہ آئی تھی، اس لئے صبح کو کھالیا تھا، بذل کی طباعت کے زمانے میں اکثر ایک دو شب قیام کی نوبت آتی، اور حضرت قدس سرہٗ نے کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ کھانا گھر سے آجایا کرے گا، مگر میں نے بہت ہی ادب اور اصرار سے اس کی اجازت لے لی تھی کہ حضرت میں خانقاہ کے مہمانوں کی طرح سے اپنے کھانے کا انتظام طباخ کے یہاں کرلوں تو مجھے اس میں زیادہ راحت رہے گی، تو حضرت نے قبول فرمالیا تھا، ایک لڑکا تھا، اس کے گھر والے خانقاہ کے مقیمین اور واردین کا کھانا بڑے ہی شوق اور محبت سے پکایا کرتے تھے، وہ دو تا تین آنے فی خوراک لیا کرتا تھا، پانچ چپاتیاں اور ایک سالن دال یا بھجی یا لوکی،

تھانہ بھون میں گوشت بہت کم ملتا، ہفتے میں دو تین دن ہوتا تھا لیکن اس ناکارہ کا وہ دور تھا۔ کہ جس میں بغیر گوشت کے روٹی نہیں کھا سکتا تھا، میں نے اس سے یہ طے کرلیا کہ دو خوراک مستقل میری جب تک میں وہاں رہوں، اس میں خانقاہ کا وہی کھانا جو دو آدمیوں کا وہاں کے معمول کے مطابق ہوتا، وہ ہوتا تھا، اور اس کے ساتھ ہی میں نے آدھ سیر گوشت فی وقت اپنا علیحدہ پکوانا تجویز کرلیا تھا جس میں سارے سامان کے دام میرے اور پکوائی کی اجرت ۴/ آنے فی وقت علیحدہ،

میں نے مولوی شبیر علی مرحوم سے کہا کہ یہاں کا قانون تو یہ ہے کہ دو آدمی مل کر کھانا نہ کھاویں اور میری عادت یہ ہے، کہ میں نے اکیلا کھایا ہی نہیں، انہوں نے فرمایا اللہ ان کی مغفرت فرماوے، بلند درجات عطا فرماوے، ان سے اس زمانے میں بے تکلفی بھی بڑھی ہوئی تھی، ان کا بھی لڑکپن تھا، اور اس ناکارہ کا بھی ہنسی مذاق بہت ہوتا تھا، انہیں اشعار بھی بہت یاد تھے، حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے دولت خانہ پر تشریف لے جانے کے بعد ہمارے یہاں شعر و شاعری بھی ہو جاتی، اور اتفاق سے اگر عالی جناب حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب کی تشریف آوری ہوتی، پھر تو پوچھنا ہی کیا، مولوی شبیر علی صاحب نے فرمایا کہ تو فکر نہ کر، بڑے ابّا کے گھر تشریف لے جانے کے بعد دونوں وقت، میں اور بھائی ظفر تیرے ساتھ کھایا کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوتا، مولانا شبیر علی صاحب مرحوم اور مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان نے بھی بار بار اصرار فرمایا کہ تیرے انتظام سے ہمیں گرانی ہوتی ہے، مگر میں نے کہدیا کہ اگر ایک دو دن کی مہمانی ہوتی تو میں کبھی بھی خود انتظام نہ کرتا لیکن یہ تو مستقل روز مرّہ کی آمد ہے، اس میں دوسرے کے سر پڑنا مجھے بہت گراں ہے، اور اس میں کچھ تھانہ بھون کی خصوصیت نہیں، میری شروع ہی سے اب تک

یہ عادت ہے کہ دو چار دن کی مہمانی میں تو کچھ اشکال نہیں ہوتا لیکن مستقل کسی دوسرے کے ذمّے پڑجانا میری غیرت نے کبھی گوارہ نہیں کیا، اگر کہیں میں قیمتاً انتظام کرنے پر قادر نہ ہوا تو میں نے ہدیہ یا کسی دوسرے عنوان سے اس میں اس رقم سے چوگنا ضرور کر دیا، جو مجھ پر خرچ ہوئی ہو، اللہ تعالیٰ ہی کھانے پکانے والے مخلص دوست کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔

تھانہ بھون میں روزانہ گوشت نہیں ہوتا تھا لیکن جلال آباد میں روزانہ ہوتا تھا، اس لئے وہ میرے لئے ہمیشہ جلال آباد سے گوشت منگوا کر پکواتا، اور اگر کسی دن وہاں سے بھی نہ ملتا تو مُرغا کٹواتا، اللہ جل شانہ اسے بہترین اگر زندہ ہو تو دارین کی ترقیات سے نوازے، اور چل دیا ہو تو مغفرت فرما کر بلند درجات عطا فرمائے، اس قدر میرے کھانے کا اہتمام کرتا کہ میرا جی خوش ہوتا، میں کبھی کبھی اس کو انعام بھی دیتا وہ بھی میری آمد کا بہت مشتاق رہتا، بہر حال جب حضرت قدس سرہٗ دونوں وقت مکان تشریف لے جاتے تو میں اور مولانا شبیر علی مرحوم اور مولانا ظفر احمد تینوں اپنا اپنا کھانا لے کر اکٹھے کھاتے، اور میرا بچا ہوا کھانا طباخ لے جاتا لیکن میرا سالن کم بچتا تھا اس لئے کہ گوشت علی الدوام میرے ہی کھانے میں ہوتا تھا، اور شوربا بھی اس میں مطبخ جیسا نہیں ہوتا تھا، بلکہ گاڑھا ہوتا تھا، ایک دو مرتبہ ایسا بھی دوپہر کے کھانے میں ہوا کہ ہم لوگوں کو کھانا شروع کرنے میں دیر ہوئی اور حضرت قدس سرہٗ اپنے مکان سے تشریف لے آئے، اور ہم کو اکٹھے کھاتے ہوئے دیکھا، مگر کچھ فرمایا نہیں، نیچی نگاہ کر کے گزر گئے،

ایک چیز کا تعلق تو میری ذات سے نہیں لیکن میرے والد صاحب کے ساتھ ضرور ہے، حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی تالیفات مفید عام اور مخلوق کے دینی ترقیات کا جتنا ذریعہ ہیں وہ تو ظاہر ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، اور ان میں "بہشتی زیور" کو قبولیت عامہ

حاصل ہے، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، لیکن بندہ کا خیال یہ ہے، کہ اس میں میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے عمل کو بہت دخل ہے،

والد صاحب کے انتقال کے وقت ۸ ہزار روپے ان پر قرض تھا، اس میں ان کی تجارت کو بہت زیادہ دخل تھا، خاص طور سے بہشتی زیور کی طباعت ان کے زمانے میں دس بارہ ہزار سالانہ کی ہوتی تھی، کوئی زمانہ ایسا نہ گزرتا تھا، جس میں بہشتی زیور کا کوئی حصہ بلالی پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ میں زیر طبع نہ ہو، میرے والد صاحب کے قرضے میں پریس کے بھی چار پانچ ہزار باقی تھے، ان کے زمانے میں ساڑھے تین آنے فی حصہ عام اس کی قیمت رہی اور ۲½ پیسے فی حصہ اس کی پڑت تھی، اور تاجروں کو ہمیشہ نصف قیمت پر یعنی ۷ پیسے پر دیا جاتا، اور عوام کو بھی بالخصوص اکثر مدرسہ مظاہر علوم کے سالانہ جلسے پر اور دار العلوم دیوبند کے ۲۸ھ کے دستار بندی کے جلسے پر سب کتابیں جلسے کے ایک دن کے لئے اور دار العلوم کے تین دن کیلئے نصف قیمت ہوتی تھی، بہت سے لوگوں کو بہشتی زیور کامل کے پانچ سات نسخے اس طرح پر دیئے جاتے تھے کہ جب فروخت ہو جاویں۔ آدھی قیمت خود رکھ لیں، میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد کئی برس تک اس ناکارہ کے نام دس پندرہ روپے کے منی آرڈر اس مضمون کے آتے رہے، کہ مولانا مرحوم نے اتنے بہشتی زیور دیئے تھے، وہ فروخت ہو گئے تھے، مگر قیمت ادا کرنے کی اب تک نوبت نہیں آئی،

جب حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے حیاۃ المسلمین تالیف فرمائی، اور اپنی تالیفات میں اس کو بہت ہی اہم ارشاد فرمایا، اور واقع میں بھی بہت اہم ہے، اور حضرت قدس سرہٗ نے بہشتی زیور کی طرح سے اس کی عام اشاعت کی تمنا ظاہر فرمائی تو مجھے اپنے والد صاحب بہت یاد آئے، کاش ان کی حیات میں یہ کتاب تصنیف ہوتی، تو بہشتی زیور سے اس کی اشاعت

دگنی ہوجاتی، میرا بارہا جی چاہا کہ اس کو طبع کرکے ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کروں، لیکن اس ناکارہ کے علمی مشاغل کی وجہ سے مجھے پہلے سفرحج ۳۸ھ کے بعد سے اپنے کتب خانے کا کام کرنے کا وقت نہ ملا، اللہ تعالےٰ مولوی نصیرالدین صاحب کو جزائے خیر دے کہ ہمیشہ انہوں نے میری کتابوں کی طباعت اور فروختگی کا اہتمام کیا اور اب چند سال سے مہمانوں کے ہجوم کی وجہ سے میرے عزیز داماد مولوی حکیم محمد الیاس صاحب میری کتابوں کی طباعت کا اہتمام کرتے ہیں کہ مولوی نصیر کو مہمانوں کے خورد ونوش کے انتظام سے ہی فرصت نہ رہی، اللہ تعالےٰ میرے دونوں محسنوں کو اور میرے سب ہی محسنین کو جس کا کسی نوع کا احسان جانی ومالی، جاہی، علمی، سلوکی، نسبی، احسان ہے، اپنی شایان شان ان کے احسانات کا بہترین بدلہ دارین میں عطا فرمائے کہ یہ سیہ کار اپنے محسنوں کے احسانات کا بدلہ بجز دعا کے اور کیا کرسکتا ہے، ماحول کا اثر لازمی اور دائمی ہے، اسی وجہ سے حدیث پاک میں اچھے ہم جلیس کی ہم نشینی کی ترغیب اور بُرے جلیس سے اجتناب کا حکم وارد ہوا ہے،

تھانہ بھون کے قیام میں چونکہ ہروقت ذاکرین کا زور رہتا تھا، اس سیہ کار کو بھی ذکر کا شوق رہتا، اور حضرت قدس سرہٗ نے جو بتا رکھا تھا، صبح کی نماز کے بعد پریس کے کھلنے تک حضرت ضامن صاحب قدس سرہٗ کی قبر پر بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا، بڑا لطف آتا تھا، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اس وقت میں تھانہ بھون کے مفتی بھی تھے اور امام بھی تھے، وہ بہت ہی شفقت فرمایا کرتے تھے، اور اونچے الفاظ ارشاد فرمایا کرتے تھے، ان وجوہ سے اس سیہ کار کو خیال ہوا کہ میں بھی کچھ دنوں یکسوئی کے ساتھ ذکر وشغل کروں، اس لئے میں نے وہیں سے حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں یہ لکھا کہ مدرسے کی مشغولی کی وجہ سے ذکر وشغل میں پابندی نہیں ہوسکتی، اگر اجازت فرماویں تو یہ ناکارہ کہیں یکسوئی

کے ساتھ ذکر وشغل چار چھ مہینے کرے، حضرت قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں اسباق کے ساتھ جتنا تھوڑا بہت ہوتا ہے کرتے رہا کرو، ؏ خوئے بدرا بہانہ بسیار، میرے لئے بہانہ مل گیا اور اب تک بھی کبھی توفیق نہیں ہوئی، اس سیہ کار کا دستور یہ بھی رہا، کہ حضرت حکیم الامت کی مجلس میں بہت کم جانا ہوتا، اور حضرت کے یہاں کی حاضری کا وقت بھی متعین طور پر ظہر سے عصر تک تھا، اس لئے یہ ناکارہ اس کا اہتمام رکھتا تھا، کہ حضرت کی مجلس میں بے وضو کبھی نہ بیٹھے، اللہ نے اس کی توفیق عطا فرمائی،

قصے تو میرے اکابر کے اس ناکارہ کے ساتھ بہت ہی ہیں، اور مجھے ان سب کو لکھوانے میں لطف بھی آرہا ہے مگر ساٹھ سالہ حالات کے لکھوانے کے واسطے تو بڑا دفتر چاہیئے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ اپنی علالت کے زمانے میں اخیر دور میں بجائے مدرسے کے قیام کے مولوی منفعت علی صاحب وکیل مرحوم کے مکان پر قیام فرمانے لگے تھے، اس لئے کہ وہاں استنجے وغیرہ کی سہولت زیادہ تھی، ایک دفعہ حضرت تشریف لائے، وکیل صاحب کے مکان پر قیام تھا، میں نے تلبینہ پکوا کر جو ایک مسنون حریرہ ہے، حضرت قدس سرہٗ کے معالج خاص اور مجاز بیعت حکیم محمد خلیل صاحب جو میرے مخلص دوست اور مجھ پر بہت ہی شفیق تھے، ان سے اجزاء بتا کر دریافت کر چکا تھا، کہ حضرت کے لئے مضر تو نہیں، انہوں نے، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، یہ فرمایا کہ کچھ مضر نہیں، میں نے وہ پکوا کر حضرت کی خدمت میں بھیجا اور پرچہ لکھا کہ یہ مسنون غذا ہے، اور میں نے طبیب سے اجازت لے لی کہ یہ مضر نہیں، حضرت نے اس کے جواب میں میرے پرچے پر لکھا کہ اس کو میں مسرت سے قبول کرتا، اگر آپ یہ نہ لکھتے کہ یہ مسنون ہے، موجودہ صورت میں یہ اشکال پیدا ہو گیا، کہ اگر میں نے اس کو رغبت

سے نہ کھایا تو ایک مسنون چیز سے بے رغبتی ہو جائے گی، میں نے پھر واپس کیا اور عرض
کیا کہ حضرت کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن اگر یہ پسند نہ آیا تو یہ قصور پکانے والی کا ہوگا،
نہ کہ اصل شئے کا، ہم روزانہ اس کا تجربہ کرتے ہیں، کہ ایک پکانے والی ایک چیز کو بہت
لذیذ پکاتی ہے، اور دوسری اسی چیز کو نہایت بدمزہ، اس کے بعد بھی رائے مبارک
نہ ہو تو اصرار نہیں ہے، حضرت نے رکھوا تو لیا، مگر یہ معلوم نہیں کہ نوش فرمایا کہ نہیں۔

خانقاہِ اشرفیہ تھانہ بھون

عجب فرحت گہے ایں خانقاہ است عجب نزہت گہے ایں خانقاہ است

یکے ساقی دمے خواران ہزار اند دو چشم مست اُو مشغول کارند

دلِ اینجا میکند۔ اللہ۔ اللہ کہ ہر دم بشنود۔ اللہ۔ اللہ

چہ صحت بخش ہست اینجا فضائے دل اینجا بے دوا یابد شفائے

تعالی اللہ چہ عالی بارگاہے
کہ اینجا ہر گدائے۔ بادشاہے

(خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ)

مقالہ نمبر ۴

حکیم الامت حضرت تھانوی رح

اپنے زمانے کے

غزالی وقت تھے

حضرت مولانا الحاج حکیم عبد الرشید محمود صاحب گنگوہی رح
نبیرہ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی قدس سرہ کی وفات کے تقریباً پانچ سال کے بعد میری ولادت ہوئی۔ حضرت والد ماجد مولانا حکیم مسعود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہیؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ علوم درسیہ نظامیہ کی تحصیل اپنے والد سے کی جب کہ حضرت گنگوہیؒ کی درسگاہ نہ صرف ہندوستان بلکہ شیراز و اصفہان، بلخ، و بخارا اور عراق تک کے تشنگان علوم ربانیہ کی پیاس بجھا رہی تھی مشائخ چشتیہ کے فیضان کا مرکز بنی ہوئی تھی علوم ظاہری و معارف باطنی کے چشمے اُبل رہے تھے۔ ولی اللہی مکتبۂ فکر اپنے منازل اقتراب وارتفاق میں سالکین کی رہنمائی کر رہا تھا ساغر صہبائے طیبہ کا دور چل رہا تھا۔ جرعہ نوشان ازل قطار اندر قطار چلے آ رہے تھے ؎

یلقی الیہ رفاق الناس کلھم | علی المحامل والاقتاب والسفن
من الجزیرۃ ارسالا متابعۃ | ومن خراسان اھل الریف والمدن
مبارکا ھاربا للناس محتسبا | علی الانام بلامن ولا ثمن

والد محترم حکیم صاحب اس نسبت سے حسب وسعت سیراب ہوئے مگر اس مسند کی عظمت شان قلب میں اس قدر تھی کہ باپ کے بعد اجلۂ خلفاء حضرتؒ کے اصرار کے باوجود اس جگہ پر نہیں آئے ظاہری سبب معاش طبابت رہا۔ وقت کے حذّاق اطباء میں شمار تھا حفظ اوقات اور مشغولی کا یہ عالم تھا کہ روزانہ ایک قرآن آخر وقت تک معمول رہا، امانت، دیانت اور تورّع واستقامت کا پیکر تھے۔ علم وعمل میں اتقان اور دینی تصلب نمایاں محسوس ہوتا تھا۔

میں سن شعور کو پہونچا تو اندر باہر دینی ماحول، دینی مذاکرہ، حضرت گنگوہی کی شخصیت کے اذکار و تذکار، متوسلین کی آمد و رفت، علماء اور مشائخ وقت حضرت

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ حضرت اقدس مولانا خلیل احمدؒ حضرت مولانا عبد الرحیم رائے پوریؒ حضرت اقدس اشرف العلماء تھانویؒ جیسے سرآمد روزگار حضرات کا اکثر و بیشتر ورود برابر مشاہدہ میں رہا قلب و دماغ کے ہر جز و اعصاب و احساس کے ہر ریشہ میں جہاں دین اور اہلِ علم و دین کی عظمت اپنا گھر کر رہی تھی وہیں ان حضرات کی غایت شفقت رأفت اور عطوفت کے باعث صاحبزادوں والی ذہنیت اور تعظمہا الآباء کا ذمیمہ بھی پوری طرح کارفرما رہا۔ دارالعلوم پہونچا تو وہاں بھی چونکہ سب ہی اکابر، اصاغر منتسبین آستانہ قاسمی و رشیدی ہی تھے اور ان ہر دو احبار امت کی نسبتیں مجانس و مشارک اور متقارب تھیں اس لئے اپنا اختصاص وہاں بھی نمایاں ہی محسوس ہوا۔ سب حضرات غایت لطف کا معاملہ فرماتے گویا آنکھوں میں رکھتے۔ اس فضائے ناز میں ظاہر ہے کہ جس طرح ناز پروردہ اولاد اکثر نالائق ہی رہتی ہے۔ میں بھی چھ سال وہاں رہ کر جیسے تیسے نصابی مراحل تو عبور کر ہی گیا۔ مگر اعتراف ہے کہ لے کر کچھ نہ لوٹا علم کی وقعت اور علماء کی عظمت تو بے شک میرے قلب میں کسی راسخ فی العلم سے کم نہیں رہی مگر روضات علم کے اثمار مقصودہ سے تہی دست اور خالی داماں ہی رہا۔ طبی کتب کچھ پڑھی تھیں تکمیل اور فنی تربیت کے لئے کچھ عرصہ دہلی رہا ۱۹۳۲ء میں حضرت والد صاحب کی وفات کے بعد سے گنگوہ ہی قیام اور مطب شغل رہا۔

اب حضرت کی وفات پر تقریباً ۲۵ سال گذر چکے تھے۔ حضرت حکیم صاحب بھی سفر آخرت اختیار کر چکے تھے رشیدی متوسلین میں اکثر اکابر بھی رخصت ہو چکے تھے جو تھے وہ گاہے ماہے تشریف لاتے رہتے۔

حضرت تھانوی کی زیارت دیر سے نہیں ہوئی تھی۔ اس دس سال میں حضرت نے ترک سفر فرما دیا تھا۔ دیوبند شوریٰ میں تشریف نہیں لاتے تھے۔ میں خود کبھی تھانہ بھون

حاضر نہیں ہوا تھا۔ اب گونہ شعور کا زمانہ تھا سب اکابر کی تو زیارت ہوئی اور ہوتی رہتی تھی۔ حضرت کا کبھی کبھی خیال آتا تھا۔

ایک روز خواب دیکھا" تھانہ بھون حاضر ہوا۔ معلوم ہوا کہ محلہ فیض خاص وعام میں حضرت کی خانقاہ ہے۔ وہاں پہونچا تو دیکھا کہ حضرت ایک کنویں پر بڑے سے ڈول سے مسلسل پانی کھینچ رہے ہیں۔ ایک بڑی نالی سے شور کے ساتھ پانی گذر رہا ہے۔ طاقت ور مضبوط آنکھوں میں گہرا سرمہ مجھے دیکھ کر قریب تشریف لائے۔ مصافحہ یا کوئی بات یاد نہیں" آنکھ کھل گئی۔ دو تین سال بعد پھر دیکھا کہ حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارک میں حاضر ہوں۔ دسترخوان بچھا اور کھانا چنا ہوا ہے اور بھی لوگ ہیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میزبان بنے کھانا کھلا رہے ہیں۔ لطف کے ساتھ یہ کھاؤ۔ یہ بھی لو کھانے پیر بالائی اور سرخ مرچ پڑی ہوئی ہنے۔ دہی بھی یاد ہے۔ پھر منظر بدل گیا۔ اب گویا رخصت ہو رہا ہوں۔ رخصتی مصافحہ کے لئے حاضر ہوا۔ ایک کوٹھڑی سی ہے زیادہ روشنی بھی نہیں۔ ایک چوکی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ مصافحہ کے لئے جھکا۔ وفور گریہ کے سبب کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر کہہ نہیں سکا۔ بمشکل اتنا کہا کہ یا رسول اللہ دعا۔ فلاح دارین چاہتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم لطف سے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہتے ہیں میں نے جلدی سے سر جھکا دیا۔ ٹوپی اتار دی کہ دست اقدس بلا حائل سر کو مس کرے" (انتہی الرویا)۔ اس کے چند روز بعد یاد نہیں کیا محرک پیش آیا۔ اطلاع کر کے تھانہ بھون حاضر ہوا۔ غایت مرحمت و مسرت کا معاملہ فرمایا۔

کیا دیکھا" دربار عجیب دربار تھا۔ جلال بھی تھا جمال بھی۔ قوت و سختی کا بھی مظہر تھا۔ مسکنت و عاجزی اور تکسر و تواضع کا بھی کوہ گراں بھی۔ آب رواں بھی۔ شعلہ بھی اور شبنم بھی۔ متضاد نرم و گرم قوتوں کا موزوں امتزاج خطوط کے جوابات بھی لکھے جا رہے ہیں۔ سوال کرنے والوں کے جواب بھی دیتے جا رہے ہیں کسی کو مختصر کسی کو بہ تفصیل

تحقیقی بھی الزامی بھی، حکمت کا انداز بھی ہے مواعظت و مجادلت حسنہ کا طرز بھی۔ جدال بالتی ہی احسن کی بات آج سمجھ میں آئی۔ دلائل میں کہیں دلیل عقلی کہیں نقلی۔ کہیں جدلی عدلی کہیں انفسی آفاقی۔ بات میں بات حِکَم بھی لطائف بھی، ٹھوس قانونی فقہی اشارے بھی، لطیف متصوفانہ رموز بھی۔ عجیب پُر بہار مجلس۔ ہیبت مع الانس کا انداز، نہ ہیبت مع الوحشت۔ بعض باتیں روزمرہ کی معمولی سی مگر آج اس شیخ کے بیان سے ان کی اہمیت کا شعور ہوا۔ بعض قلوب میں کچھ علمی اشکال ہیں بغیر سوال ہی وہ حل ہوتے چلے جا رہے ہیں خود میرے ساتھ ایسا ہی پیش آیا۔ اوروں نے بھی بیان کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشکال جو صدور ناس میں پیدا ہوتے ہیں قلب شیخ پر انہ لیغان علی قلبی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے پھر طبیعت مدافعانہ تقریر و بیان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے یا جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ من عرف اللہ طال لسانہ جب اللہ تعالےٰ کی معرفت نصیب ہوتی ہے تو زبان لمبی ہو جاتی ہے۔ حقائق و بصائر اور حکم و عبر کا ورود ہوتا ہے قلب میں گھٹن سی پیدا ہوتی اور بیان و اظہار کی طرف میلان ہوتا، اسی سے انشراح میسر ہوتا ہے جیسا کہ اس کے برعکس ارشاد ہوا کہ من عرف اللہ کلّ لسانہ کہ جب معرفت نصیب ہوتی ہے تو زبان بند ہو جاتی ہے اس لئے کہ مضامین عالیہ رفیعہ کا ورود ہوتا ہے جس کی وجہ سے تحیر کا عالم طاری ہو جاتا ہے الفاظ کی تہی دامانی سامنے ہوتی ہے عارف سوچتا ہے کس مضمون کو کس طرح بیان کروں، کس کو چھوڑوں۔ تعبیر تام اور ترجمانی کے لئے کون سے الفاظ لاؤں۔ گویا حیرت محمود کی بات نہ حیرت مذموم کی، کہ اول ناشی ہے ذکاوت سے اور ثانی ناشی ہے غباوت سے علوم ظاہرہ الیقین بما یقرب ماخذہٗ من ماخذ العلوم العادیۃ میں بھی تحیر ہوتا ہے جیسا کہ اکبرؒ نے کہا تھا ۔

"کیا علم کی لذت سے بھی بڑھ کر ہے کوئی چیز
یہ حال تو بس محفل حیرت میں کھلے گا"

چہ جائیکہ معارف و سرائر باطنی جن کی شان شھود ما یجل عن العلوم العاریۃ انما ھو حکایۃ عن التجرد الصرف الذی لیس فیہ زمان ولا مکان ولا یوصف بوصف ولا یشار باشارۃ ہے۔

لوگ اس کو کشف سمجھتے تھے مگر حضرت نے تبسم ایک دفعہ فرمایا کہ "مجھ کو کشف نہیں ہوتا"۔ شاید فراست ایمانی اور کشف میں حضرت کے نزدیک فرق ہو السماع من یحییٰ بن معین شفاءٌ للصدور من لحظہ یحیی عظام البالی۔ بعض اکابر کے متعلق کہا گیا۔ تاثیر صحبت لقا و محاذات کی غیر اختیاری برکت لا یشقی جلیسھم والی بات۔

عصر کی اذان پر مجلس برخواست ہوگئی۔ بعد مغرب رخصتی مصافحہ کے لئے مکان پر حاضر ہوا۔ کوٹھڑی سی تھی۔ معمولی سی روشنی ایک چوکی پر تشریف فرما تھے۔ مجھ پر گریہ کا وہی عالم جو خواب میں تھا، کیوں؟ میں نہیں کہہ سکتا۔ نفسیاتی تجزیہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر ہاتھ سر پر پھیرا کہ "لایئے سر پر بھی ہاتھ پھیر دوں اگرچہ ہے تو گستاخی" یہ گویا اشارہ نسبت کی طرف تھا میں نے جلدی سے ٹوپی اتار کر سر جھکا دیا۔ بالکل وہی نقشہ خواب، کوٹھڑی وہی روشنی ویسی ہی۔ چوکی اسی طرح سمت میں البتہ فرق تھا خواب میں غربی جانب تھی یہاں غربی شمالی سمت اسی طرح سر پر ہاتھ پھیرنا غلبۂ گریہ میں وہی الفاظ دعا حیرت بھی ہوئی اور نشاط بھی استبشار کی کیفیت بھی۔ اس کے چند روز بعد بیعت کی درخواست کی۔ جواب میں کچھ انتظار اور شرائط کی سی بات تحریر فرمائی۔ میں نے مفصل کچھ لکھا۔ جواب آیا "ماشاء اللہ نہ ادا میں کمی رہی نہ ادب میں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ جب چاہیں آجائیں

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست"

فرصت دیکھ کر جلد ہی حاضر ہو گیا۔ ایک ذہنی رسم تھی سو پوری ہو گئی اپنی بات جہاں تھی وہیں رہی۔ کام جیسا کہ الانسان علی نفسہ بصیرۃ فرمایا گیا نظر ہی

آرہا تھا کچھ ہو سکا نہ آئندہ توقع۔ سال میں دو ایک مرتبہ حاضری ہوتی رہی۔ تعلق گو نہ بڑھتا رہا من اذا راہ بداہۃً ھابہٗ واذا خالطہ معرفۃً احبہٗ سے محروم نہیں رہا۔

آپ کا یہ سوال بھی ہے کہ اس تعلق کے بعد زندگی میں کیا تبدیلی ہوئی؟ حسرت سے کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں بجز اس کے کہ اپنے حرمان کا احساس بڑھ گیا اپنی نااہلی کا استحضار ہو گیا۔ امت کے ایک حبر کامل کا واقعہ ہے کہ درس میں ایک روز فرمایا کہ اپنی غلطی انسان کو خود نظر نہیں آتی۔ مجھ میں کوئی عیب پاؤ تو مجھ کو باخبر کردو کہ اصلاح کی فکر کروں مجمع میں سے ایک نوعمر اٹھا اور کہا کہ ایک عیب آپ کا بہت اہم ہے وہ یہ کہ آپ کے تبحر کا جو عالم ہے اور آپ کی علمی سطح جس قدر بلند ہے آپ کو ویسے تلامذہ اور استفادہ کرنے والے نہیں ملے ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار گل چینِ بہار تو ز داماں گلہ دارد

آپ کے پھولوں کو سمیٹنے کے لئے اپنی دامن کی تنگی باعث شکوہ ہے یہی آپ کا بڑا عیب ہے ؏ "خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را"۔

آپ نے سوال کیا ہے کہ حضرت تھانوی کی زندگی کے کس پہلو سے آپ زیادہ متاثر ہوئے؟ نہیں یہ سوال اس طرح نہ کیجئے بلکہ اس طرح کہ کون سا پہلو زیادہ قابل تاثر نہیں ہوا۔ اور کون سی جہت تھی جس سے آپ سرسری گذر گئے۔ کسی نے کہا تھا خدا کہاں ہے جواب دیا گیا کہ کہاں نہیں اس شیخ کی بات کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ زیادہ کہوں تو ڈرتا ہوں کہ کتاب المنقبت نہ سمجھ لی جائے اور بقول مودودی صاحب کے "مولانا اشرف علی ایک بڑی جماعت کے معبود مجازی" مجھ پر شرک خفی کا الزام نہ آجائے۔ اور اشخاص کے بیت سینوں میں بغض کی بھبتی مودودیوں کی طرف سے نہ چسپاں کی جائے گو ایک رکن خاص مولانا اصلاحی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک کے لئے یہاں تک لکھ گئے کہ "پیغمبری

شخصی عظمت حضرت عمر کے قلب میں اس قدر تھی کہ وفات نبوی پر وہ اپنا توازن کھو بیٹھے اور نبی کی شخصیت اور بزرگی کا سکہ نفس میں ایسا مرتسم تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ بھول گئے کہ قضائے الٰہی کے سامنے سب بالا و پست ایک ہیں یہ جذبہ اکابر پرستی جاہلیت کی پیداوار تھا جو مٹتے مٹتے بھی کبھی ابھر آتا تھا" جس طرح کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ "ان میں ذاتی جذبات اور غیرت وحمیت جاہلیت کے غیر اسلامی جذبات کا غلبہ ہوگیا تھا جو اسلام کی روح کے منافی تھا" خالد سیف اللہ کو ایک دفعہ حدود اللہ کی تمیز مشکل ہوگئی"۔ غنیمت یہ ہوا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کو صرف جلد بازی کہنے پر اکتفا کیا یہ نہ فرمایا کہ موسٰی وفور جذبات میں اور شدت غضب میں توازن حواس کھو بیٹھے اور بھائی کی داڑھی اور سر کے بال کھینچنے لگے جو حدود تہذیب سے کتنا تجاوز تھا اس لئے میں تے کہا کہ اس شیخ کی کون سی بات کہوں کون سی چھوڑوں - ع "کھاؤں کہاں کی چوٹ بچاؤں کہاں کی چوٹ"۔ یا اتنا کہہ کر دامن چھڑالوں کہ لا یعرف قدر الغزالی من جاء بعد الغزالی الا ان یکون مثل الغزالی او فوق الغزالی میں نے کیا دیکھا، کیا پایا، کہاں کہاں متاثر ہوا۔ محاسن وکمالات کی ضوفشانی خیرگی چشم کا سبب جہاں ہوا اور تنگی داماں کی تحدید جب حائل ہوجائے تو یہ کم نظر دیکھ ہی کیا سکتا ہے۔ کیا پایا؟

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد" بھی نفسیاتی حکمت وتاثر کا اہم باب ہے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے من عرف اللہ کل لسانہ۔ دوسری جگہ فرمایا من عرف اللہ طال لسانہ نصوص میں تعارض نہیں ہے دونوں صحیح۔ وجہ تطبیق محقق۔ کیا پایا خبر دوں تو خبر شد کا معاملہ اشتباہ میں پڑجائے نہ دوں تو ادعائے خبر شد کی بدگمانی یقینی، بس اتنا ہی کہہ کر آگے بڑھ جاؤں کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں ۔۔۔ بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ارباب خبر وبصیرت ہی جب عاجز رہے تو مجھ سے کم ذوق اور ضعیف وخفیف المدرک

کی تو طاقت ہی کیا ہے۔خواب اور افسانہ کی سی بات رہ گئی ادھورے نقوش چھوڑ گئی۔
کسی عیسائی نے تاج محل دیکھا، پوچھا گیا کیا دیکھا؟ کہا بس "سنگِ مرمر کا ایک خواب" خواب
کا استغراق حواس پر چھا جانے والا لطیف تعبیر ہے اسی کے قریب کسی نے کہا تھا ؎

چشم جب تک ہو نہ جائے خوابگاہ جبرئیل پائمال و رائگاں ہے رسم و راہ زندگی

بہرکیف میرے ادھورے نقوش کیا ہیں۔ اجمالاً لکھتا ہوں۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے
کہ کیا تم نے ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اعمش، مکحول، ابن مبارک، ابن جوزی کو دیکھا ہے ابن
عساکر، شعرانی، غزالی و رازی، طاہر مدنی کردی ولی اللہ دہلوی کی زیارت کی ہے تو استعارہ
کر کے بحلف مولانا عثمانی کی طرح کہہ سکتا ہوں کہ ہاں دیکھا ہے اور میں اس قسم میں حانث
نہ ہوں گا کہ میں نے ایسی شخصیتوں کو دیکھا ہے جن میں ان آحاد امت کے علوم و کمالات اور
تجرد و تورع کا پورا عکس موجود تھا ان میں سے ایک شخصیت اشرف العلماء تھانوی کی
بھی ہے۔

اس حبرِ جلیل کے یہاں کیا ملتا تھا؟ بصائر و حکم، معرفت امر و خلق حقوق کا اہتمام
فرائض کی شناخت، مال کے مصارف و مداخل میں احتیاط معاملات و معاشرت میں
حدود کی رعایت، سنتہ اللہ اور عادت اللہ کی خبر ایام اللہ اور آلاء اللہ پر نظر مکاسب اور
مواہب کی تمیز، مقام و حال کی معرفت تہذیب اخلاق واقفیت احوال، مکارم و محاسن
اور رذائل خبائث کا امتیاز اس کی عالیانہ الوہیت و عظمت، اپنی عاجزانہ حیثیت و عبدیت
کا استحضار "او بناز ے عجبے من بنیاز ے عجبے"۔ کا مکمل مرقع، یہاں کشوف و کرامات
حسی کی باتیں کم سے کم تر علوم و معارف اور حقائق بیشتر یہاں محمد بن حزم الظاہری کا رنگ
بھی نظر آتا تھا اور ابن عربی کا حال بھی ابو حنیفہ کا قیاس و اجتہاد بوضوح حجۃ و بیان بھی محسوس
ہوتا تھا (گو عملاً ارشاد تھا کہ میں مقلدوں کا بھی مقلد ہوں) اور بخاری کا ضبط واقعات صحت
فکر اور صرفِ درایت بھی۔ ابن معین کی جرح و تعدیل بھی، ابن سعید القطان کا فیصلہ اور قضا

بھی جوہر طبیعت شبیہ باستعداد نبوت کے امارات بھی تھے۔ اور تقلید و انفعالیت صدیقیت اور داعیۂ نبوت کو پوری طرح ہضم وجذب کی صلاحیت بھی الفیت فی صدر ابی بکر والقی اللہ فی صدری۔

دینی امامت کا مقام بھی میسر تھا سیاسی قیادت کی معرفت بھی سیاست کون سی؟ کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء والی، نہ عصریہ عرفیہ کہ یہ محض کیادت ہے ظہور واقدام کے لئے مساعدت احوال بہرکیف شرط ہے اس کا فقدان ۱۸۵۷ء ہی سے مشاہد ہے اسی لئے شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے امامت وخلافت کی ظاہری وباطنی تقسیم کی خلافتِ راشدہ کے دور میں امور ظاہری باطنی شخص واحد میں جمع ہوتے تھے پھر جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو ظاہری وباطنی میں بھی تفریق وتقسیم ہوگئی۔ شاہ صاحب نے فرمایا لاصحاب الخلافۃ الظاهرۃ اسوۃ حسنۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعنی المعتنین باقامۃ الحدود واعداد ادوات الجهاد و سد الثغور واجازۃ الوفود الخ ولاصحاب الخلافۃ الباطنۃ ایضاً اسوۃ حسنۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما سن فی ھذا الباب اعنی المعتنین بتعلیم الشرائع والقرآن والسنن الآمرین بالمعروف والناهین عن المنکر والحافظین لحدود اللہ الخ۔

یہ اس لئے کہ احوال کے جبر واضطرار نے امامتِ دینی وقیادت سیاسی کا مجال الگ الگ کر دیا تھا۔ بہرحال حضرت اقدس کی تھوڑی سی صحبت ارشادات تصانیف ملفوظات سے مجھ سا کم ذوق جو کچھ سمجھ سکا اور متاثر ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ اور یہی میری سوانح اور زندگی کا خوشگوار سانحہ ہے کہ حضرتؒ بیک وقت جامع تھے علم وعمل میں صحت اور حق وراستی کی معرفت کے دیانت وسیاست اور امانت وعدالت کے، خلوت و جلوت اور اتقان فی العلم والعمل کے استقلال فکر اور جمعیت باطن کے فکر وذکر وذوق

میں معتدل معیاری اور متوازن نظم وضبط کے یہ مزاج تکوینی امور میں بھی ظاہر ہوتا تھا اور تشریعی علوم میں بھی معاملات ومعاشرت میں بھی اخلاق وحقوق داخلی اور خارجی میں بھی تبلیغ وتذکیر میں بھی، تعلیم وتربیت میں بھی۔ حتیٰ کہ روزمرہ کی باتوں اور لطائف ومطایبات میں بھی۔ طبعاً موزوں اور موزونیت پسند تھے۔

کسی نے لکھا کہ حضرت اپنے لئے بہت ہی خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ فرمایا "ماشاءاللہ خطرہ تو بحر معرفت کا قطرہ ہے" پاس بیٹھے ہوئے کسی شخص نے کہا گریبان پر کھٹمل چلتا دیکھ کر حضرت یہ کھٹمل، فرمایا "جھٹمل"، وضو سے فارغ ہوتے خادم سے فرمایا "اندر سے رومال لاؤ" اس نے کہا حضرت رومال تو ہے نہیں تولیہ ہے۔ فرمایا "تولیا" کسی نازک ضعیف نقیہ نے لکھا کہ میں اصلاح چاہتا ہوں فرمایا "ستر اتیز جلد (کھال)، نازک اصلاح دشوار" کسی کو لکھا قلم باریک سیاہی تاریک، تحریر کس طرح پڑھوں، لوگ اپنے احوال لکھتے اکثر سوال ہوتا اختیاری ہے یا غیر اختیاری؟ اختیاری ہے تو ترک کردو اضطراری ہے تو التفات مت کرو" حکیمانہ نفسیاتی جواب، بعض لوگوں کو حضرت کی اخلاقی حدّت وشدّت کی شکایت تھی "فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی تو حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ رحم اللہ عمراً ماترك الحق لہٗ صدیقاً۔ مگر میں نے تو حضرت کو بے محل سختی برتتے دیکھا نہیں۔ جہاں ناراض ہوتے تھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ ناراضگی اور سختی ہی کا محل ہے یہاں اگر نرمی برتی جاتی تو یقیناً وہ یا تو رافت فی دین اللہ کی سی چیز ہوتی یا مداہنت یا پھر تدبیر ونتائج کے لحاظ سے مضر ثابت ہوتی۔ درحقیقت "اخلاق" کے متعلق لوگوں کا ذہن صاف نہیں وہ ظاہری لینت عفو وتبسم سے بات مدارات، مہمان جیسی سطحی چیزوں ہی میں اخلاق کو محدود، ومنحصر کرتے ہیں حالانکہ اخلاق وسیع معنی میں تادیباً زدوکوب، قصاص وحدود، قتل وتعزیر اور تمام جہاتِ فکر وعمل میں مناسب عمل ورد عمل پر بھی محیط ہیں ضبط ونظم سدّ ابواب الذرائع مصالح مرسلہ دینی ودنیوی بھی حدودِ اخلاق میں داخل ہیں۔

ان المکارم اخلاق مطہرۃ" فالعقل اولہا والعلم ثانیہا۔ والدین ثالثہا والبر رابعہا والعرف خامسہا والجود سادسہا۔ محض نرمی ورواداری اور مطلقاً عفو ودرگذر اخلاق نہیں بعض جگہ بداخلاقی بن جاتی ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ ابن زید کوان کی سفارش پر جواب ویحک یا اسامہ اتشفع فی حد من حدود اللہ اس کی دلیل قیاسی ہے"۔ یہی نرم اخلاق کے خلاف "نیٹشے" نے اسی طرح بغاوت کی ہے جس طرح ترک وتجرید ورہبانیت کے خلاف "پروٹسٹنٹ" طبقہ نے کی کہ یہ دونوں غیر فطری تھے غیر معتدل اور غیر متوازن تھے معرفت اخلاق کے لئے اُسوہائے نبوت اور سیرت نبوی کے مختلف گوشے موجود ہیں وہی پیمانۂ اخلاق و سیرت ہیں۔

حضرت تھانوی ؒ نے ایک دفعہ ایک عجیب جامع جملہ فرمایا "اخلاق خلق مع اصناف خلق" یعنی اخلاق کا جب ذکر کرو اصناف خلق سامنے رکھو ہمارا پورا دین ہی التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ ہے۔

ایک موقع پر فرمایا "ہمارا یہ سلوک ہے ہی رسوخ فی الذکر اور تہذیب اخلاق"۔ اسی کے منتہیٰ پر ہمارا سلوک متعارفہ تمام ہو جاتا ہے۔ بہترین اخلاق نامہ ہے "قرآن" اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ ہیں کان خلقہ القرآن۔ گویا قرآن کی تمام آیات اخلاق و سیرت نبوی ہی کے مختلف گوشے ہیں اور اخلاق نبوی کی تمام جہات قرآن مقدس ہی کے عملی پہلو ہیں۔ قرآن میں جو قال ہے ذات نبوی میں وہ حال ہے۔

ایک حبر اُمت نے فرمایا کہ تلاوت کے وقت اس تطبیق کو سامنے رکھ کر غوض کیا جائے مثلاً قرآن میں جو ذات وصفات کی آیات ہیں اخلاق وسیرت نبوی میں وہ آپ کے عقائد ہیں۔ احکام کی جو آیات ہیں سیرت میں وہ آپ کے اعمال ہیں معاملات کی آیات آپ کا حسن معاشرت ہے اخلاق کی آیات آپ کا حسن معیشت ہے۔ توجہ الی اللہ کی آیات آپ کی

خلوت ہے تربیت خلق اللہ کی آیات آپ کی جلوت ہے قصص کی آیات آپ کی عبرت ہے تذکیر کی آیات آپ کی موعظت ہے۔ قہر و غلبہ کی آیات آپ کا جلال ہے۔ مہر و رحمت کی آیات آپ کا جمال ہے۔ نفی غیر کی آیات آپ کی فنائیت ہے اثبات حق کی آیات آپ کی بقائیت ہے۔ حدود، وجہاد کی آیات آپ کا بغض فی اللہ ہے رحم وکرم کی آیات آپ کا حب فی اللہ ہے۔ تجلیات حق کی آیات آپ کا مشاہدہ ہے ابتغاء وجہ اللہ کی آیات آپ کا مراقبہ ہے تنفیذ امر کی آیات آپ کی خلافت ونیابت ہے۔ تکوین کی آیات آپ کا استدلال ہے عذاب ونار کی آیات آپ کا خوف ہے نعیم ورضا کی آیات آپ کا شوق ہے۔ انا کی آیات آپ کا شہود ہے ہُو کی آیات آپ کی غیبت ہے۔ انتقام کی آیات آپ کا حزن ہے۔ پورے قرآن کو اس طرح دیکھئے وہ سب اخلاق نبوی ہے۔ اخلاق نبوت کو دیکھئے وہ سب قرآن مقدس ہے۔

ایک علمی قرآن ہے ایک عملی اسی لئے تو حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے ایک خاص موقعہ پر کسی سے فرمایا کہ "کیا کافر کے بھی اخلاق ہوتے ہیں" کس قدر وسعت اور گہرائی ہے اس جملہ میں حضرت مولانا محمد الیاس امیر جماعت تبلیغ دہلوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "اخلاق جب تک نبوت کے قدموں تلے نہ آجائیں اخلاق نہیں صورت اخلاق ہے اسم ورسم محض ڈرامائی اخلاق بھی تو ایک ہیئت اسمیہ ہے۔ سیاسی، عرفی، کاروباری اخلاق بھی تو مروج ومرسوم ہیں۔

حضرت اقدس تھانوی عملاً اسی حقیقی اخلاق کا مطالبہ اپنے دوستوں سے فرماتے تھے متوسلین زیر تربیت واصلاح لوگوں کو اسی معیاری پیمانہ پر لاتے اور شدت وحدت ضرور یہ برتتے تھے مگر عوام کی ذہنی تعامی اس کی یافت سے محرومی کے سبب معترض ہوتی تھی۔ میں نے بچپن میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کی "سیرت النبی" دیکھی تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بھلا یہ بھی کوئی سیرت ہے یہ تو تفسیر قرآن ہے۔ آج بات

سمجھ میں آئی کہ قرآن ہی تو سیرت النبی ہے اور سیرت ہی تو عملاً تفسیر قرآن ہے۔

آپ کا سوال ہے کہ حضرت تھانوی کے کس پہلوئے حیات سے آپ متاثر ہوئے؟
کیا کہوں کہ کون سا پہلو محل تاثر نہ تھا ممکن ہے اپنی بے ذوقی کے سبب کسی پہلو سے سرسری گذر گیا ہوں ورنہ پوری زندگی مؤثرات کی طویل فہرست ہے ہر جگہ ع

"کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست"۔

عجب جامعیت اور جمعیت تھی بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے اجتماعیت تھی۔
کسی نے امام مزنیؒ سے پوچھا ما تقول فی ابی حنیفۃ؟ قال سیدھم وما تقول فی امام یوسف؟ قال اتبعھم للحدیث وما تقول فی امام محمدؒ؟ قال اکثرھم تفریعًا وما تقول فی امام زفر؟ قال احسنھم قیاسًا۔ حضرت کی تصانیف اس کی شاہد ہیں یہ سب شیون اس شیخ میں جمع تھیں تفصیل وتعینات کی اس مختصر میں گنجائش نہیں۔

ابن مہدی نے فرمایا کہ میں نے سفیان ثوری کو امیر المومنین فی الحدیث پایا ابن عیینہ کو امیر العلماء، ابن مبارک کو صراف الحدیث، یحییٰ بن سعید القطان کو قاضی العلماء، ابو حنیفہ کو قاضی قضاۃ العلماء پایا۔ حضرت تھانویؒ کی تصانیف بیان القرآن، التکشف، السنۃ الجلیہ فی الچشتیہ العلیہ تنبیہ الطربی، فی تنزیہ ابن العربی، اطفاء الفتن، مؤخرۃ الظنون، الادراک والتوصل فی حقیقۃ الاشراک والتوسل، حوادث الفتاوی، تربیت السالک اعلاء السنن، بیس جلدیں .... جامع الآثار وغیرہ مولفات سے اہل علم کا بیان ہے کہ ایسی بہ جامعیت واختصاص متنادر ہوتا ہے۔

یہ شیخ اللہ کی ایک عظیم نعمت تھا۔ چالیس برس تک مسند ارشاد تذکیر پر متمکن رہے۔
ان کی اصلاحی وتجدیدی مساعی کا انکار کوئی معاند ہی کر سکتا ہے۔ ان کے مواعظ حسنہ ملفوظات طیبہ سے کتنے قلوب جگمگا اٹھے عوام وخواص علماء وعباد، ارباب تفقہ ارباب

تصوف سب ہی نے استفاضہ کیا تصوف جس کو صوفیاء جہال نے کیسا موحش بنا دیا۔ اس کو ایسا منخ کیا کہ مقاصد ذرائع، توابع، موانع، کو ممیز کر کے دکھلا دیا۔ صوفیاء جہال نے مقاصد کو وسائل اور وسائل کو مقاصد کی جگہ دیدی تھی حال و مقام کو شتبہ کر ڈالا تھا۔ آپنے یہ اتنا کیا تھا آپ نے آسان طریق کو دشواریوں کو راہ کی منزل بنا دیا

حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی قدس سرہٗ کا ارشاد ہے۔ صوفیاء کے علوم احوال احوال ہیں میراث اعمال ہیں موقوف علی العلم علم ہے دو مجاہدوں کے درمیان ایک تحصیل علم، دوسرا استعمال علم کانو یتعلمون الھدیٰ کما یتعلمون العلم۔ سلف صالحین جس طرح علم حاصل کرتے تھے اسی طرح علم کا استعمال بھی سیکھتے تھے گویا تربیت اور ٹریننگ کا بھی اہتمام تھا۔ گویا صوفیاء کے علوم کی حیثیت صرف افعال ہیں مقامات نہیں احوال عمل کے بغیر نہیں پیدا ہوتے اور عمل علم کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر علم کے لئے تحصیل کے ساتھ استعمال و تربیت بھی ضروری ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نرے صوفیاء تو اپنے علم پر نازاں نہ ہوں کہ وہ صرف احوال ہیں مقامات نہیں اور نرے عالم اپنے علم پر فخر نہ کریں کہ نرا علم بلا استعمال کچھ نہیں بلکہ اس پر الٹا حجت ہے علم کا سیماء خشیت ہے خشیت کا تقاضہ طاعت ہے اور طاعت متقاضی شرع و طریق ہے۔

آخری حاضری کی بات یاد آئی۔ گھر میں یاد فرمایا "برسبیل تذکرہ" فرمایا کیا کہوں کہنے کی بات نہیں اور کہنے پر اس وقت طبیعت مجبور ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کو بڑوں، بڑوں نے بھی نہیں پہچانا محض علمی عینک سے دیکھا میں نے دل میں کہا کہ آپ کو کتنوں نے پہچانا۔ آپ کا سوال اجازت کے متعلق بھی ہے سنئے۔

ایک روز دفعتہً والا نامہ صادر ہوا مختصر تحریر کارڈ میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ اپنی معلومات دینیہ سے خلق اللہ کو افادہ کریں۔ اپنی مجلس کو ذکر اللہ سے معمور رکھیں ایسی جماعت کا لقب مجاز صحبت رکھتا ہوں آپ کو بھی توکلاً علی اللہ اجازت دے رہا ہوں۔"

میں نے جواب میں اپنی کچھ کمزوریاں لکھیں جواب آیا "میں بھی ان احتمالات سے فارغ نہیں" بس ختم۔ اتنی سی بات تھی جسے آپ نے اہم سمجھ کر مجھ سے مطالبہ کیا۔ خدا جانے میں نے جو کچھ لکھا اس سے آپ کا مطالبہ پورا ہوا یا میں کم فہمی سے کچھ اور سمجھا اور خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع کیا۔ طویل تحریر سے گراں بار کیا مگر اپنا حال یہ ہے کہ لذیذ تذکرہ وہ بھی محبوب شخصیت کا اختصار پر قدرت نہیں رہی۔ لکھنے کے بعد اب خیال ہو رہا ہے کہ آپ کا مقصد و مطالبہ تو شاید میرا انٹرویو لینا تھا جو آج کے مغربی طرز فکر کا ایک نادر نموذج ہے جس میں اپنی سوانح وسیرت کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ بھلا اپنی سیرت کوئی کس طرح بیان کرے عیوب و ذمائم کو بیان کر نہیں سکتا کہ جائز بھی نہیں محاسن و مکارم کا اظہار و دعویٰ خود عیب فلا تزکوا انفسکم اگرچہ وہ موجود ہوں تحدیث بالنعمۃ کی نیت و انداز پر اعتماد کس طرح کہ یہ افتخار بالنعمۃ نہ ہو جائے ولو اتقیٰ معاذیرہ کا ذمیمہ طبیعت و فطرت انسانی۔ بس میری سوانح حیات کا خلاصہ یہی ہے کہ ایک خضر راہ کو پایا اور آب حیات سے محروم رہا شاید ؎

"وانکس نہ یافت درد نایافت بس است"

کفایت کرے اگر واقعی درد ہو۔" واللہ المعین والسلام"۔

حکیم عبدالرشید محمود عفی عنہ
رشید منزل گنگوہ۔ ضلع سہارن پور
یو۔ پی

ضمیمہ

احقر نے حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب مدظلہٗ کو مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان کے سالانہ اجتماع میں تشریف آوری کی دعوت دی تھی۔ حضرت حکیم صاحب موصوف نے احقر کے اس دعوت نامہ کے جواب میں جو گرامی نامہ تحریر فرمایا ہے چونکہ وہ بھی عجیب وغریب مضامین اور علوم ومعارف اور ادبیت سے بھرپور ہے اس لئے دل چاہا کہ اس گرامی نامہ کو بھی اس رسالہ کا ضمیمہ بنا کر پیش کر دیا جائے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ حضرت حکیم صاحب موصوف کو ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین ثم آمین۔

وکیل احمد شیروانی غفرلہ

نوٹ:۔ افسوس کہ حضرت حکیم صاحب ۱۱؍ شوال ۱۴۰۵ھ کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

گرامی نامہ حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب

حضرت محترم زید مجدکم السامی السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

گرامی نامہ سے مشرف ہوا۔ اس سے قبل بھی مولانا عبدالرحیم صاحب نے خود گنگوہ تکلیف فرما کر پمفلٹ اور لٹریچر مرسلہ مجھ کو پہونچایا تھا۔ افسوس کہ رسید جناب تک نہیں پہونچی خدا کرے یہ عریضہ پہنچ جائے۔

جس اہتمام و اعزاز سے جناب نے مجھ کو خطاب فرمایا اور اس بزم "رندانِ خوش انفاس" میں دعوتِ شرکت دی ہے وہ میرے لئے ایک سند اور شہادت ہے وہاں بھی اس شہادت کو یاد رکھئے اور دیجئے۔ میں زمرۂ علماء اور صالحین میں داخل نہیں ہوں البتہ لاحق ہونے کا ظن اور انہی میں محشور ہونے کی اُمید رکھتا ہوں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آپ کی اس دعوت و تحریر سے "کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید۔" اللہ اس مجلسِ صیانت کی صیانت فرمائے۔ کارکن رفقا شرکا اعضاء و ارکان جماعت کے قلوب میں وسعت گہرائی انشراح و اخلاص پھر اتقان راسخ فرمائیں۔ قلوب کے شعب فارغ اور موضع نجوی کو احسان سے معمور ربط باللہ و تعلق مع اللہ سے مخمور فرمائے۔ ایک صاحبِ دل کا شعر ہے ؎

لِکلِ امرءٍ شِعبٌ من القلب فارغٌ
وموضعُ نجویٰ لایُرام اطلاعها

پھر اوپر عزیمت و استقامت بھی مرحمت فرمائے حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ کا ارشاد یاد آیا۔ فرمایا کہ رزائل و ذمائم اور خبائث میں جس طرح حُبِ جاہ اخیر میں آکر زائل ہوتی ہے اسی طرح مکارم و محاسن اور محامد میں بھی استقامت اخیر میں آکر میسر ہوتی ہے اس ذیل میں بات چونکہ اجلاس و اجتماع کی ہے حضرت

مولانا سید سلیمان ندوی کا مقولہ یاد آیا۔ فرمایا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت سلب کرلی گئی ہو۔ ہر جماعت، ادارے، انجمن، مدارس، مکاتب، بین افتراق نہ سقاق نزاع اور تحزب عام مشاہدہ ہے، یُعجِبُ کُلُّ ذِی رائٍ برائہٖ عام ہے۔ سیرت واخلاق کی وہ بذاذات جو کبھی کام کرنے والوں میں تھی کہ مقصود کام تھا نہ اشخاص نہ ذاتی آراء پر اصرار، نہ جزوی فروعی باتوں میں اپنی عملی توانائیوں کا بے جا خرچ و استعمال، حضرت عبداللہ ابن مبارک کا ارشاد سامنے آجاتا ہے فرمایا ؎

اذا صاحبتَ فاصحِب صاحباً ذاحیاءٍ وعفافٍ وکرم

قائلاً للشئ لا اِن قلت لا واذا قلتَ نعم قال نعم

دوسرا سبب جمعیت کا فقدان ہے۔ تین ہی چیزیں ہیں۔

جمعیت جامعیت پھر اجتماعیت۔ جمعیت مقدم ہے۔ پھر جامعیت علوم مقاصد اور اصول وحدود طریق کی۔ اخیر میں اجتماعیت۔ ترتیب عموماً ملحوظ نہیں رہتی۔ مقاصد و وسائل میں خلط ہوجاتا ہے۔ زندگی تمام ہی ظہورِ ترتیب کا ہے۔ امور مبحوث عنہا فی التصوف پر حضرت اقدس تھانوی کا مرتبہ نقشہ، خدام تھانہ بھون کو معلوم ہی ہے کہ کس طرح وضع الشئ فی محلہٖ کو علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے مقام پر رکھا ہے۔ مقاصد مقاصد کی جگہ، وسائل وسائل کی جگہ، توابع توابع کی جگہ، پھر سُکر وصحو مع الخطر بلاخطر کی نشاندہی۔ ظاہر ہے افراد سے جماعت بنتی ہے۔ پھر جماعت سے کبھی کوئی فرد جو اختصاص و مزیت اور کبھی عبقریت کا حامل ہو ع بدل دیتا ہو جو بگڑا ہوا دستور مے خانہ پیدا ہوجاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جمعیت مقدم بھی ہے اساسیت کا مقام بھی اسی کو میسر ہے، اس کے بغیر ہر قدم غلط بھی ہے، غیر محفوظ بھی ہے، بے جان بھی

ہے، نتیجہ کے اعتبار سے تخیل بے رطب بھی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اشخاص و افراد کی سیرت جمعیت واخلاص اور احتساب سے عاری ہوگی تو پھر یہ مضمون ایک صاحب دل عارف کا سامنے آجائے گا ۔

ومن نکدِ الدنیا علی المرءِ اَن یُریٰ لئیمٌ کریمِ القوم افرعَ ملتعا

کلابسِ ثوبَ الزورِ من لم یکن لہٗ یقینٌ وامسٰی بالھدیٰ متشبعا

اس میں اس حدیث کی تفہیم ہے کہ "اَلمتشبعُ بما لم یُعط کلابسِ ثوبَی الزورِ" خانقاہوں کی غرض بھی جمعیت تزکیہ وتطہرہ ہے۔ اور حضرت اقدس تھانویؒ کا ارشاد گویا دریا بہ کوزہ ہے کہ "ہمارا تصوف سلوک کیا ہے۔ صرف تہذیب اخلاق اور رسوخ فی الذکر۔ اسی کے منتہیٰ پر ہمارا سلوک متعارفہ تمام ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر تعلقات فیما بینَ اللہ وبینَ العبد کے خصوصی انکشافات ہیں جس کی کوئی نہایت نہیں"۔ لِاَنَّہٗ کان خائضاً فی بحرِ القرب والعرفان یترقّٰی ساعۃً فساعۃً ولِانَّہٗ لاتکرار فی التجلی والتجلی علیٰ حسب استعدادِ المتجلی لہٗ۔ واستعدادہٗ صلی اللہ علیہ وسلم کان متزائداً آناً فاناً الخ اے برادر بے نہایت درگہے است ہرچہ بروے می رسی بروئے ما ئیست۔ امام یافعیؒ کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ کمر بستہ کھڑے ہوئے ہیں فرمارہے ہیں کہ ہم اب تک طلب میں ہیں اور جو شخص وصول کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے اس لئے کہ وصول ہوتا ہے محدود کی طرف اور اللہ ہیں لامحدود لانہایت۔ پھر تہذیب اخلاق کتنا وسیع ہے ہمہ گیر ہے۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مکارمَ الاخلاق اور حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کتنے وسیع معنیٰ مگر غایت اختصار و تعبیر کے الفاظ سے فرمایا "کان خُلُقُہٗ اِلقرآن" اور قرآن کے متعلق حضرت اقدس

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد کہ لا تنقضی عجائبہ، اس کی احاطت کل علوم عقائد و حقائق اقدار و دلائل فضائل و مسائل مواقع العلوم مواقع النجوم مواطن النزول کے فنون وشئون پر محیط۔ پھر اخلاقِ خلق مع اصناف خلق کی تفصیل ساری صفات و سماتِ نفوس ذکیہ ممکنہ کے اشتمال کے ساتھ۔ امانت دیانت عدالت سماحت طہارت انابت توکل تفویض خودداری خودشناسی خودشکنی اخلاص احتساب ے می سوزی دوز می بیزی ہیچ رجوع وتبتل۔ بات لمبی ہوگئی۔ ممکن ہے آپ ذہنی تعب محسوس کریں اور بور ہوں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جمعیت کا آج فقدان ہے اہل علم میں بھی اس جہت سے بے اعتنائی ہے ے

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک ۔۔۔ نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

مدارس آیات خلت عن تلاوۃ ۔۔۔ ومجلس علوم مقفر العرصات

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دیوبندی مکتبۂ فکر دراصل ولی اللٰہی مکتبہ ہے۔

بھی ہے مختصراً حکمت ولی اللہ ۔۔۔ جسے تو مدرسہ وخانقاہ اٹھے تو سیاہ

موجب مسرت ہے کہ آپ کی یہ مجلس گویا احیاء خانقاہیت ہے بطرز اشرف العلماء

ع اللہ رکھے آباداں ساقی تیری محفل کو

ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا "تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند" ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ ایک دن کے لئے بھی بند نہیں ہوئے۔ ہاں انحطاطِ کیفی وکمی کا ہمیں اقرار ہے۔ خیر القرون سے بُعد اس کا سبب ہے اور یہ ناگزیر ہے لایاتی علیکم عامٌ ولا یومٌ الا والذی بعدہٗ شرٌ حتی تلقوا ربکم مگر تجدید بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ انحطاط کا انکار نہیں وہ ہے

طرز دلنوازِ سلف میں بھی مناہج اشتراک واتفاق میں بھی

مگر یحمل ھذا العلم من کل خلفٍ عدولہٗ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین اور ان اللہ یبعث علیٰ راس کل مأیۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا جیسی نصوص بھی سامنے ہیں اور لھم مثل اجر اولھم کی بشارت بھی ان مجددین ومصلحین اور مفہمین کے لئے ہیں۔ عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد است آپ کی یہ مجلس بھی اسی غرض ومنشا کے لئے منعقد ہو رہی ہے کاش مجھ کو بھی شرکت کی سعادت میسر ہوتی۔ ے صحبتے با اولیا میسور ہوتا۔ لشاشتہ ایمانی میرا نصیب ہوتا۔ مگر اپنا حال ہی ابتر ہے یہ مجالس ذکر اللہ ایسے لوگوں کا حصہ ہے جن کی فکر بیدار ہو روح بے تاب ہو ذہن مصفیٰ قلب سلیم فکر ارجمند دل دردمند ہو۔ مراکز ذکر وتذکیر دراصل محارم قدس ہیں جو حظیرۃ القدس کے محاذ سے ہیں خوش بختی ہے جنہیں شرکت کی سعادت ارزاں ہو۔

اگر کوئی موقعہ آیا کوئی تقریبِ سعید محرک ہوئی تو اربابِ خانقاہ ہی برکفے جام شریعت برکفے سندانِ عشق انشاء اللہ اولاً سامنے آئیں گے فضا ذرا نمناک ہوگی تو یہ مٹی بہت زرخیز ثابت ہوگی۔

ماضی قریب میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور اُن کے رفقاء جو اسی سلوک کے داعی اور اسی خانقاہی طرز کے تربیت یافتہ تھے اسی کے رموز وآثار ان کے ظاہر و باطن اور اخلاق کا سیما تھے کس ولولۂ شہادت وجانبازی وجاں سپاری کے ساتھ میدان میں آئے من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن کی رزم گاہ سے اترے حالِ شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورم کا منظر دکھلا گئے۔ ظاہری ہزیمت اور خوانین کی غداری کے

باوجود قدم پیچھے نہ ہٹے۔کرّاروں بنے فرّارون نہ ہوئے مولانا یحیٰ علی ولایت علی عظیم آبادی وغیرہ حضرات کا انبالہ کا مقدمہ وہابیان اہل علم کے سامنے ہے ہم اس کے نقوش ابھی نہیں ہوئے۔یہ وہ لوگ ہیں جو جمعیت سے تو مزین تھے ہی، جامعیت سے بھی مہذب تھے ظہر وبطن علانیہ اور سریرہ علم باللہ اور علم بالاحکام دونوں کے جامع تھے۔بُکاءٌ باللیل بسّامٌ بالنہار چو بینی خندہ برلبہا و آتش پارہ در دلہا اور اس ترتیب وحقیقت کے رمز شناس تھے جیسا کہ ایک حبر امتہ کا ارشاد ہے۔

لادینَ الا بالعلم۔۔ ولاعلمَ الا بالکتاب۔ ولاکتاب الابمرادہٖ سبحانہٗ۔۔ ولایتبینُ مرادہٗ الابسنۃِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولایتّضح السنۃُ الابکلام الفقہاء۔۔ ولایُفیدُ کلام کلام الفقہا الا بالانصباغ۔۔ ولایلوحُ الانصباغ الا بالتزکیہ ولایتأتا التزکیۃُ الابصحبۃ الشیوخ۔ ولا المعیۃ الا باتباعہم

صوفیہ کو بھی تنبیہ ہے علماء کو بھی انتباہ۔دین بغیر علم کے نہیں ہے علم بغیر معیت مشروط بالاتباع کے نہیں۔

حضرت مجدد سرہندی قدس سرہٗ کا ارشاد یاد آتا ہے۔"صوفیا کے علوم ہیں احوال (یعنی مقامات نہیں) احوال ہیں میراث اعمال ہیں موقوف علی العلم۔علم ہے دو مجاہدوں کے درمیان ایک تحصیل علم دوسرا استعمال علم کانوا یتعلمون الھدیٰ کما یتعلمون العلم۔کس قدر جامعیت سے لبریز ہیں یہ مضامین۔

صوفیاء علماء پر نقد کرتے ہیں کہ انہیں اسرار و مواجید کی خبر نہیں سرگشتہ خمارِ قیل وقال ہیں۔علماء صوفیہ سے مطمئن نہیں کہ یہ کتاب وسنت کے نصوص اخبار د

آثار وسنن سے ناآشنا ہیں۔

حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ میں کسی واردہ صادرہ خاطرہ کو سوقت تک قبول نہیں کرتا جب تک دو شاہدین عادلین ثقتین اس کی تصدیق نہیں کر دیتے۔

کبھی یہ جگہ منزل اولیا تھی — فرشتوں کی محفل تھی بزم ہدیٰ تھی

یہ مسکن تھی اک دن حکیم امم کا — ہوا اس کی ہر اک مرض کی دوا تھی

یہ چھوٹی سی بستی۔ یہ چھوٹی سی مسجد — یہ چھوٹی سی مجلس خدا جانے کیا تھی

منور ہوا جس سے عالم دوبارہ

مجدد کی مجلس تھی۔ نورِ خدا تھی

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی

اپنی تصانیف کے متعلق حضرتؒ کا یقین

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک بار کچھ مخالفین کی حضرتؒ کی تصانیف کے متعلق مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر تھا۔ اس وقت حضرت نے بہت جوش کے ساتھ فرمایا کہ مخالفین سب اپنی اپنی کوششیں کرلیں آپ دیکھیں گے کہ انشا اللہ تعالیٰ میری کتابیں ایسی پھیلیں گی کہ کسی کے روکے نہ رکیں گی (بفضلہ تعالیٰ ایسا ہی ہو رہا ہے) (اشرف السوانح)

مقالہ نمبر ۵

حکیم الامت حضرت تھانوی رح

کے بارے میں میرے

تأثرات

حضرت مولانا پروفیسر عبد الباری صاحب ندوی رح
سابق استاذ شعبہ فلسفہ و دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

حضرت تھانویؒ کی ایک اہم خصوصیت
ہر شے میں حدود کی انتہائی رعایت تھی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت[1] تھانوی علیہ الرحمۃ کا سب سے نمایاں اور بڑا کمال راقم الحقر کی نظر میں یہ تھا کہ علم و عمل میں حدود کی رعایت اس درجہ تھی کہ حضرات انبیاء کا تو ذکر نہیں ورنہ، لوازم بشریت کے ساتھ اس سے زائد کا تصور دشوار ہے ......
جسمانی خلقت، ظاہری اور باطنی حواس کی صحت، اور نتیجۃً اعتدال افعال اور مزاج کی لطافت میں بھی مجدد امت کی ذات نبی امت صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو تھی۔

ایک[2] مرتبہ کسی خط میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے راقم احقر سے سوال کیا تھا کہ مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا سب سے ممتاز وصف کیا تھا؟ خاکسار نے جواب میں عرض کیا تھا کہ "علم و عمل ہر شے میں حدود کی انتہائی رعایت"۔

عقل[3] و حکمت، فہم و فراست اور علم و بصیرت کے جن بے شمار کمالات سے حضرتؒ کا سینہ منور تھا اس کو ہر صاحب نظر ایک ہی مجلس کی حاضری میں کچھ نہ کچھ دیکھ سکتا تھا اور آج بھی ہزاروں صفحات کی تحریری "باقیاتِ صالحات"

---

[1] جامع المجددین "، از حضرت مولانا عبدالباری صاحب (مطبوعہ نامی پریس لکھنو) ص۴۲

[2] جامع المجددین - ص ۴۸

[3] جامع المجددین - ص ۴۲

کے ہر صفحہ پہ دیکھا جا سکتا ہے جس کی مختصر تفصیل حسبِ ذیل ہے :-

ترکِ ما لایعنی :-

ترکِ[1] مالایعنی اور " عن اللغو ھم معرضون " کا سراپا نمونہ تھے۔ گفتگو میں فضول ولایعنی باتوں کا قطعاً گذر نہ تھا۔ ایک گفتگو پر کیا موقوف " ترکِ لایعنی " کے حسنِ کلام کا یہ رنگ تھا کہ زندگی کی کوئی جنبش بھی لاطائل یا بے سوچے سمجھے نہ ہوتی تھی، ہر ہر حرکت جچی تُلی، ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں اپنی اور سب کی سہولت و راحت اور فراغِ قلب کا غایت اہتمام فرماتے تھے۔ قواعد و ضوابط بھی اسی لئے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ :-

" میں نے اپنے معمولات میں راحت کی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں یہی میرا اصل مذاق ہے کہ دنیا کی بھی راحت ہو اور آخرت کی بھی اور صرف اپنی ہی راحت مقصود نہیں دوسروں کی راحت کا بھی خیال رکھتا ہوں "

جس[2] طرح زبان غیر اللہ کے ذکر سے پاک تھی اسی طرح قلب کو بھی غیر کی فکر سے فارغ رکھنا چاہتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ۔

" چاہے توفیق یادِ خدا کی نہ ہو لیکن اپنی طرف سے تو قلب کو فارغ رکھنے کی کوشش ہی کرتا ہوں تاکہ اگر کبھی توفیق ہو تو آسانی سے حق تعالیٰ کی طرف قلب کو رجوع کر سکوں اور اس وقت کوئی مانع توجہ الی اللہ سے نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ الجھی ہوئی باتوں سے طبیعت پریشان

---

[1] جامع المجددین - ص ۴۲

[2] جامع المجددین - ص ۴۳

ہو کر متغیر ہو جاتی ہے کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ بات جلد ختم ہو کر یکسوئی حاصل ہو۔"

لوگوں کی عادت بے محل اظہارِ معلومات اور بے سند سُنی سنائی خبریں بیان کرنے کی ہوتی ہے اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ۔

"جس جملۂ خبریہ سے کوئی انشا متصور نہ ہو وہ لغو ہے"[1]

بات بات میں حکمت و افادہ :۔

کوئی چھوٹی بڑی بات حکمت و مصلحت سے خالی نہ ہوتی تھی..... فرمایا کرتے تھے۔

"میں اس کو خیانت جانتا ہوں کہ لوگ اپنی اصلاح کے لئے آئیں اور میں اصلاح طلب باتوں پر روک ٹوک نہ کروں، لیکن ساتھ ہی فرمایا کرتے تھے کہ۔

"عین مواخذہ کے وقت بھی بحمد اللہ اس کا استحضار رکھتا ہوں کہ یہ شخص مجھ سے لاکھوں درجہ افضل ہے۔"

اور اس کی مثال میں فرماتے ہیں کہ جیسے کوئی جلاّد بادشاہ کے حکم سے شہزادہ کے بید لگائے تو عین بید لگانے کی حالت میں اس کو یہ وسوسہ بھی نہ ہوگا کہ میں شہزادہ سے افضل ہوں۔ سبحان اللہ کیسے نازک مسئلہ کی کیسی دلنشین مثال ہے ...... ایک موقع پر فرمایا کہ۔

"کامل وہ ہوتا ہے جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پورا

---

[1] جامع المجددین۔ ص ۴۵-۴۶

متبع ہو۔ طریق سنت میں اعتدال ہوتا ہے، افراط و تفریط نہیں ہوتی"

ایک[1] دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ۔

"اصل شیخ وہی ہے جس سے غم و غصہ و رنج و راحت وغیرہ کے تمام احوال میں سبق حاصل ہو" (اَوْ کَمَا قَالَ ٹھیک الفاظ یاد نہیں۔

اور حضرت شیخ اکبرؒ کا یہ مقولہ تو بارہا نقل فرمایا کرتے تھے۔

"مربّی وہ ہے جس کا دین انبیاء کا سا ہو، تدبیر اطباء کی سی، اور سیاست بادشاہوں کی سی"

ہر[2] غیر متعصب صاحبِ بصیرت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کی کتابوں پر ایک نظر ڈال کر دیکھ سکتا ہے کہ تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، تصوف و فلسفہ، کون سا ایسا علم ہے جس کا دین سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ بھی تعلق ہے اور جس پر مصنف کی نظر نہیں، کسی میں عبور و مہارت، تو کسی سے بقدرِ ضرورت واقفیت، مگر غیر معمولی عقل و فہم، فکر و بصیرت کی بنا پر سب کے مغز و تہ تک رسائی ہے

ولیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

مخلوق سے استغنا :۔

ایک[3] اور اہم وصف جو دین کی ہر چھوٹی بڑی خدمت کو صحیح طور پر بجالانے کی ضروری شرط ہے (چہ جائیکہ خدمتِ تجدید) وہ مخلوق سے زیادہ سے زیادہ بے غرضی

---

[1] جامع المجددین - ص ۴۷

[2] جامع المجددین - ص ۵۱

[3] جامع المجددین - ص ۵۱، ۵۲

اور استغنا ہے جس کو انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یوں کہلایا گیا ہے کہ۔

لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ط اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ط

(تم سے میں قطعاً کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر صرف اللہ پر ہے)

ظاہر ہے کہ جسقدر غیر اللہ یا خلق کا دل و دماغ پر دباؤ ہوگا، اسی قدر علم حق کی فہم کا دروازہ بند ہوگا اور راہ حق میں زبان کا کھلنا اور قدم کا اٹھنا دشوار ہو گا۔ یہ وصف حضرتؒ کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس درجہ ابھرا ہوا تھا کہ ناواقفوں کو بعض اوقات خشکی اور درشتی کا گمان ہوتا تھا۔

مالی استغنا:۔

سب سے[1] زیادہ دشوار مالی استغنا ہے۔ رائج الوقت پیری مریدی ایک مستقل معاشی پیشہ بن گیا ہے اور بلا کسی شرط و تحقیق کے مُرید کر لینا تو عام دستور ہے لیکن حضرت کے ہاں اس چیز میں بھی ہر چیز کی طرح حدود و قیود تھے۔ حضرتؒ ہر مرید سے یا بیعت کے وقت تو قطعاً کچھ قبول نہ فرماتے تھے، البتہ ہدیہ کے طور پر اپنے مخلص خادموں سے کچھ قبول فرما لیتے تھے۔ جن کے اخلاص کا یقین اور تجربہ ہوتا تھا، وہ بھی اس کڑی شرط کے ساتھ کہ "تھادوا تحابو" کے تحت محض محبت کی راہ سے پیش کیا گیا ہو جس میں ثواب کی بھی نیت یا دعا تک کی درخواست نہ ہو۔ یہ بھی شرط تھی کہ ہدیہ کی مقدار اتنی قلیل ہو کہ پیش کرنے والے پر بالکل بار نہ ہو۔ احقر کا تجربہ ہے کہ قلیل کو زیادہ مسرت کے ساتھ قبول فرماتے تھے۔ ایک دفعہ کسی خادم نے غالباً ایک اکنی پیش کی اور عرض کیا کہ تین پیسے ہدیہ ہیں

---

[1] جامع المجددین۔ ص ۵۲ تا ۵۴

اور ایک پیسہ واپس فرمادیں، نہایت خوش ہو کر قبول فرمائے۔ اپنی ذات خاص ہی کے لئے نہیں بلکہ مدرسہ و خانقاہ کے لئے بھی اسی طرح کی احتیاط و استغنا کا معمول تھا۔ ایک صاحب نے مدرسہ کے لئے غالباً دو سو[2] روپے بھیجے، قبول فرمالئے۔ پھر دوسرے سال جب بھیجے تو لکھا کہ معمول کے موافق روپیہ بھیجتا ہوں لیکن سال گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی رسید نہ آئی تو آئندہ بند کردوں گا۔ منی آرڈر وصول نہیں فرمایا اور تحریر فرمایا کہ "تم آئندہ سال بند کروگے، ہم اسی سال ہی بند کرتے ہیں" دو چار دن بھی جو حاضر رہتا اس کو کچھ اور حاصل ہو یا نہ ہو لیکن مال اور مخلوق سے حضرت کے کامل استغنا اور بے غرضی کا پورا تجربہ اور یقین تو کرنا ہی پڑتا تھا۔

حضرت[1] مال اور جاہ دونوں سے مستغنی تھے۔ ایک متمول باپ کے وارث ہو کر جائیداد اور زمینداری سے دستبردار ہو گئے جو مال اور جاہ دونوں کا ذریعہ تھی اس سے بڑھ کر یہ خود[2] اپنی تصنیفات و تالیفات ہی سے لاکھوں کے مالک بن سکتے تھے جن سے خدا جانے کتنوں نے کیا کچھ نہیں کمالیا۔ مگر حضرت کے دل میں کبھی اس کا وہم بھی نہیں آیا۔

عین[3] شباب میں جو ہر قسم کی امنگوں اور حوصلوں کا زمانہ ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ:۔

"میں جب کبھی طالب علمی میں سوچا کرتا تھا تو زیادہ سے زیادہ دس

---

[1] جامع المجددین۔ ص ۶۱ — [2] بعض جرائد نے یہاں تک لکھا کہ اگر مولانا اپنی تصانیف کی رجسٹری کرالیتے اور خود اشاعت کرتے تو آج کم از کم چالیس، پچاس لاکھ روپیہ چھوڑ کر جاتے۔ (خاتمۃ السوانح ص ۷۶) [3] جامع المجددین۔ ص ۶۱-۶۲

روپیہ ماہوار کی مُدرسی اپنی معاشی ضروریات کے لئے کافی سمجھتا تھا۔
پانچ روپیہ اپنے خرچ کے لئے اور پانچ روپیہ گھر کے خرچ کے لئے۔ بس
اس سے زیادہ کی تنخواہ پر نظر ہی نہ جاتی تھی"[1]

......ظاہر ہے کہ کامل للّٰہیت کے ساتھ جب تک جاہ و مال سے بھی کامل استغنا نہ ہو۔ دین کی تبلیغ و تجدید کا حق کیا ادا ہو سکتا ہے۔ یہ وصف اتنا غیر معمولی طور پر نمایاں تھا کہ رات دن کا تجربہ رکھنے والے خوب جانتے تھے کہ کوئی شخص بھی جاہ و مال کی خاطر ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان سے نہیں نکلوا سکتا تھا۔ اپنی ذات کا ذکر ہی کیا مدرسہ وغیرہ کسی دینی کام میں چندہ تک کے لئے شخصی تخاطُب کے روادار نہ تھے۔ بس زیادہ سے زیادہ عمومی اعلان و اطلاع کو جائز رکھتے تھے۔ وعظوں میں بھی چندہ کی تحریک سے ابتدا ہی سے احتراز کیا۔ مدرسہ "فیض عام" کانپور کی مدرسی سے علیحدگی کا سب سے بڑا سبب یہی ہوا کہ علماء و مدرسین کے لئے چندہ مانگنے کے کام کو بہت ناپسند فرماتے کہ اس غرض اور دباؤ کی بدولت وہ آزادی و استغنا کے ساتھ احکام کی تبلیغ نہ کر سکیں گے۔ اس زمانہ میں اس کی طرف کسی کا ذہن بھی نہیں جاتا اور اچھے اچھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اساتذہ کو بے تکلف تحصیل وصول کی خدمت سپرد کر دیتے ہیں اور یہ موٹی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خود دین کے کام کو بے دینی کی راہوں سے کرنا کیسی بے اصولی ہے۔ لیکن اس فہم کا کیا علاج کہ مدرسہ کا نفس بقا ایسا مقصود بالذات بنا لیا جاتا ہے کہ بس وہ کسی طرح نہ ٹوٹے خواہ خود دین اور اس کے اصول پاش پاش ہو جائیں۔ حضرت[2] ایسے مواقع پر بے دھڑک فرما دیتے کہ

---

[1] جامع المجددین ۔ ص ۶۲ — [2] جامع المجددین ۔ ص ۶۳

مدرسہ رہے یا نہ رہے لیکن کام تو اصول ہی سے ہوگا۔

ایک مدرسہ کے مہتمم کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ خرچ بڑھا ہوا ہے اور آمدنی (کافی) نہیں، سخت پریشانی ہے۔" فرمایا کہ میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس کی وحی تو آئی نہیں کہ فلاں خاص پیمانہ پر ہو تو مدرسہ کہلائے گا۔ ورنہ نہیں۔ ارے بھائی کام کم کردو۔ خرچ خود کم ہو جائے گا اور اگر آمدنی بالکل ہی نہ ہو تو مدرسہ بند کر دو، کوئی فرض نہیں، واجب نہیں، ظاہر ہے کہ آمدنی کا ہونا اختیاری نہیں مگر خرچ کم کر دینا اختیاری ہے۔"

اُمراء سے استغنا:۔

حضرت فرماتے ہیں کہ۔

"اہلِ علم[1] کے لئے یہ بات بہت ہی ناپسندیدہ ہے کہ وہ اُمراء سے خلط کریں اس لئے کہ غرباء کو جو مصلح سے نفع ہوتا ہے، اُمراء سے وہ آیا گیا ہو جاتا ہے۔ قلوب پر مصلح کا وہ اثر نہیں رہتا۔"

جو اہلِ علم[2] و دین خود طالب اور امراء کو کسی اعتبار سے بھی مطلوب بنا کر جاتے ہیں، خواہ کسی کی سفارش ہی کے لئے، وہ کچھ نہ کچھ مروّت و مداہنت اور تملّق پہ لازماً مضطر ہوتے ہیں اور حس ہو تو علم و دین ہی کی نہیں خود اپنی اچھی خاصی ذلت تو آدمی ضرور محسوس کرتا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ۔

"غرض[3] کہ امراء سے علماء کا خلط کرنا (ملنا جلنا) اس میں امراء کا تو کوئی

---

[1] جامع المجددین ص ۵۴ ۔ [2] جامع المجددین ص ۵۹، ۶۰ ۔ [3] جامع المجددین ص ۶۰۔

(معتدبہ) نفع نہیں اور اہلِ علم کے اور غرباء کے دین کا نقصان ہوتا ہے اس لئے میں اس کو ناپسند کرتا ہوں"

ایک[1] مرتبہ حضرت ایک صاحب کے مدعو کرنے پر حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ وہاں سات ہی روز کے بعد کسی "نواز جنگ" نے جو نواب صاحب کی ناک کا بال اور ارکانِ سلطنت میں سے تھے، لکھا کہ :-

"ایک عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا، مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہ ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں اور فلاں فلاں وقت اپنے فرائضِ منصبی سے فرصت ملتی ہے"

اس درخواست کا جواب جو حضرت نے دیا قابلِ ملاحظہ ہے۔

بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہلِ دین کی عظمت و محبت ہے مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا۔ جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا ہے اس کو تو اپنے اوقاتِ فرصت بتاکر پابند کر دیا اور خود آزاد رہے، یہ کونسی فہم و تہذیب کی بات ہے"

ہمارے کتنے علماء و مشائخ ایسوں سے ایسا استغنا برت سکتے ہیں؟[2]

---

[1] جامع المجددین ص ۵۴ تا ۵۹ — [2] بس یہ وہی کرسکتا ہے جس کو ڈر ہو تو صرف اللہ کا اور امید ہو تو صرف اللہ سے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش — چہ پولادِ ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس — ہمین است بنیادِ توحید و بس

اس پر "نواز جنگ" صاحب نے اپنی بدفہمی کی معافی چاہی اور دوبارہ لکھا کہ :-

"حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرمادیں"

حضرتؒ کی طرف سے مزید تعلیم و امتحان ملاحظہ ہو، تحریر فرمایا کہ :-

"اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ "مردہ بدست زندہ" کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لئے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کرلیں"

جواب آیا کہ :-

"بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جارہی ہے، میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں۔ نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں۔ جس وقت فرصت ہو گی حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا، اگر آپ کو فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا"

امتحان کی اس کامیابی پر حضرتؒ نے پھر کیسی دلجوئی و مسرت کی سند عطا فرمائی کہ :-

"اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے جس سے اسقدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا جی میری زیارت کو چاہ رہا تھا۔ اب میرا جی آپ کی زیارت کو چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو آپ تشریف لے آئیں ورنہ مجھ کو اجازت دیجئے میں خود حاضر ہو جاؤں"

سبحان اللہ تذلل و تکبر دونوں سے اہلِ علم اور اہلِ دین کو بچانے کی کیسی تعلیم فرمائی۔ آگے خود اہلِ مجلس کو خطاب کر کے فرمایا کہ :۔

"یہ میرا طرز اس لئے تھا کہ یہ دنیا کے بڑے لوگ اہلِ دین کو بے وقوف سمجھتے ہیں، ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہلِ علم و دین کی یہ شان ہے تو پہلے تذلل سے بچنا مقصود تھا۔ مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھنچنا تکبر تھا، اللہ کا شکر ہے دونوں سے محفوظ رکھا۔"

اس کے بعد وہ صاحب خود ہی آ گئے۔ اہلِ مجلس میں سے بعض نے دور سے دیکھ کر کہا کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں، حضرت بدستور ڈاک لکھتے رہے، جس وقت انہوں نے قریب پہنچ کر السلام علیکم کہا تب حضرت نے سلام کا جواب دیا اور کھڑے ہو کر مصافحہ کیا.........

حضرتؒ کے استفسار پر وہ صاحب نواب صاحب کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا کہ "اگر نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے تو بہت مناسب ہے" اب حضرت حکیم الامت کی حکمت آموزی اور تعلیم کے مزید اسباق سنیئے :۔

پہلا سوال یہ ہوا کہ "یہ آپ کی خواہش ہے یا نواب صاحب کی؟" کچھ سکوت کے بعد کہا کہ "میری خواہش ہے"، دریافت فرمایا کہ "جس وقت آپ نے ملاقات کے مناسب و نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہو گا اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہو گا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟" کہا "نواب صاحب کا"، فرمایا کہ "نفع تو نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جا رہی ہے، طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب

بنایا جا رہا ہے۔" اس پر کوئی جواب نہ دیا۔

پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ "اگر میں خود ملاقات کو جاؤں تو اس میں مضرت ہی مضرت ہے، نفع کچھ نہیں، کیونکہ اس صورت میں وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا۔ تو اس صورت میں ان کو تو مجھ سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ ہاں ان سے مجھ کو نفع ہو سکتا ہے کہ جو چیز ان کے پاس ہے (یعنی دنیا) وہ مجھ کو ملے گی اور وہ بقدر ضرورت بحمد اللہ میرے پاس بھی ہے اور جو میرے پاس ہے (یعنی دین) وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں پھر جو ان کے پاس ہے (یعنی دنیا) منصب و وظیفہ وغیرہ کی صورت میں اگر میں اس کو قبول کرتا ہوں تو اپنے مسلک کے خلاف اور اگر قبول نہیں کرتا تو آدابِ شاہی کے خلاف، کہ اس میں ان کی سبکی اور اہانت ہوگی۔ اور چونکہ اس وقت میں ان کے حدود میں ہوں، اس کی پاداش میں (اخراج وغیرہ) جو چاہیں میرے لئے تجویز کر سکتے ہیں۔ تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا اور میرا نقصان ہوگا" پھر بعض اور مصالح بیان فرما کر ملاقات کی صحیح صورت بیان فرما دی۔۔۔۔

فرمایا "یہ امر بھی شانِ سلاطین کے خلاف ہے کہ وہ اپنی رعایا کے مدعو کئے ہوئے شخص سے ملاقات کریں۔ کیونکہ اس میں کم فہم لوگ ان کو تنگدلی کی طرف منسوب کریں گے کہ کیا خود مدعو نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں ان کی اہانت ہے۔ غرض یہ کہ خیر اسی میں ہے کہ نہ میں ان کے پاس جاؤں، نہ وہ میرے پاس آئیں۔ اگر ان کا جی چاہے تو بحقانہ جھون سے مجھ کو بلالیں، میں خاص شرائط کرکے آجاؤں گا، کچھ عذر نہ ہوگا" یہ سن کسان صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا کہ "ان چیزوں تک تو ہم لوگوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکی" وہ بیچارے جس دنیا کے آدمی تھے ان کی نظر کیا

پہنچتی! ضرورت ہے کہ دین کے علماء و مشائخ کی آنکھیں کھلیں اور ان کی نظر ان باتوں تک پہنچے۔

تقویٰ :۔

جس نے مال وجاہ سے اپنی نظر کو ہٹا لیا۔ اس کے لئے سارے چھوٹے بڑے معاملات میں تقویٰ آسان ہے، جس کے واقعات حضرت کی زندگی میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کے ایسے دو چار واقعات سے کیا جا سکتا ہے جن تک اوروں کی نظر بھی نہیں جاتی بلکہ بعض تو غایت دلیری سے ان کو محقرات امور قرار دے کر استہزار کرتے ہیں۔

(۱) ایک مقام پر رخصت کے وقت گاؤں کے چوہدری نے دو سو روپیہ جمع کر کے حضرت کو نذرانہ دیا، حضرت کو شبہ ہوا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اوروں سے بھی لیا گیا ہے۔ فرمایا کہ ہدیہ تو محبت کے لئے ہوتا ہے۔ جب دینے والوں کو میں نہیں جانتا تو مجھ کو ان سے محبت کیسے ہوگی۔ اس لئے ہر ایک کی رقم واپس کر دو۔ پھر جس کو دینا ہو خود آ کر دے تاکہ معلوم ہو کہ یہ میرا محسن ہے اور مجھے اس سے محبت ہو۔ غرض یہ ہے کہ روپیہ واپس کر دیا گیا۔ مگر کسی نے آ کر ایک روپیہ بھی نہ دیا۔ محض رسم تھی۔

(۲) ریاست بہاولپور کی طرف سے کسی موقع پر دوسرے علماء کے ساتھ حضرت والا کو بھی ڈیڑھ سو روپیہ بعنوان خلعت اور پچیس روپیہ بنام دعوت عطا کیے گئے اس وقت تو حضرت والا نے دوسرے علماء کے ساتھ اس رقم کو بخیال احترام رئیس

؎ جامع المجددین ص ۶۳ تا ۶۶

قبول فرمالیا۔ لیکن بعد کو خلوت میں وزیر صاحب سے عذر کیا کہ "یہ رقم بیت المال سے دی گئی ہے جس کا میں مصرف نہیں اس لئے واپس لے لی جائے" انہوں نے کہا کہ "اب تو کاغذات میں اندراج بھی ہوگیا، واپسی کی کوئی صورت نہیں" حضرت والا نے فرمایا کہ "خیر اگر خزانہ میں واپسی نہیں ہوسکتی تو اس رقم کو مقامی علماء و طلباء میں صرف کر دیا جائے۔ کیونکہ شرعاً بیت المال کے وہی مصرف قریب ہیں"

(۳) کسی رئیس نے دوسو روپیہ خانقاہ کے مدرسہ امداد العلوم کے لئے بھیجے، ساتھ ہی تشریف آوری کی درخواست بھی کی۔ حضرت نے روپیہ واپس کر دیا اور لکھا کہ دونوں باتوں کے اقتران سے احتمال ہوتا ہے کہ شاید مجھ کو متاثر کرنے کے لئے یہ رقم بھیجی گئی ہے۔

(۴) ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور تشریف لے جا رہے تھے، کچھ گٹھے ساتھ تھے جن کو محصول ادا کرنے کی غرض سے اسٹیشن پر تلوانا چاہا۔ لیکن کسی نے نہیں تولا بلکہ ازراہِ عقیدت ریلوے کے غیر مسلم ملازمین نے بھی کہہ دیا کہ آپ یونہی لے جایئے ہم گارڈ سے کہہ دیں گے۔ حضرت نے فرمایا "گارڈ کہاں تک جائے گا؟"، کہا "غازی آباد تک"، فرمایا "غازی آباد سے آگے کیا ہوگا؟" کہا گیا کہ "یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا"۔ حضرت نے فرمایا "پھر آگے کیا ہوگا؟" کہا "بس وہ کانپور تک جائے گا اور وہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا"، فرمایا "نہیں وہاں سفر ختم نہ ہوگا آگے ایک اور سفرِ آخرت بھی ہے، وہاں کیا انتظام ہوگا؟" یہ سن کر سب دنگ رہ گئے اور بے حد متاثر ہوئے (یہ ہے احتیاط، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت) ۱۲م

متحرک تبلیغ :-

اللہ تعالیٰ[1] سے حقیقی خوف اور تقویٰ یہی ہے کہ ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں اس کی رضا و ناراضی کا خیال تمام دنیاوی اغراض و مصالح پر غالب رہے یہی اسلام کی حقیقی اور زندہ تبلیغ ہے کہ مسلمان کی متحرک زندگی میں کھلی آنکھوں اپنے پرائے سب کو اسلام کی تعلیمات زندہ اور متحرک چلتی پھرتی نظر آئیں۔ حضرت مجدد تھانوی کا یہی رنگ تھا کہ جہاں تک معاصی کا تعلق تھا۔ صغائر و کبائر سے یکساں احتراز تھا۔

رائے زنی میں تقویٰ :-

غرض[2] حضرت کا تقویٰ چھوٹے بڑے تمام امور میں بدرجۂ اتم تھا اور صرف اپنی ذات کے مالی یا مادی معاملات ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ دوسروں کے عقائد و اعمال کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے میں بھی نہایت درجہ احتیاط اور حدود کا لحاظ فرماتے۔ بزرگوں کے افعال و اقوال میں اگر کوئی بات خلاف نظر آتی تو تابہ امکان تاویل ہی فرماتے کہ بدگمانی سے حفاظت ہو۔ اگر کوئی اور تاویل سمجھ میں نہ آتی تو غلبۂ حال پر محمول فرماتے اور فرماتے کہ مغلوب معذور ہوتا ہے۔ بزرگوں ہی کا کیا ذکر سرسید، جن کی تکفیر تک بڑے بڑے علماء کی طرف سے باقاعدہ ہو چکی تھی، ان کے متعلق فرماتے تھے کہ ؏

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

سرسید کو مسلمانوں کی دنیوی فلاح کی بہت ہی دھن تھی اور اس معاملہ میں بڑی

---

[1] جامع المجددین ص ۶۶ – ۶۷ [2] جامع المجددین ص ۶۷ تا ۶۹

دل سوزی تھی، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی صفت پر فضل فرمادیں ......
اسی لئے میں ان کو نادان دوست کہا کرتا ہوں"

مولوی احمد رضا خاں صاحب، جنہوں نے خود حضرت کی تکفیر و مخالفت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا، ان تک کی شدّومد سے حمایت فرماتے۔ اور فرماتے کہ ممکن ہے اُن کی مخالفت کا سبب واقعی حبِ رسولؐ ہی ہو اور وہ ہم لوگوں کو غلط فہمی سے نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخ ہی سمجھتے ہوں۔ کیا ٹھکانا ہے اس رواداری، حُسنِ ظن اور اہتمام حفظِ حدود کا۔ فرمایا کرتے تھے کہ بعض فاسقوں اور فاجروں میں بھی کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ بڑے بڑے مشائخ میں نہیں ہوتی لہٰذا کسی کو حقیر نہ جاننا چاہیئے۔ یہ ہے سچی رواداری اور بے تعصبی جو سچی دینداری اور تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ تھا ان کی ذات و صفات اور شخصیت کا بہت ہی اجمالی اور سرسری خاکہ۔

مقالہ نمبر ۶

حکیم الامت حضرت تھانوی رح

اور

میرے تاثرات و مشاہدات

حضرت علامہ سید ابو الحسن علی ندوی صاحب مدظلہ

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی
رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اسم گرامی، احترام و عقیدت کے ساتھ بچپن ہی سے کان میں پڑا ان کی کتاب "بہشتی زیور" کا گھر گھر چلن تھا، اور ان خاندانوں میں جو بدعات و رسوم سے دور تھے، وہ ایک مفتی اور دینی اتالیق کا کام کرتی تھی، غالباً سب سے پہلے ان کی تصنیفات میں سے اسی کتاب سے تعارف ہوا، خاندان کے ان بزرگوں اور اہل علم سے جن کے قول کو سند اور جن کی رائے کو فتویٰ سمجھتا تھا، ان کا ذکر ایک حاذق طبیب روحانی اور ایک ماہر معالج امراض نفسانی کی حیثیت سے سنا، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی خاندان کے اکثر بزرگوں کے شیخ و مرشد تھے، اور خود بھائی صاحب انھیں سے بیعت اور ان کی محبت و عقیدت سے سرشار تھے، سیاسی خیالات میں بھی خاندان و ماحول کا رجحان مولانا ہی کے مسلک کی طرف تھا، لیکن اس سے مولانا تھانوی کی عظمت و عقیدت میں کچھ فرق نہیں آیا، مولانا تھانوی کے متعدد خلفاء ہم لوگوں پر خصوصی شفقت فرماتے تھے، اور ان سے مراسم و تعلقات تھے، ان میں مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری اور

مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، والد ماجد کے ایک عزیز شاگرد مولوی افضل علی صاحب پھلواروی جن کو ہم سب لوگ صوفی صاحب کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے مولانا کے مرید اور مجاز بیعت تھے، انھوں نے مولانا سے اس وقت بیعت کی تھی جب شاید چند ہی حضرات کو یہ شرف حاصل ہوا ہوگا وہ مولانا کا تذکرہ برابر کرتے رہتے تھے، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی برابر مولانا کا اور تھانہ بھون کا ذکر خیر سننے میں آتا رہتا تھا، اور اس عقیدت و احترام میں ان دونوں حضرات کی تحریروں اور مجلسوں کو بھی بہت دخل ہے۔

میرا علمی و ذہنی نشو و نما اس زمانہ میں ہوا کہ مولانا تھانوی نے سفر کا سلسلہ بالکل موقوف فرما دیا تھا، اس لئے اگست ۱۹۳۸ء سے پیشتر جب وہ عرصہ دراز کے بعد بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے، اور پورا چلہ یہاں قیام فرمایا، زیارت و ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی البتہ مکاتبت کا شرف اس سے کئی سال پیشتر حاصل ہو چکا تھا، ۱۹۳۲ء کی گرمیوں میں میں مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں لاہور میں تھا، کہ بھائی صاحب نے جو میری دینی و اخلاقی تربیت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے، مجھے ہدایت کی کہ واپسی میں تھانہ بھون حاضری دیتا ہوا اور مولانا کی خدمت میں کچھ دن قیام کر کے واپس ہوں، ان کو تھانہ بھون کے آداب اور حاضری کے قواعد و ضوابط کا بھی علم تھا، اس لئے انھوں نے میری رہنمائی فرمائی اور ہدایت کی کہ میں خط میں اپنا تعارف بھی کرا دوں اور سفر کا مقصد اور مدت قیام بھی لکھ دوں، نیز جن حضرات سے مجھے تلمذ یا استرشاد کا تعلق ہے، ان کے ناموں کی وضاحت بھی کر دوں، اس لئے کہ مولانا اس صفائی اور اظہار کو بہت پسند فرماتے تھے اور اخفا و توریہ اور تکلفات سے ان کو اذیت ہوتی تھی، میں نے ان ہدایات پر پورا عمل کیا اور لاہور سے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا جس میں اپنا تعارف بھی کرایا، مجھے معلوم تھا کہ حضرت میرے والد ماجد سے

اچھی طرح واقف ہیں، اپنے اساتذہ اور جن حضرات سے بیعت و تربیت کا تعلق تھا، ان کا بھی تذکرہ کیا، ندوہ اور مولانا مدنی سے انتساب و تعلق کا بھی اظہار کیا، یہ بھی لکھا کہ ایک ہفتہ قیام کی نیت ہے، اور مقصد بھی زیارت و شرف ملاقات ہے، مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ... اس خط کا جواب عنایت فرمایا، حسب معمول خط کے حاشیہ پر مختلف فقروں اور مندرجات کا مختصر جواب تحریر فرمایا، حاضری کی اجازت طلبی پر تحریر فرمایا کہ "سر آنکھوں پر تشریف لائیں، لیکن صرف ملاقات کی نیت سے، نہ اعتقاداً نہ انتقاداً نہ ظاہراً" میں نے جن بزرگوں سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تھا، اس پر تحریر فرمایا کہ "صفائی سے دل خوش ہوا" پھر بعض بزرگوں کے طرز سے خود بھی اپنا اختلاف کا ذکر کیا، حاضری کی اجازت طلب کرنے پر دوبارہ ارشاد ہوا کہ "میرے لئے فخر ہے، اگر میرے حالات اس فخر میں مانع نہ ہوں، ورنہ مشتاقی نہ کہ ملولی" (کما قال السعدی) اس وقت تک بھائی صاحب کی بھی ملاقات مولانا سے نہیں ہوئی تھی، مولانا ان کا تذکرہ غائبانہ سنتے رہتے تھے، لیکن میرے نام سے بھی غالباً واقف نہ تھے، اور کوئی وجہ بھی اس واقفیت کی نہ تھی، اس لئے آخر میں مستقل یہ دلچسپ عبارت تحریر فرمائی کہ "مکرمی دام لطفکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اتنی تکلیف اور دیتا ہوں کہ کیا آپ ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے بھائی ہیں، یا آپ ہی کے دو نام ہیں" اس سرفراز نامہ کا جواب میں نے لاہور ہی سے طالب علمانہ انداز میں دیا اور بلاضرورت یہ تحریر کیا کہ میرے نزدیک یہ اختلاف باپ چچا کے اختلاف کی طرح ہے کہ ایک سعادت مند کے لئے صلۂ رحم تعلق سے مانع نہیں، گویا اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اور اس اختلاف کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے استدلال اور حجت سے کام لیا، مولانا کی طبیعت کی نزاکت اور ذکاوت کے جو قصے مشہور تھے، اور جو واقعات تھانہ بھون کے منتسبین اور آنے جانے والوں کی زبانی سنے تھے، ان کے پیش نظر یہ بات یقینی تھی کہ ایک نوعمر اور کم علم طالب علم کی جسارت اور

دخل در معقولات، طبیعت پر بہت گراں گزرے گا، اور اس عریضہ کا جواب یہ آئے گا کہ آپ یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں آپ کو کوئی نفع نہ ہوگا، غالباً اس خط کے لکھنے کے بعد میرا قیام لاہور زیادہ نہیں رہا، اور میں جلد لکھنؤ واپس ہوگیا، شاید اس اندیشہ سے کہ اس خط کا جواب نہیں آئے گا یا اپنی بے خیالی اور ضوابط کی ناواقفیت سے میں نے اس میں جوابی کارڈ نہ رکھا، لیکن میری حیرت و مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب مولانا نے اس عریضہ کے جواب کے لئے خلاف معمول اہتمام فرمایا اور تمام ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر خود لفافہ بنایا، اس پر اپنے دست مبارک سے لکھنؤ کا پتہ لکھا اور مستقل ایک مکتوب لکھکر اس کے اندر رکھا اور مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی مالک انوار المطابع کو جو لکھنؤ آرہے تھے، حوالہ فرمایا کہ مجھے پہنچا دیں، پہلے پتہ کی عبارت پڑھئے پھر مکتوب ملاحظہ کیجئے۔

"مشفق مکرم مولوی علی ابوالحسن صاحب سلمہٗ

بتوسط جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سلمہٗ

۳۷ امین آباد لکھنؤ

مرسلہ

اشرف علی از تھانہ بھون

از اشرف علی عفی عنہٗ بخدمت مجمع الکمالات زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

فرحت نامہ پہونچا، ہر ہر حرف حیات بخش تھا جزاکم اللہ تعالیٰ علی ہذہ المحبۃ آپ کے صدق و خلوص و سلامت فہم کے اثر سے میری طبیعت بھی دفعۃً آپ سے بے تکلف ہوگئی، اس لئے آپ سے کسی امر کا اخفا نہیں چاہتا، اس کے تحت میں تنا

اور عرض کرنے کی ہمت کرتا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔۔۔کا اختلاف اس وقت تک آپ کو علمی اور اجمالی ہی معلوم ہے، کیونکہ ان کو دیکھا ہے، مجھ کو نہیں دیکھا مجھکو دیکھنے کے بعد اس اختلاف کا علم تفصیلی ہوگا اور علم سے متجاوز ہوکر جذبات و اخلاق کے متعلق بھی' اس وقت مجھ کو قوی توقع ہے کہ میرے ساتھ جو حسن ظن ہے، اس بار سے قلب ہلکا ہو جاوے گا، جس سے راحت ہوگی، والغیب عند اللہ۔

حضرت خلیفہ صاحب[1] کے پیام وسلام سے ان کی یاد تازہ ہوگئی اللہ تعالے ان کے برکات میں تضاعف فرماوے، باقی آپ کے لئے دعا کرتا ہوں[2] اور دعا چاہتا ہوں جس کا صیغہ مدت دراز سے یہ تجویز کر رکھا ہے۔

"اللھم کن لنا واجعلنا لك" والسلام"

اس گرامی نامہ پر ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ کی تاریخ ہے، جو ۱۴ جون ۱۹۳۴ء کے مطابق ہے، اس شفقت نامہ پر اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ۔

---

[1] حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوری مراد ہیں، جو اس عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے، سلسلہ قادری تھا، اور قیام دین پور میں رہتا تھا، جو خان پور ریاست بھاول پور کے مضافات میں سے تھا، تمام بزرگان وعلمائے دیوبند ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

[2] خاکسار نے اپنے عریضہ میں مولانا سے دعا کی درخواست کی تھی، اور کسی خاص مقصد کا تعین نہیں کیا تھا، بلکہ لکھا تھا کہ "اہل مکہ ادری بشعابہا" (مکہ کے باشندے اس کی گلیوں سے خوب واقف ہیں۔)

"کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید"

لیکن اس کے بعد بھی تھانہ بھون حاضری کی نوبت نہیں آئی، یہاں تک کہ تھانہ بھون خود لکھنؤ آگیا، اگست ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں مژدۂ جانفزا سننے میں آیا کہ حضرت بغرض علاج لکھنؤ تشریف لا رہے ہیں، کوئی نہیں جانتا تھا کہ اپنے اس علاج کے پردہ میں کتنے بیماروں کا علاج ہونے والا ہے اور شہر کے ایک مرکزی مقام (مولوی گنج) میں ایک مولوی (مدرسہ کا اصطلاحی مولوی نہیں بلکہ جس معنی میں مولانا جامی نے مولانا روم کے متعلق کہا تھا "مثنوی مولوی معنوی" اور کسی عارف نے کہا تھا "مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم") روحانی مطب کھولنے والا ہے جس کے حاضر باشوں میں بڑے بڑے علما و مشائخ اور عمائد شہر ہوں گے، غرض اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا لکھنؤ تشریف لائے اپنے قدیم مسترشد اور مجاز صحبت مولوی محمد حسن کاکوروی مالک انوار المطابع اور نبیرہ مولانا محسن کاکوروی کے مکان پر قیام فرمایا، علاج شفاء الملک حکیم عبدالحمید (جھوائی ٹولہ) لکھنؤ کا تھا، قیام پورے چالیس دن رہا، وہ مدت جس کو یوں بھی سلوک و تربیت اور خانقاہوں کے نظام سے خاص مناسبت ہے، ظہر اور عصر کے درمیان مخصوص لوگوں کو حاضری کی اجازت تھی، ضابطہ یہ تھا کہ یا تو مولانا ذاتی طور پر آنے والوں سے واقف ہوں، یا حاضرین مجلس میں سے کوئی معتبر آدمی اس سے واقف ہو، تاکہ کوئی نامناسب اور اذیت پہنچانے والی بات پیش نہ آئے، مولانا کی اس غیر متوقع آمد کی خبر تمام احتیاطوں کے باوجود بجلی کی طرح تمام اطراف واکناف بالخصوص مشرقی اضلاع میں پہنچ گئی، جو مدت دراز سے آپ کی آمد سے محروم و مایوس تھے، خاص ضوابط و شرائط کے ساتھ اہل تعلق کو آنے کی اجازت دی گئی اور خلفاء و مسترشدین کلکتہ سے امرتسر و لاہور تک کے مختلف وقتوں میں حاضر ہوتے رہے، عمائد شہر کی بھی ایک تعداد زیارت سے مشرف اور مجالس سے مستفید ہوئی ان میں علماء فرنگی محل، اساتذۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء

اور شہر کے دینی ذوق رکھنے والے رؤسا و عمائد بھی تھے، مولانا عصر کی نماز مسجد خواص میں جو آپ کی تشریف آوری اور روزانہ کی مجالس کی وجہ سے حقیقی معنی میں مسجد خواص بن گئی تھی، ادا فرماتے تھے، نماز کے بعد مسجد کے شمالی مغربی گوشہ میں مجلس ہوتی، مولانا خطوط کے جوابات بھی دیتے رہتے اور لوگوں سے مخاطب بھی ہوتے، اس مجلس میں سلوک و تصوف کے نکات، اصلاحی و علمی تحقیقات اور بزرگوں کے حالات و واقعات ارشاد فرماتے، بزرگوں کے واقعات بیان کرتے وقت عجیب کیف و اثر محسوس ہوتا، اس وقت چیدہ چیدہ لوگ ہوتے اور مولانا کو بھی بڑا انبساط و انشراح ہوتا، بھائی صاحب مرحوم اس مجلس میں نیز عصر سے پیشتر کی مجلس میں جو قیام گاہ پر ہوتی بڑی پابندی سے شرکت کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی طالب علم مدرسہ میں حاضری کی پابندی کر رہا ہے، مولانا بھی خصوصی شفقت و التفات فرماتے، علاج کے بارے میں بھی کبھی کبھی مشورہ میں شریک کرتے، یہ ناچیز بھی تقریباً روزانہ ہی بھائی صاحب کے ساتھ حاضری دیتا، اس عاجز کی طرف مولانا کی خصوصی توجہ کا ایک محرک یہ پیدا ہوا کہ اسی زمانہ میں "القول المنشور" کی طباعت ہو رہی تھی، جو اصلاً مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی تصنیف ہے، لیکن اس میں مولانا کی تحقیقات و اضافے بھی ہیں، مولانا کو اس کی طباعت و اشاعت کا بڑا اہتمام تھا، اس میں بکثرت طویل عربی کی عبارتیں بھی آئی ہیں، خدا وصل صاحب بلگرامی کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس کی تصحیح کا کام میرے سپرد کر دیا، مجھے اس میں جہاں اشکال و مراجعت کی ضرورت پیش آتی عصر کے پیشتر کی مجلس میں مولانا کے سامنے پیش کرتا اور مولانا اس کو حل فرما دیتے، اس دوران قیام میں ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک بھائی صاحب سے ان کے مکان پر آنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، اس سے زیادہ عزت و مسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی، مولانا رفقاء و خدام کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکان پر تشریف لائے، دیر تک سرفراز فرمایا،

حضرت حاجی صاحب اور بزرگوں کے حالات کا سلسلہ وہاں بھی شروع ہو گیا۔

تین برس کے بعد دوبارہ اگست ۱۹۴۱ء میں پھر لکھنؤ تشریف آوری ہوئی اس مرتبہ بھی ایک مہینہ سے کچھ زیادہ قیام رہا، تقریباً وہی معمولات و نظام الاوقات رہا، اس طرح پھر ان روح پرور اور پرکیف مجالس میں شرکت اور استفادہ کا موقع ملا۔

۱۹۳۹ء میں میری کتاب "سیرت سید احمد شہید" شائع ہوئی میں نے تو اس کے بھیجنے کی جرأت نہیں کی لیکن میری بے خبری میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اس کو ایک دوسری کتاب کے ساتھ جو ان کو بہت پسند تھی ایک صاحب تعلق کے ذریعہ مولانا کی خدمت میں اس تصریح کے ساتھ بھیجی کہ اگر حضرت کو کچھ گرانی ہو تو اس کو بلا تکلف واپس فرما سکتے ہیں مولانا نے یہ ہدیہ قبول کیا، دوسری کتاب اسی وقت کسی صاحب کو دیدی اور "سیرت" خود اپنے مطالعہ کے لئے رکھ لی، اس کے جواب اور شکریہ میں مولانا منظور صاحب کو ایک خط لکھا جس میں ان کی اس رعایت پر مسرت و انبساط کا اظہار بھی فرمایا، اور سیرت کے متعلق اپنے تاثرات بھی تحریر فرمائے، یہ مکتوب یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے مولانا کے مزاج و مذاق اور اصلی جذبات کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

"از ناکارہ آوارہ اشرف علی عفی عنہ"

بخدمت مکرم بندہ دام فضلہم السلام علیکم۔ کل کے روز صحیفۂ عنایت مع دو رسالہ ہدیہ کے پہونچکر منت بخش و مسرت افزا ہوئے، بسر و چشم قبول کئے، اور آپ کی اس ادا نے زیادہ فریفتہ کر دیا کہ آپ نے میرے اصول کو اپنے جذبات پر ترجیح دے کر قبول کے عذر کر دینے کی بھی اجازت دے دی، چونکہ میرے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرات مخلصین کی اطاعت کو

فخر و سعادت سمجھتا ہوں، لہٰذا ان کے قبول میں بھی میرے اصول محفوظ ہیں، ایک میرے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے احباب کے عطایا سے قلب پر جو اثر ہوتا ہے، اس کا اخفا نہیں کرتا، چنانچہ اس ہدیہ سے خصوصاً سیرتِ شہید سے قلب پر دو اثر ہوئے ایک مسرت کا دوسرا خجلت کا، وہ خجلت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بجز خواب و خور کے کوئی شغل نہیں، لہٰذا ایسی چیزیں اگر ایسوں کو دی جائیں جو ان سے کام لیں تو ہدیہ ضائع نہ ہو اب دعا کی درخواست پر ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ بزرگوں کا اتباع نصیب فرما دے۔

والسلام"

بالآخر وہ دن بھی آگیا کہ تھانہ بھون حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور جس جگہ کے قصے آنے جانے والوں سے برسوں سے سننے میں آرہے تھے، اس کو بچشم خود دیکھنے کا اتفاق ہوا کہتے ہیں کہ پھول شاخِ گل پر اور چمن کے اندر ہی اپنی صحیح شکل و صورت میں نظر آتا ہے، غالباً ۱۹۴۲ء اور مئی یا جون کا مہینہ تھا، اتنا یاد ہے کہ خوب گرمی تھی، اور لو چل رہی تھی، میں مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی میں چھوٹی لائن پر سفر کر رہا تھا، جو شاہدرہ سے سہارنپور تک جاتی تھی، اور جس میں وہ سب مقامات و قصبات پڑتے تھے، جن سے بزرگانِ دیوبند کی تاریخ وابستہ ہے، یعنی کاندھلہ، تھانہ بھون، نانوتہ، اور رام پور منیہاران اچھی طرح یاد نہیں کہ پہلے سے قصد تھا یا اثنائے سفر میں یہ خیال ہوا کہ تھانہ بھون بھی حاضری دی جائے، نظام کچھ ایسا تھا کہ کاندھلہ مولانا کے ساتھ قیام کر کے جو ان کا وطن تھا، رام پور منیہاران جانا تھا، تھانہ بھون، کاندھلہ اور رام پور کے درمیان واقع ہے، میں نے

مولانا سے اجازت لی کہ میں ایک روز پیشتر کاندھلہ سے روانہ ہو جاؤں اور چوبیس گھنٹے تھانہ بھون قیام کر کے اسی گاڑی پر سوار ہو جاؤں جس سے مولانا رام پور تشریف لے جائیں گے، مولانا خود تھانہ بھون کے عقیدت مندوں میں تھے، اور مولانا تھانوی کو اپنے مشائخ کی صف ہی میں سمجھتے تھے، یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور بڑی بشاشت و مسرت کے ساتھ اجازت دی تھانہ بھون کے ایک صاحب متعلق تھانہ بھون جا رہے تھے، میں نے اپنی آمد کی اطلاع کا خط لکھ کر ان کے حوالہ کرنا چاہا کہ وہ خود پیش کر دیں، انھوں نے کہا کہ یہ ضابطہ کے خلاف ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ اس کو پوسٹ بکس میں ڈال دیں، انھوں نے اس کو منظور کیا، میں ایک روز کاندھلہ ٹھہر کر تھانہ بھون روانہ ہوا، ٹھیک دوپہر کو گاڑی تھانہ بھون پہنچی تھی، خانقاہ امدادیہ کا اسٹیشن سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں، میں ایک حمال کو ساتھ لے کر پیدل خانقاہ پہنچ گیا، تھانہ بھون کے قواعد و ضوابط اور آداب کے متعلق اتنا سن رکھا تھا، اور داروگیر اور احتساب کے واقعات بھی اتنے کان میں پڑ چکے تھے کہ ڈرتے ڈرتے خانقاہ میں قدم رکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہو رہا ہے، گرمی اور دوپہر کی وجہ سے وہاں سناٹا تھا، متقیمین خانقاہ اپنے اپنے حجروں میں آرام کر رہے تھے، میں ایک طرف سامان رکھ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی، مولانا تشریف لائے، وضو فرمایا، میں نے اس وقت اپنا تعارف مناسب نہیں سمجھا، ظہر کی نماز کے بعد مسجد کی اس سہ دری میں جو جانب جنوب واقع ہے، اور مولانا کی نشستگاہ رہتی تھی، مجلس شروع ہوئی، چیدہ چیدہ حضرات اور خواص تھے، جن میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کو میں پہچانتا تھا، میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا، سہ دری میں قدم رکھتے ہی میری نظر اس ڈیسک پر پڑی جو مولانا کے سامنے تھی، اور جس پر خطوط اور لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا، انہی کاغذات اور سامان میں سیرت سید احمد شہیدؒ جس کو

چھپے ہوئے تین سال سے زائد ہو چکے تھے، سامنے رکھی تھی، معلوم نہیں مولانا نے میری دل جوئی اور مجھے مانوس کرنے کے لئے اس کو اسی دن نکالا تھا، یا وہ عام طور پر اسی جگہ رکھی رہتی تھی، اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ایک نہایت عزیز دوست میرے تعارف اور تقریب کے لئے موجود ہے، اس کی موجودگی سے اجنبیت کے احساس میں بڑی کمی ہوئی، مولانا خطوط کے جواب دینے میں مصروف تھے، چند منٹ کے بعد خواجہ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا خواجہ صاحب! ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے آئے نہیں؟ اب میں نے خاموش رہنا نامناسب سمجھا، آگے بڑھا اور عرض کیا کہ میں حاضر ہوں، فرمایا کہ آپ نے بتایا نہیں، آیئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا، میں نے عرض کیا حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا، فرمایا کہ اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا، خجلت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا، مکرر کئی لفظ فرمائے، سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ فرمائی کہ میں نے تو آج آپ کی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام پہلے کر لیا تھا، تاکہ آپ سے اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے، یہ گویا حضرت کی طرف سے انتہائی رعایت اور اعزاز تھا، جو اس نوعمر و گمنام آنے والے کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، پھر مزاج پرسی کے بعد بڑی شفقت سے فرمایا کہ کوئی اور رفیق تو ساتھ نہیں؟ کھانے میں کیا معمول ہے، کوئی پرہیز تو نہیں؟ اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت اپنا ہی مہمان رکھیں گے، یہ بھی عام روایات اور تجربات کے خلاف تھا، اور مہمان کے ساتھ بڑی خصوصیت و شفقت۔ میرے عرض کرنے پر کہ کوئی پرہیز نہیں ہے، معذرت فرمائی کہ میں آج کل طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ساتھ نہیں کھا سکوں گا، اس کا کچھ خیال نہ فرمائیں، پھر فرمایا کہ قیام کتنا رہے گا، میں نے عرض کیا کہ اگلے روز دوپہر کو جانا ہے، فرمایا بس اتنا مختصر قیام؟ پھر فرمایا کہ میں اپنے دوستوں سے زیادہ قیام کے لئے اصرار نہیں کرتا کہ گرانی کا باعث نہ ہو اور شاید جو حضرات اتنا وقت بھی دیتے ہیں، ان کو آنے میں پس و پیش ہو، اس کے بعد

مجلس گفتگو شروع ہوگئی، زیادہ تر واقعات خاندان ولی اللّٰہی اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل صاحب کے تھے۔

رات کھانا حضرت کے دولت خانہ سے آیا، کھانے میں اہتمام اور تنوع تھا، صبح نماز فجر کے بعد خواجہ صاحب حضرت کا پیغام لائے کہ فلاں وقت میری خصوصی مجلس کا ہے جس میں مخصوص احباب کو شرکت کی اجازت ہے، لیکن اگر ضرورت ہو تو میں اس کے بھی الگ وقت دے سکتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی خصوصی بات عرض کرنی نہیں ہے، زیارت و استفادہ کے لئے حاضر ہوا ہوں، اسی خصوصی مجلس میں حاضر ہو جاؤں گا، تقریباً چاشت کے وقت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہی چار حضرات تھے، ان میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجھے یاد ہیں، حضرت نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب میرا جال لے آیئے، خواجہ صاحب تعمیل ارشاد میں اٹھ تو گئے، مگر سمجھے نہیں، آپ نے فرمایا خواجہ صاحب سمجھے کہ میرا جال کیا ہے، خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت نہیں، فرمایا کہ تسبیح، یہی ہم لوگوں کا جال ہے جس سے ہم لوگوں کو پھانستے ہیں، مجلس میں اول سے آخر تک بڑا انبساط رہا، خشونت تو الگ رہی کسی درجہ کی خشکی اور یبوست بھی کہیں آس پاس نہ تھی، خندہ جبینی، شگفتہ بیانی، زندہ دلی، اور نکتہ سنجی مجلس کو باغ و بہار بنا دیتی تھی، تھانہ بھون کے متعلق جو تصور قائم ہوا تھا معلوم ہوا کہ اس میں جہاں تک مولانا کی ذات کا تعلق ہے، مبالغہ اور غلط فہمی کو دخل ہے، ضوابط ضرور تھے، مگر استثناءات بھی بکثرت طالبین اور زیر تربیت اشخاص کے لئے احتساب اور مواخذہ تھا، مگر زائرین اور کبھی کبھی کے آنے والوں کے لئے نیز ان لوگوں کے لئے جن کا تعلق مستقل اصلاح و تربیت کا نہیں تھا شفقت و رعایت، یہ بھی اندازہ ہوا کہ خانقاہ کا سارا ماحول حضرت کے مزاج و مذاق اور حضرت کی جامعیت اور حکمت کے سو فی صدی مطابق نہیں تھا، اور وہ مولانا کی پوری نمائندگی اور اپنے زبان حال سے

ترجمانی نہیں کرتا تھا، اور شاید اس شہرت عام میں جو تھانہ بھون کی دارو گیر اور رعب وجلال کے متعلق ملک میں پھیلی ہوئی تھی، ان ضابطہ پرستوں کی بے لچک پابندیوں کو بہت دخل تھا، اپنا ہی تجربہ لکھتا ہوں کہ مولانا کی مجلس سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی کے جانے میں بہت دیر تھی، خالی اور بیکار بیٹھنے کی عادت نہیں، طالب علمی کا پرانا مرض، خانقاہ میں شمالی حصہ میں ایک مدرسہ بھی تھا، ایک عالم کوئی کتاب پڑھا رہے تھے، میں بھی جا کر ایک طرف بیٹھ گیا، مدرس صاحب نے ایک طالب علم کو اشارہ کیا، دیوار پر ایک تختی آویزاں تھی جس پر لکھا تھا کہ جس وقت کوئی استاد سبق پڑھا رہا ہو تو باہر کے آئے ہوئے کوئی صاحب وہاں نہ بیٹھیں، وہ تختی لائے اور مجھے دکھایا، میں شرمندہ ہو کر اٹھ گیا، اسی طرح میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کتب خانہ کس وقت کھلے گا، انھوں نے بجائے خود جواب دینے کے کہا کہ تختی پر اوقات لکھے ہوئے ہیں پڑھ لیجئے، غالباً یہی لفظی پابندی اور ضابطہ پرستی بہت سے اجنبی لوگوں کے لئے وحشت کا سبب بنتی تھی، لیکن اس کے برعکس مولانا ان ضوابط پر حاکم تھے، محکوم نہ تھے، واضع تھے مقلد نہ تھے، وہ جہاں چاہتے اور جس کے لئے چاہتے ضابطہ کو بالکل بالائے طاق رکھ دیتے اور اسی کو اس وقت کا ضابطہ سمجھتے۔

اس کے بعد نہ پھر تھانہ بھون حاضری کا اتفاق ہوا نہ لکھنؤ مولانا کے قدوم سے مشرف، البتہ مکاتبت، معنوی اور علمی استفادہ اور محبت وعقیدت کا تعلق ہمیشہ رہا، بھائی صاحب سے بھی کبھی کبھی مراسلت ہوتی، ایک مرتبہ حضرت نے ندوہ کے کتب خانہ سے بعض کتابیں مطالعہ کے لئے طلب فرمائیں اور ان کے بحفاظت واپس ہونے کے لئے اور بھیجنے والے پر کسی قسم کا بار نہ پڑنے کا اہتمام فرمایا، جو مولانا کا مزاج بن گیا تھا، اور جس کی رعایت ونگہداشت میں وہ اپنے اقران واماثل میں بھی بہت ممتاز تھے، یہاں پر مولانا کا وہ مکتوب درج کیا جاتا ہے جو مولانا نے اس موقع پر بھائی صاحب کے نام تحریر فرمایا تھا، اور جس سے مولانا کی وسعت نظر

اور وسعت قلب کا بھی اندازہ ہوگا اور اس کا بھی کہ مولانا شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور کس ادب و احترام سے ان کا نام لیتے ہیں، مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"مکرمی و محترمی دام فضلہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کتاب "اعلام الموقعین مع حادی الارواح و شفاء العلیل" سے میرا استفید ہونا ندوہ کا فیض ہے جس کا میں ممنون ہوں اور دل سے دعا کرتا ہوں، جس مضمون کو دیکھنے کو میں نے کتاب منگوائی تھی، اس مقصود میں تو میں حضرت مؤلف کا موافق نہیں ہوں، مگر خود اس مقصود میں جن مقدمات سے انھوں نے کام لیا ہے وہ بجائے خود علوم عالیہ ہیں، جن سے مجھ کو عجیب و غریب نفع ہوا، اس مضمون کو میں نے نقل بھی کرا لیا جس کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ جس وقت مجھ کو یا کسی دوسرے دوست کو فرصت ہو تو اس کا جواب ادب کے ساتھ لکھا جاوے، اس نقل کے سبب واپسی میں دیر ہوئی، الحمدللہ آج اس کو واپس کر کے سرخ رو ہوتا ہوں، ایک خط میں آمد کا محصول و مصارف عہ لکھا تھا اس لئے عہ بصورت ٹکٹ روانہ خدمت ہے اگر گرانی نہ ہو تو ایک کارڈ پر پہونچنے کی اطلاع فرما کر مطمئن کر دیا جاوے، باقی بجز دعا گوئی و دعا جوئی کیا عرض کروں، والسلام اشرف علی از تھانہ بھون۔

ملفی محصول ادا شدہ حاضر ہے"

رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا محمد الیاس صاحب لکھنؤ تشریف لائے اور اس کی وجہ سے شہر میں ایک خاص برکت و رونق اور دینی و ایمانی فضا پیدا ہو گئی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی دوسرے روز تشریف لے آئے ایک بڑی تبلیغی جماعت بھی آئی ہوئی تھی، ہم سب لوگ اسی دینی دعوت اور تبلیغی نقل و حرکت میں مصروف اور مسرور تھے کہ اچانک

یہ جانگداز اور روح فرسا خبر سنی کہ ۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ (۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء) کو تھانہ بھون کا یہ آفتاب علم وارشاد غروب ہوگیا حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی بھی ٹھیک انہی دنوں میں لکھنؤ تشریف لائے، معلوم نہیں انھوں نے یہ خبر راستہ میں سنی یا لکھنؤ آکر لیکن ان کی بے قراری اور رنج وقلق دیکھنے کا تھا اس وقت ہم لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ان کو اپنے شیخ سے کیسا گہرا تعلق ہے، کسے معلوم تھا کہ اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائیں گے، اور ہندوستان ان دو جلیل القدر ہستیوں سے محروم ہو جائے گا۔

"کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربك ذو الجلال والاکرام"

دل میں کس کی بزمِ عشرت کا سماں رکھتا ہوں میں
اپنی نظروں میں جمالِ دو جہاں رکھتا ہوں میں

کنجِ تنہائی کی مونس، شامِ غربت کی رفیق
ایک تصویرِ خیالی حرزِ جاں رکھتا ہوں میں

(حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

مقالہ نمبر ۷

حضرت حکیم الامت

ایک عظیم انسان

اور

بہترین مصلح تھے

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے ایک ضخیم کتاب "حکیم الامت" تحریر فرمائی ہے جو بڑے سائز کے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اس کی ترتیب و تسوید کا کام تو حضرتؒ کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۴۵ء میں ختم ہو گیا تھا لیکن اس کے پریس سے پہلی بار نکلنے کی نوبت ۱۹۵۲ء میں آئی۔ مولانا دریا بادی کا تعلق حضرتؒ سے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۳ء تک رہا۔ اس طویل مدت کے تجربہ، سابقہ اور مشاہدہ میں انہوں نے حضرتؒ کو کیسا پایا اس کی تفصیل سے کتاب کے اوراق پر ہیں۔ ان کی رائے سے متعلق چند اقتباسات[1] ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ (وکیل احمد شیروانی)

حکیم الامتؒ ایک عظیم انسان اور بہترین مصلح تھے

(۱) حکیم الامت[2] مولانا اشرف علی تھانویؒ بزرگ کس مرتبہ اور ولی اللہ کس پایہ کے تھے، اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو، اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی ـــــــــ یہ مجموعۂ اوراق نہ کتاب المناقب ہے، نہ ملفوظات مرشد، اور نہ سیرۃ الشیخ، اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں سب سے پست بھی ہے۔

"حضرت شیخ" کے فضائل و کمالات اپنی جگہ پر، بہرحال اشرف علی تھانویؒ نامی ایک انسان بھی تو اسی صدی میں ہوئے ہیں، ان کی عمر کے آخری ۱۵، ۱۶ سال

---

[1] اضافہ بوقت نظر ثالث ۱۲م۔

[2] حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات (مطبوعہ اشرف پریس لاہور) ص ۷، ۸

کے زمانہ میں اس نامۂ سیاہ کو اُن سے نیاز اور اپنی بساط کی حد تک گہرا نیاز حاصل رہا اور اس نے اپنے لمبے تجربے اور سابقے میں انہیں ایک "بہترین انسان" پایا۔ بس ان کی اسی انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس ان "نقوش و تاثرات" کے اندر بند کر دینے کی کوشش الٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی اور چونکہ ان کی انسانیت ان کے مفسر و فقیہ و درویش ہونے سے الگ بھی نہیں کی جا سکتی، اس لئے ضمناً ذکر اُن کے علم و فضل، تفقہ و سلوک کا لانا بھی ناگزیر ہو گیا۔ ؎

بنتی نہیں ہے بادۂ ساغر کہے بغیر

ورنہ درحقیقت مصوری صرف اُن کی انسانیت کی کرنی تھی وہ بھی اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کے حدود کے اندر۔

(۲) مرشد[1] کی تلاش ایک عرصہ سے جاری تھی، تصوف اور سلوک کا ذخیرہ، جتنا کچھ بھی فارسی اور اُردو اور ایک حد تک عربی میں ہاتھ لگ سکا تھا، پڑھ لیا گیا تھا۔ اتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور اتنے ملفوظات چاٹ جانے کے بعد، اب آرزو اگر تھی تو ایک زندہ بزرگ کی۔ دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد جیسے مرکزی شہر اور اجمیر اور کلیر، دیوہ اور ردولی، مارہرہ اور صفی پور، "چھوٹے بڑے آستانے" خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے اور سُن گُن جہاں کہیں کسی بزرگ کی بھی پائی، حاضری میں دیر نہ لگائی۔ حال والے بھی دیکھنے میں آگئے اور قال والے بھی، اچھے اچھے عابد، زاہد، مرتاض بھی اور بعض نرے دکاندار قسم کے گیسو دراز بھی۔ آخر میں فیصلہ یہ کیا کہ حق حلقۂ دیوبند میں محصور ہے، انتخاب کے دائرہ کو محدود کر کے، اب تفصیلی جائزہ اسی حلقے کا

---

[1] "حکیم الامت" ص ۱۳، ۱۴

لیجیئے اور جس نے بہترین متنِ سلوک (مثنوی معنوی) کی بہترین شرح لکھ ڈالی اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں حقائق و معارف کی روح بھر دی ہے، دامن اس کے کسی تربیت یافتہ کا تھامئے۔

تلاشِ مرشد کے سلسلہ میں وصل بلگرامی مرحوم کی رفاقت میں، ایک سفر صفی پور ضلع اُناؤ کا ہوا۔ واپسی میں وصل صاحب کہنے لگے کہ بہت دوڑ دھوپ آپ کر چکے، ذرا ہمارے مولانا کا بھی تجربہ کیجئے، سب کو بھول جائیے گا۔ تھانہ بھون اگر دُور ہے تو قصد السبیل، تربیت السالک وغیرہ میرے پاس ہی ہیں، انہیں تو دیکھ ڈالئے" دوسری ہی صبح کتابوں کا ایک پورا پلندہ لئے ہوئے وصل صاحب میرے ہاں لکھنؤ میں موجود! کتابیں پڑھ کر جب بند کیں تو عالم ہی دوسرا تھا ع اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں

اپنا جہل اپنے سامنے آئینہ! معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ اس سلسلہ میں پڑھا تھا، سنا تھا، جانا تھا، وہ بس جھک ماری تھی، تصوّف کی حقیقت، طریق کی تعریف آج پہلی بار دل و دماغ کے سامنے آئی۔

قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا اور سطر سطر پر، پردے، نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے۔ رہ رہ کر طبیعت اپنے ہی اوپر جھنجھلاتی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا۔ ۱۶ برس کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے؟ آج تک اپنے اس جہل کے انکشاف کی یاد تازہ ہے۔ آہ[1]

(۳) ایک خط میں حضرتؒ والا کو تحریر کیا کہ۔

"جنابؒ کی تصانیف سلوک حال میں دیکھیں اور دل پھڑک گیا۔

---

[1] "حکیم الامت" ص ۱۵، ۱۶

اب تک آپ کو مولوی کی حیثیت سے جانتا تھا، عارفانہ کمال
کا حال تو اب کھلا۔ آھ "

(۴) مولانا[1] بڑے صوفی، محض عارف، صرف زاہد نہ تھے، متکلم بھی تھے، معقولی بھی تھے۔ اور سب سے بڑھ کر مصلح و معلم تھے۔

(۵) بزرگوں[2] کی زیارت کا اتفاق اس سے قبل بھی ہو چکا تھا۔ لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃؒ صاحبِ علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے تارک، زاہد، مرتاض بزرگ تھے، صفی پور (ضلع اناؤ) کے شاہ عزیز اللہ بھی اپنے رنگ میں فرد تھے۔ وقس علیٰ ہذا، لیکن یہاں کا مضمون ہی کچھ اور تھا۔ ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

حضرت کی شان ہی سب سے الگ، سب سے نرالی تھی، نہ فقر و فاقہ نہ تجرد، نہ بیوی بچوں کا ترک، اور نہ شدید قسم کے مجاہدے اور نہ رسم درویشی اور شیخت کے کوئی سے بھی آداب و رسوم۔ بلکہ دیکھنے میں سارا سامان دنیا داری ہی کا موجود، اچھے خاصے پختہ اور بلند مکان، نوکر چاکر، کھانے دو دو تین تین قسم کے، لباس خاصا اُجلا شفاف۔ بڑی زبردست ڈاک کی آمد و رفت۔ غرض بہ ظاہر ہر طرف دنیا ہی دنیا، لیکن وہ دنیا ایسی کہ اُس کے ہر جُزو پر دین کی حکومت غالب، طبیعت و بشریت کی پوری پوری آزادیاں لیکن وہی شریعت کی پابندی میں۔ تین دن کے قیام میں ان مادی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا، اور دل کی بصیرت نے اپنی بساط کے لائق کچھ نہ کچھ سمجھ لیا۔ اور سب سے بڑا

---

[1] حکیم الامت ص۔ ۱۹

[2] حکیم الامت ص۔ ۵۵، ۵۶

قابل وہ چھپا ہوا معذرت[1] نامہ! بزرگی کے دعوے نہیں، درویشی کی تعلیاں نہیں، مشیخت کی شیخیاں نہیں، جذب کی شوخیاں نہیں، بلکہ اُلٹا تقصیروں کا اعلان، لغزشوں کا اظہار! ہائے! ہائے! کوئی اس عبدیت کی دلآویزی لا کہاں سے سکتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا

عبدیت کا مرتبہ اور انابت کا جو درجہ ہے کون سا حال اور کون سا مقام اُسے پا سکا ہے؟ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا کی آہ و زاری نے ابوالبشرؑ کے جو مرتبے بڑھائے، کس بشر کی مجال ہے کہ انہیں بھلائے؟ بڑی سے بڑی ریاضتیں بڑے سے بڑے مجاہدے بھی، اس ایک شکستگی، اس ایک افتادگی، اس ایک بے چارگی کے مقابلہ پر لائے جا سکتے ہیں؟

ایک خونچکاں کفن ہیں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

(۶) مولانا[2] عالم بے بدل اور درویش کامل تو خیر تھے ہی، لیکن ان سب سے پہلے، اور ان سب سے بڑھ کر، انسان تھے، حقیقی انسانیت کا ایک نمونہ، اور جس نے اُن کے اس جوہر کو نہ پہچانا، اس نے ان کو ذرا بھی نہ پہچانا۔

---

[1] اشارہ ہے اس مطبوعہ اعلان کی طرف جس کا پہلا عنوان "معذرت از اشرف بخدمت اہل حقوق" اور دوسرا عنوان اس سے جلی تر "العذر و النذر" تھا"۔ ۱۲م

[2] حکیم الامت ص ۷۰ تا ۱۲۲

(۷) حضرت[1] کی تصانیف، ملفوظات، مواعظ کے مطالعہ کا سلسلہ برابر تیزی، سرگرمی، مستعدی سے جاری تھا، خوب خوب نکتے ملتے تھے، بڑی بڑی بصیرتیں حاصل ہوتی تھیں، برسوں کے جمے ہوئے عقائد و خیالات پر بار بار نظر ثانی کرنی پڑتی تھی۔ بعض بعض مسائل پر طبیعت پھڑک اٹھتی تھی، زبان سے بے اختیار داد اور دعا دونوں نکلتیں، دل کبھی کبھی انہیں غزالی وقت ٹھہراتا اور کبھی چپکے چپکے اللہ سے ان کی عمر اور صحت میں برکت طلب کرنے لگتا، غرض عقیدت وعظمت کی ہر منزل گویا دل میں گھر کئے ہوئے تھی۔

(۸) ملفوظات[2] کے صدہا صفحات میں صدہا جواہر پارے مجھے ملے۔ ایسی ایسی نادر اور بیش بہا تعلیمات ملیں جو اور کہیں نہ ملی تھیں۔

(۹) ...... ان دنوں[3] اپنا مشغلہ کچھ فقہ ہی کی کتابوں کی اُلٹ پُلٹ کرتے رہنے کا ہو گیا تھا، چاہے جتنا اور جیسا، جو کچھ بھی سمجھ میں آئے کبھی ہدایہ اور کبھی فتح القدیر، کبھی دُرمختار اور کبھی اس کی فاضلانہ و محققانہ شرح ردّالمختار، اور کبھی بدائع الصنائع، اور کبھی السیر الکبیر، کبھی ان کے اصل متن اور کبھی ان کے اردو ترجمے، عربی شرحیں، اور یہ فیض بھی تمام تر اسی بارگاہ کا تھا، ورنہ فقہ و فقہا دونوں کے خلاف تو تعصب کا رنگ برسوں سے جما ہوا تھا، اور ہر فقیہ اپنے خیال میں نرا کٹھ ملا تھا، یہ علم مولانا ہی کی مجلس میں بیٹھ بیٹھ کر، اور ان کی زبان سے مختلف فقہی مسائل کی توضیح و تشریح بار بار سن کر، حاصل ہوا تھا کہ فُقہاء کی جماعت کم مقام

---

[1] حکیم الامت ص ۱۳۷ [2] حکیم الامت ص ۱۳۹

[3] حکیم الامت ص ۱۳۹

کی نہیں، درحقیقت حکماء کی جماعت ہوئی ہے اور فقہ اٹکل پچو باتوں کا نام نہیں قرآن وسنت ہی کی حکیمانہ تشریح واستنباط کا نام ہے ۔ مجلس اشرفی کے بیشمار فیوض میں سے ایک فیض یہ تھا کہ مشائخ صوفیہ کے ساتھ محبت اور علماء وفقہاء کے متعلق عظمت اہل مجلس کے دلوں میں پیدا ہی ہو جاتی تھی ۔

(۱۰) بزرگی[1] کی حکایت کسی بزرگ سے پوچھیئے، اور ولایت کی تحقیق کسی ولی اللہ ہی سے کیجئے، یہ عامی تو اپنے تجربہ اور مسلسل تجربہ سے بس اتنا جانتا ہے کہ اشرف علی تھانوی نامے ایک انسان، بہترین دوست، بہترین میزبان، بہترین مخدوم، بہترین عزیز، بہترین ہمسایہ، غرض انسانی کمالات واوصاف کے لحاظ سے ایک بہترین انسان ہوئے ہیں ۔

(۱۱) ...... ان[2] ہی تجربوں سے تو یار بار کہنا پڑتا ہے کہ عالم وفاضل، ذاکر وشاغل، عابد وزاہد، بزرگ ودرویش ہونا اور چیز ہے اور حکیم ومصلح ہونا کچھ اور ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

(۱۲) [3] ...... مولانا کی ڈاک کی کثرت" کا ذکر آ گیا ہے تو اس متن کی مجمل شرح بھی ذرا سنتے چلیئے .... ڈاک کا اس قدر اہتمام تھا کہ حضرت کے تنخواہ دار ملازمین (تعداد میں عموماً دو رہا کرتے) میں سے ایک صاحب ضرور وقت مقررہ پر ڈاک خانہ پہنچ جاتے اور پوسٹ مین (ڈاکیہ) کے ذریعہ سے تقسیم کا انتظار کئے بغیر سہارنپور کی طرف سے آنے والی ڈاک لے کر چستی ومستعدی کے ساتھ حاضر خدمت

---

[1] حکیم الامت ص ۱۴۴ [2] حکیم الامت ص ۱۵۳ [3] حکیم الامت ص ۱۹۸ - ۱۹۹

ہوجاتے، حضرت کبھی تو اس وقت سہ دری میں تشریف رکھتے ہوتے۔ اور کبھی زنان خانہ تشریف لے جاچکے ہوتے، ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے، خصوصاً پوسٹ کارڈ، ان کو تو اسی وقت پڑھ ڈالتے، اور ڈاک کا جواب اس کے دو گھنٹہ کے بعد، بعدِ ظہر کی مجلس کے لئے اٹھ رہتا۔ خطوط کی تعداد روزانہ ۳۰، ۳۵ سے کیا کم ہوتی، بعض دن اور زائد، پھر خط بھی مختصر اور چند سطری نہیں، بڑے لمبے چوڑے، اور فقہ و سلوک، کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق۔ ایک حضرت ہیں اور خطوط کا یہ پُشتارہ۔ ارد گرد حاضرین بزم حلقہ کیے ہوئے، خواص بھی، عوام بھی، مسئلے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے چھڑے ہوئے، حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں، حاجتمندوں کو تعویذ بھی لکھ کر دیتے جاتے ہیں، اور ساتھ ہی خط کا جواب بھی اس کے حاشیے پر، یا بین السطور تحریر کرتے جارہے ہیں۔ جواب کی جامعیت سبحان اللہ، جوابات جس طرز و انداز کے ہوتے ہیں اس کی مثالیں تو اوپر کے صفحات میں دو چار نہیں، بکثرت گذر چکیں، اللہ اللہ، دماغ کتنا حاضر پایا تھا! عموماً یہ سارے جوابات اسی طرح قلم برداشتہ لکھ دیتے جاتے اور اتنے جامع و محققانہ ہوتے کہ دوسروں سے شاید پورے غور و فکر کے بعد بھی نہ بن پڑتے، خال خال خط ایسے بھی ہوتے جن کو جواب کے لئے مولانا دوسروں کے حوالے کر دیتے، یہ وہی خطوط ہوتے جن میں کتابوں کے حوالہ کی ضرورت ہوتی۔

بارہا ایسا بھی ہوتا کہ ابھی یہ انبار نمٹنے نہ پاتا کہ دوسری ڈاک سہ پہر کو دہلی کی طرف سے بھی آجاتی اور دو چار خطوط اس میں بھی ہوتے! جواب کے لئے یہ التزام رہتا کہ حتی الامکان سب ذو تمبرے ہی دن نکل جائیں۔ اور یہ منظر بھی ان آنکھوں کا

دیکھا ہوا ہے کہ دن ختم ہو گیا، اور حجم و ضخامت والی ڈاک ختم نہ ہو پائی۔ اب مولانا اس سن وسال میں، بعد نمازِ مغرب و اورادِ مغرب، لالٹین سامنے رکھ کر اور قلم ہاتھ میں لے، بیٹھ گئے ہیں، اور رات گئے تک کام کر کے، ڈاک کو اپنے ہاتھ سے ختم ہی کر کے اٹھے ہیں۔

اس مختصر سی تفصیل سے یہ تو بہر حال معلوم ہی ہو گیا ہو گا کہ حضرت اس رنگ کے صوفی صافی بالکل ہی نہ تھے، جس میں درویشی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ انسان خلق سے بالکل کنارہ کر کے تنہا کسی جنگل میں رہنا شروع کر دے، اور انسانوں سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے۔

بہر حال حضرت حکیم الامت کی شان سب سے الگ سب سے نرالی تھی۔ نہ فقر و فاقہ، نہ تجرد، نہ بیوی بچوں کا ترک اور نہ شدید قسم کے مجاہدے اور نہ رسمی درویشی اور مشیخت کے کوئی سے بھی آداب و رسوم بلکہ دیکھنے میں سارا سامان دنیا داری کا تھا۔ اچھے خاصے پختہ اور بلند مکانات، نوکر، چاکر، کھانے دو دو تین تین قسم کے لباس خاصا اُجلا، شفاف بڑی زبردست ڈاک کی آمد و رفت غرض بہ ظاہر ہر طرف دنیا ہی دنیا۔ لیکن وہ دنیا ایسی کہ اس کے ہر ہر جزو پر دین کی حکومت غالب، طبیعت و بشریت کی پوری پوری آزادیاں لیکن وہی شریعت کی پابندیاں۔

مولانا عالم بے بدل اور درویش کامل تو خیر تھے ہی، لیکن ان سب سے پہلے اور ان سب سے بڑھ کر انسان تھے۔ حقیقی انسانیت کا ایک نمونہ اور جس نے ان کے اس جوہر کو نہ پہچانا۔ اس نے ان کو ذرا بھی نہ پہچانا۔

بزرگی کی حکایت کسی بزرگ سے معلوم کیجیے اور ولایت کی تحقیق کسی ولی اللہ ہی سے کیجیے۔ یہ عامی تو اپنے تجربہ اور مسلسل تجربہ سے بس اتنا ہی جانتا ہے کہ اشرف علی تھانوی نامی ایک عظیم انسان، بہترین دوست، بہترین میزبان، بہترین مخدوم، بہترین عزیز، بہترین ہمسایہ۔ غرض کہ ہر کسی کمالات و اوصاف کے لحاظ سے ایک بہترین انسان تھے۔

حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے۔ طریقت اور سلوک میں بھی مقام رفیع کے مالک تھے ان کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی، علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔ تحریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے اور اس میں انہیں کسی لومتہ لائم کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گوشہ نشین تھے۔ مگر ان کا آستانہ بڑے ارباب و ثروت و دولت اور اصحاب علم و فضل کی عقیدت گاہ تھا۔ جو بات اور جو عمل تھا اخلاص اور دیانت کے ساتھ تھا، دنیوی وجاہت اور شہرت اور مالی حرص و آز کا شاید دل کے آس پاس بھی کہیں گزر نہ ہوا تھا۔ اپنے اصول اپنے عقیدہ و خیال پر اس مضبوطی اور پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کر سکتی تھی۔ حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا چشمہ صافی تھا کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب ہو کر چلے جاتے تھے۔

وہ لوگ جن کی زندگیاں معصیت کوشی اور عصیاں آلودگی پر بسر ہوتی تھیں یہاں سے پاک وصاف ہو کر اور گوہر مقصود سے دامان آرزو کو بھر کر واپس آتے تھے۔ ان کی زندگی اتباع سنت کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموز طریقت کا دفتر گراں مایہ

تھی۔ بعض مسائل پر علماء ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ لیکن
تقویٰ و طہارت، تفقہ فی الدین، شرعی علوم پر مہارت و بصیرت راست گفتاری اور
مخلصانہ عمل کوشی، انابت الی اللہ، بے لوث خدمت دین بے غرضانہ تلقین، رشد و
ہدایت حکیم الامت مرحوم کے وہ اوصاف عالیہ اور فضائل حمیدہ تھے۔ جو ہر موافق و
مخالف کے نزدیک برابر مسلم رہے۔ (البرہان دہلی ۴۳ء ۱۹)

حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے قریب رہ کر دوسروں نے ذکر و شغل وغیرہ عناصر
بزرگی کی جو بھی تعلیم حاصل کی ہو اس عامی کو تو سب سے بڑا سبق حضرت تھانویؒ
کی ہمہ وقتی زندگی سے آدمیت، انسانیت، حسن معاشرت اور کمال اخلاق ہی کا
ملا۔ آخرت تو ملتی ہی ہے دنیوی زندگی بھی طریق اشرف ہی پر چلنے سے بہترین اور
خوشگوارترین بسر ہو سکتی ہے۔

اپنی اس ۷۶ سالہ زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے۔ بڑے بڑے عابد،
زاہد، متقی، تہجد گزار، نظر سے گزرے، لیکن اصلاح و ارشاد کی مسند نشینی کا حقدار
اپنے سولہ سال کے تجربہ میں جیسا کہ حضرت حکیم الامت تھانوی کو پایا کسی اور کو نہ پایا۔

؎ عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

مولانا تھانوی کی ذات خود دینی حیثیت سے عجیب ذات تھی، کوئی صرف
فقیہ ہوتا ہے اور طریقت سے کورا، کوئی محض صوفی ہوتا ہے اور کلام کے مباحث سے
ناآشنا حضرت مولانا مرحوم ایک ہی وقت میں صوفی محقق بھی تھے اور متکلم بے بدل
بھی۔ رومی عصر بھی، اور رازی وقت بھی۔ فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث و تصوف

کے علاوہ کلام قدیم جدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں، وعظوں میں برابر بیان ہوتے رہتے اور ہم جیسے کتنے بے مایہ اور کم مایہ، یہیں سے خوشہ چینی کر کے اپنی بناتے، اپنی دکان چمکاتے۔

بہرحال مولانا نرے صوفی، محض عارف، صرف زاہد نہ تھے۔ متکلم بھی تھے، معقول بھی تھے اور سب سے بڑھ کر مصلح و معلم تھے۔

(نقوش و تاثرات)

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ

بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

مقالہ نمبر

علم و عرفان

کا

آفتابِ عالمتاب

حکیم الامت حضرت تھانویؒ

محترم جناب مولانا محمد محترم فہیم صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

علم و عرفان کا آفتاب عالمتاب

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ

چودھویں صدی ہجری کی آمد آمد ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا شاہ اسماعیل شہید اور ان کے پیر حضرت سید احمد بریلوی کا دور گزر چکا ہے۔ شریعت اسلامیہ کا حقیقی حسن و جمال جو ان حضرات کی مساعی سے روشن ہوا تھا پھر دھندلانے لگا ہے۔ بدعات و رسوم کو پھر فروغ ہو چلا ہے۔ مسلمانوں کے نہ عقائد صحیح رہے ہیں نہ عبادات، نہ معاشرت و معاملات، اخلاقیات کی زبوں حالی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ سینکڑوں نئے نئے فتنے مختلف فرقوں اور مختلف شکلوں میں سر اٹھا رہے ہیں۔ طریقت و حقیقت کے نام سے زندقہ پھیل رہا ہے۔ دکاندار صوفیا کے ڈھونگ نے نو تعلیم یافتہ طبقے میں دین سے تنفر کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ معاشرے میں مغربیت کا زہر اپنا اثر دکھا رہا ہے، یہودیت و نصرانیت کے مادر پدر آزاد تمدن کو قبول عام کا درجہ حاصل ہوتا جا رہا ہے۔ عوام الناس میں دین اسلام سے بیگانگی اپنی جگہ خواص بھی راہِ اعتدال سے دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ عام اہل علم مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی

کا شکار ہیں۔

مختصر یہ کہ ہندوستان تمام تر دینی ابتری کی زد میں ہے تاریکیاں بڑھتی جارہی ہیں کہ رحمت حق یکبارگی پھر جوش میں آتی ہے اور تیرھویں صدی کے دھائے واپسیں میں ایک آفتاب طلوع ہوتا ہے جو چودھویں صدی کے پہلے قدم کے ساتھ ساتھ تیزی سے عروج کے منازل طے کرتا رہا۔ پندرھویں منزل میں اپنے نصف النہار پر متمکن نظر آتا ہے۔

یہ آفتاب عالم تاب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ذات ستودہ صفات کی صورت میں ۱۲۸۰ھ میں طلوع ہوا۔ ۱۳۰۱ھ میں کانپور کے مدرسۂ فیض عام میں مسند تدریس سے ضوفشانیاں کرتا ہوا ۱۳۱۵ھ میں تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ کا نور رُشد و ہدایت بن کر چمکا اور پھر مسلسل سینتالیس اڑتالیس سال تک علم و فضل اور ارشاد و ہدایت کی کرنیں بکھیرتا رہا۔ تاآنکہ ۱۳۶۲ھ میں یہ چمکتا و یکتا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

۱۳۱۵ھ سے ۱۳۶۲ھ تک حضرت تھانویؒ نے اپنی زبان و قلم اور علم و عمل کے ذریعہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش حیات کو اجاگر کرنے کا ایسا کامیاب کام انجام دیا کہ خلق خدا بے اختیار آپ کو مجدد ملت کہہ اُٹھی۔ اصلاح عقائد و اعمال، ابطالِ رسوم و بدعات کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی کہ قوم قطب العالم کے لقب سے یاد کرنے لگی اور حضرت اقدس نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا کہ امت مسلمہ کے ہر فرد کی زبان حکیم الامت کے خطاب

سے تر نظر آنے لگی۔

اسلاف کے علوم کے امین:

مجدد ملت قطب عالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے علمی، دینی اور روحانی فیوض و برکات کو اس مختصر سے مضمون میں کیسے سمویا جائے وہ مولانا یعقوب نانوتوی اور مولانا قاسم نانوتوی رحمہما اللہ کے علوم کے محافظ تھے وہ حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے علوم لدنی کا خزانہ تھے۔ ان کی ذات میں حضرات چشت، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یک جا تھیں۔ ان کا سینہ چشتی ذوق و عشق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا ان کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی ان کا قلم فقہ و تصوف کا حسین امتزاج تھا ان کی تقریریں روحانی مریضوں کے لیے شفا کا پیغام تھیں اور ان کی تحریریں دقائق علمی اور حقائق ایمانی کا پیکر تھیں۔

حضرت تھانوی اپنی ذات میں علم و معرفت کا ایک جہان تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں مفسر قرآن بھی تھے اور محدث بھی، فقیہہ بھی تھے اور صوفی بھی، خطیب بھی تھے اور متکلم بھی۔

شان جامعیت:

قرآنی علوم و حکم کی شرح کرنے پر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے آپ سے

بڑھ کر مفسر قرآن کوئی نہیں احادیث کے اسرار و نکات بیان کرتے ہیں یہ لگتا ہے محدث دوراں ہیں فقہی گتھیاں سلجھانے لگتے ہیں تو بے مثال فقیہہ کے مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ تصوف کے رموز و غوامض کو آشکارا کرنا شروع کرتے ہیں تو علم و معرفت اور رشد و ہدایت کے ایسے موتی بکھیرتے ہیں کہ قطب دوراں کے لباس میں جلوہ گر نظر آنے لگتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے طریقت و سلوک میں بھی اسی طرح مقام رفیع پر فائز تھے۔ آپ کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی۔

آپ کا آستانہ بڑے بڑے اصحاب علم و فضل اور ارباب ثروت و دولت کی عقیدت گاہ تھا آپ کی خانقاہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا چشمہ تھا جس کی طرف دن رات سینکڑوں تشنہ کام آتے اور سیراب ہو کر جاتے۔ آپ کی ہمہ گیر تربیت کے زیر اثر ہزاروں معصیت کوش اور عصیاں آلود روحیں پاک و صاف ہو کر اور گوہر مقصود سے دامن بھر کر لوٹیں۔

فیضان عام:

حضرت کا فیضان عام تھا اس سے علماء بھی مستفیض ہوئے اور صلحاء بھی عوام بھی اور خواص بھی، امیر غریب عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے سب اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس بحر علم و معرفت سے سیراب ہوتے رہے ہیں۔

آپ کے حلقہ ارادت میں ہمیں علماء، فضلاء، مفسرین، محدثین، فقیہہ،

تاریخ دان، سیاستدان، فلاسفر، صحافی، ادیب اور خطیب ہر قسم کے لوگ نظر آتے ہیں اور انہی کی صفوں میں ہمیں عام آدمی دیہاتی، غرباء اور متوسط طبقے کے افراد بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مواعظ کی اثرانگیزی:

اپنے سینکڑوں مواعظ اور ایک ہزار سے زائد تصانیف کے ذریعے حضرت تھانوی نے اصلاح امت کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

آپ کی تقریروں میں بلا کی اثرانگیزی تھی جس بات کو آپ حق سمجھتے برملا کہتے کسی لومتہ لائم کی کبھی پرواہ نہ کرتے۔ ہندوستان کے اکثر چھوٹے بڑے شہروں اور ریاستوں کے دارالخلافوں میں آپ کے وعظ ہوتے۔ دور دور سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں شرکت کے لیے آتے۔ جس شہر میں حضرت کے چند مواعظ ہو گئے بس سمجھ لیجیے شہر کی کایا پلٹ گئی۔ مسجدیں آباد ہو گئیں۔ دکاندار مشائخ کے بازار سرد ہو گئے۔ نو تعلیم یافتہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ آپ کے مواعظ سے جدید ذہن کے شبہات چشم زدن میں رفع ہو جاتے اور دین کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے آجاتی۔ تقریروں میں حق بات کو نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے اور ایسا عجیب و غریب منطقی اور عقلی استدلال پیش کرتے کہ تصدیق و تائید کے سوا چارہ نظر نہ آتا۔ بات سے بات پیدا کرنا اور ہر معاملے کی اصل حقیقت کو واشگاف کرنا آپ کی تقریروں کا خاص جوہر تھا۔ تقریر کے دوران شبہات

اعتراضات اور علمی اشکالات از خود سامنے لاتے اور خود ہی جواب دیتے۔ پھر جو کچھ فرمانا چاہتے کبھی اجمال سے کبھی تفصیل کے ساتھ کبھی حکایتوں کے ذریعے کبھی روایتوں کی مدد سے اور کبھی اشعار کی روشنی میں دل میں اتار کر دم لیتے ۔ حضرت کے سامعین میں ہر طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ اہل علم، اہل باطن، موافق و مخالف، خواص و عوام، جج، وکلاء، تجارت پیشہ، دفتری شہری، دیہاتی غرض ہر طرح کے لوگ ہوتے مگر آپ کا طرز تخاطب ایسا دلکش اور دل نشیں ہوتا کہ ہر شخص یہ سمجھتا میرے دل کی بات کہہ رہے ہیں۔

یوں تو حضرت تھانوی ؒ نے اپنی زندگی میں ہزاروں وعظ فرمائے لیکن جس قدر قلم بند ہو گئے ہیں اور مستقل تصنیف کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ان کی تعداد بھی چار سو سے زائد ہے ، آپ نے نہ کبھی فرمائشی وعظ کہے اور نہ وعظ گوئی کا کوئی معاوضہ قبول کیا۔ وعظ کے لیے جہاں کہیں جاتے وہاں دعوتوں تک سے گریز فرماتے، اپنے ساتھیوں کا بار بھی کسی پر نہ ڈالتے ۔

تصانیف کی کثرت:

مواعظ کے علاوہ چھوٹے بڑے رسالے اور مستقل تصانیف جو حضرت کے قلم سے شائع ہو کر مقبول عام ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد تازہ ترین شمار کے مطابق ایک ہزار چار سو کے قریب بیان کی جاتی ہے جن میں کثیر تصانیف امت مسلمہ میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اردو عربی کے علاوہ آپ کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانوں میں بھی کیا گیا چنانچہ

متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی، پشتو، بنگالی، گجراتی اور سندھی زبان میں شائع ہوئے۔

خلوص اور للّٰہیّت کی زندہ مثال:

مولانا کی تمام تصانیف کی مجموعی قیمت کا اگر موجودہ زمانے کے لحاظ سے اندازہ لگایا جائے تو یقیناً پانچ کروڑ روپے سے کم نہیں ہے۔ مگر مولانا کے خلوص اور آپ کی للّٰہیّت کی کیفیت ملاحظہ کیجیے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف جو آپ کی زندگی ہی میں حاصل ہو گئی تھی۔ آپ نے کبھی کسی کتاب کا حق اشاعت وطبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا ہر شخص کو ان کو چھاپنے اور شائع کرانے کی کھلی اجازت ہے۔ دیگر تصانیف تو اپنی جگہ پر اکیلی تفسیر بیان القرآن جو قرآنی علوم و معارف کا خزانہ ہے۔ نیز فقہ کی جامع کتاب بہشتی زیور جس کو حضرت نے خاص طور سے عورتوں کے لیے ترتیب دیا تھا۔ یہ دونوں کتابیں اکیلی ایسی گراں بہا اور کثیر الاشاعت تصانیف ہیں کہ اگر انہی کا حق اشاعت محفوظ کر لیا جاتا تو نسلوں کے لیے کافی ہوتا مگر وہاں تو مالی حرص و آز کا شاید دل کے آس پاس بھی کہیں گذر نہ ہوا تھا ان دونوں کتابوں کو بھی طبع کرانے کا اذن عام ہے یہ دونوں کتابیں اردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور موخر الذکر کتاب یعنی بہشتی زیور تو اس قدر مقبول ہوئی

کہ ہندو پاکستان کا شاید ہی کوئی اردو دان ایسا ہوگا جس نے کم ازکم اس کا نام نہ سُنا ہوگا۔

تصانیف کا مقام بلند

آپ کی تصنیفات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ شریعت وطریقت کا شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہوگا جس پر حضرت تھانوی نے قلم نہ اٹھایا ہو اور اس موضوع کا پورا پورا حق ادا نہ کیا ہو، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، سیرت، علم سلوک و تصوف غرض کونسا موضوع ایسا ہے جس پر حضرت کی مستقل تصانیف موجود نہیں ان میں مختصر رسائل بھی ہیں اور بڑی مبسوط کتب بھی جو کئی کئی جلدوں میں ہیں اہم تصانیف میں تفسیر بیان القرآن اور بہشتی زیور کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اعلاء السنن نشر الطیب، المصالح العقلیہ، التکشف التشرف، مسائل السلوک تربیت السالک، امداد الفتاوی بوادر النوادر شرح مثنوی مولانا روم، حیاۃ المسلمین صیانتہ المسلمین، اصلاح الرسوم، مناجات مقبول اعمال قرآنی وغیرہ سرفہرست ہیں۔

حضرت کی تصانیف کسی خاص طبقے کے لیے مخصوص نہیں۔ علماء فضلاء، ارباب شریعت اور اصحاب طریقت مرد اور عورتیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اندو خواں ہر کوئی ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اسرار و حکمات کے علاوہ ایسا عجیب وغریب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے حریف بھی تصدیق وتائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا آپ کی تحریریں حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار رحمانی اور رموز حکمت ربانی سے پُر نظر آتی ہیں

ہر تحریر میں اہل نظر کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا مصنف کے ذہن میں سارے مسائل و مواد یک جا مستحضر ہیں اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے کبھی موضوع میں غلو نہیں ہو پاتا۔ موضوع کے کسی ایک گوشے کو بیان کرتے وقت دوسرے گوشوں سے قطعاً ذہول نہیں ہو پاتا۔

تجدید طریقت:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح شریعت ظاہرہ کو جہالت و ضلالت کی تاریکیوں سے نکالنے کا کام کیا اسی طرح طریقت باطنہ کو بھی افراط و تفریط کی بھول بھلیوں سے نجات دلائی۔ آپ کی تجدید طریقت کا بڑا کمال یہ ہے کہ طریقت کو جو ایک زمانے سے صرف چند رسوم کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی زوائد و حواشی سے پاک وصاف کر کے قدماء اور سلف صالحین کے راہ پر لے آئے۔ آپ نے پورے شد و مد کے ساتھ اس حقیقت کو ظاہر فرمایا کہ طریقت عین شریعت ہے۔ شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ آپ کے یہاں طریقت کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں صحابہ کرام کا سا ذوق پیدا ہو جائے۔ آپ نے اس مقصد کے لیے سیرت سازی کا ایسا صحیح طرز اختیار فرمایا کہ جوگیانہ صوفیت اور راہبانہ تربیت روحانی کے پردے تار تار ہو گئے۔ اسلامی روحانیت کا صحیح مفہوم لوگوں کی سمجھ میں آگیا۔ آپ نے واشگاف الفاظ میں واضح فرما دیا کہ شریعت ہی ساری دنیوی و اخروی اور ظاہری و باطنی سعادتوں کی کفیل ہے۔

طریقت کی روح :

حضرت تھانویؒ چاروں سلسلوں چشتیہ نقشبندیہ، سہروردیہ اور قادریہ میں بیعت فرماتے تھے مگر نہ کسی سلسلے کی وہاں کوئی روایات تھیں نہ رسوم، نہ تعلیم و تربیت کے وہ کورانہ تقلید کے انداز تھے۔ روایتی حلقے، توجہ، مراقبے کچھ نہ تھے بس اہتمام تھا تو شریعت کے احکام کی بجاآوری کا دھن تھی تو ہر انداز زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اتباع کی فکر تھی تو نفس و شیطان کے مکائد سے بچنے کی اور اپنے متوسلین کو تاکید تھی تو صرف یہ کہ اپنے ظاہر کو بھی پاک صاف رکھو اور اپنے باطن کو بھی طاہر و طیب، اور فرمایا کرتے تھے۔

"دین متین ہی کے ظاہر و باطن کا نام شریعت و طریقت ہے جس طرح ظاہری اعمال کے لیے احکامات الٰہیہ فرائض و واجبات ہیں اسی طرح باطنی اعمال کے لیے بھی ہیں اور ہم دونوں کے ادا کرنے کے مکلف ہیں"۔ فرماتے تھے کہ:

"اسی کے ساتھ ساتھ اور اسی طرح ضروری و لازمی حقوق العباد ہیں۔ تم پر اپنے والدین کے اپنے بیوی بچوں کے، اپنے عزیز و اقارب کے، اپنے احباب اور کاروباری تعلق رکھنے والوں کے حقوق بھی کما حقہٗ ادا کرنا فرض و واجب ہے۔ ان میں ذرا برابر بھی کوتاہی کروگے تو تعلق مع اللہ کی تم کو ہوا تک بھی نہ لگے گی، چاہے عمر بھر ہی کیوں نہ مروجہ رسمی تصوف کے مجاہدوں، نوافل اور وظائف میں سر مارتے رہو"۔

غرض حضرت تھانوی نے طریقت کی اصل حقیقت کا علی الاعلان اظہار فرما دیا اور ساری طریقت کو احکام شریعت ہی کی اتباع میں منحصر ہونا واضح فرما دیا

اور اس طرح طریقت کے متعلق جو بہت سی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں۔

کرامات کی اصل حقیقت:

دیگر غلط فہمیوں کے علاوہ اس سلسلہ میں ایک یہ غلط فہمی بھی پیدا ہو گئی تھی کہ کرامات کو بزرگی اور للّٰہیت کا لازمہ سمجھا جانے لگا تھا آپ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ اپنی سوانح میں اس باب ہی کے حذف کرنے کا حکم دے دیا اور جو کرامات آپ کی ذات سے وقتاً فوقتاً ظاہر ہوئیں ان کو "انعامات الٰہیہ" کے غیر مبہم الفاظ سے تعبیر فرمایا۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ کرامات اگر حقیقی بھی ہوں تو بھی کسی کی اختیاری نہیں اور جب غیر اختیاری اور محض عطائی ہیں تو اس پر کسی کی بزرگی کا مدار کیوں ہو۔

اگر آجکل کی اصطلاحی کرامات ہی بزرگی کا معیار ہیں تو جتنی کرامات کسی ادنیٰ ولی کی جانب اس کے معتقدین منسوب کرتے ہیں کیا اس کا عشر عشیر بھی صحابہ کرام کی سیرتوں میں ملتا ہے اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر اس معیار کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔ صحابہ کرام کی تو سب سے بڑی کرامات یہ تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا مکمل نمونہ تھے پس بزرگی کا معیار اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ اتباع سنت کی تکمیل اور اس پر استقامت ہے۔

کرامات معنوی :

شریعت پر استقامت تمام کرامات کا نچوڑ ہے اور یہ کرامات حضرت تھانویؒ کے یہاں بدرجہ منظر آتی ہے۔ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کرامت کا آئینہ دار تھا۔

اس کے علاوہ اصطلاحی کرامات سے زیادہ ایک اور اہم بات ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول محکم سے ثابت ہے وہ ہے فراست مومن۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :- اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ۔

ترجمہ:۔ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔

بھلا اللہ کے نور سے بڑھ کر کونسی کرامت ہوگی اور اس فراست مومن والے نور سے حضرت تھانوی کو بڑا وافر حصہ ملا تھا۔ آپ کے ملفوظات آپ کی تقریریں آپ کی تحریریں، آپ کی تالیفات، آپ کی تصنیفات، آپ کے اصلاحی کارنامے اور آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے نور سے جگمگا رہا ہے۔

کرامات ظاہری :

حقیقت میں حضرت تھانوی کی اصل کرامات تو آپ کے آثار علمیہ اور نقوش عملیہ ہی ہیں جن سے تجدید دین کا مہتم بالشان کام ظہور میں آیا۔ تاہم اگر بات اصطلاحی کرامات ہی سے بنتی ہے تو آپ کی ذات بابرکات سے بیسیوں نہیں

- سینکڑوں ایسے واقعات بھی ظہور میں آئے۔ جن کو عام طور پر کرامات سمجھا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر

برادری کی ایک خاتون پر جن کا اثر ہوا، تعویذ کی درخواست آئی آپ نے عذر فرما دیا۔ مگر ان کے شدید اصرار پر جن کے نام ایک خط تحریر فرمایا کہ:

"اگر تم مسلمان ہو تو میں تم کو قرآن وحدیث کی وہ وعیدیں یاد دلاتا ہوں جو کسی کو ستانے پر وارد ہوئی ہیں اور اگر تم کافر ہو تو اول تو ہم صلح کی تحریک کرتے ہیں اور اگر تم نہیں مانتے تو یاد رکھو کہ ہم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو تمہارا پورا پورا استیصال کر سکتے ہیں۔"

جب یہ خط اس جن کو دکھایا گیا تو اس نے کہا یہ ایسے شخص کا خط نہیں کہ اس کا کہا نہ مانا جائے، اچھا تو میں جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ خاتون اس کے بعد صحت یاب ہو گئیں۔

جن کے نام حضرت تھانوی کے اس خط پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ خط یاد آتا ہے جو آپ نے دریائے نیل کے نام لکھا تھا۔ یہ سنت فاروقی جسے آپ کرامت فاروقی کا نام بھی دے سکتے ہیں، حضرت تھانوی کے ہاتھوں زندہ ہوئی کیوں نہ ہو آخر آپ نسبتاً فاروقی تھے۔

ان حضرات کی تشفی کے لیے جو حضرت تھانوی کی معنوی کرامات کے بعد بھی ظاہری کرامات معلوم کرنے کے متمنی ہیں۔ ایک اور واقعہ عرض کرتا ہوں۔

علی گڑھ میں حکیم الامت کے ایک معتقد نے نمائش میں دکان لگائی۔ ایک روز

عین کاروبار کے وقت ان کے قلب میں وحشت سی شروع ہوئی اور انہوں نے نقصان کا خیال کیے بغیر سامان قبل از وقت سمیٹا اور صندوقوں میں بھرنا شروع کر دیا صندوق بھر چکے تھے کہ نمائش میں اچانک آگ بھڑک اُٹھی۔ ان کو پریشانی ہوئی کہ اکیلے اتنے وزنی صندوقوں کیسے اٹھائیں۔ عین اس پریشانی کے عالم میں دیکھا کہ حضرت تھانوی تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں "جلدی کرو!" چنانچہ ایک طرف سے مالک دکان اور دوسری طرف سے حضرت تھانوی نے پکڑ کر ایک ایک صندوق کر کے سارا سامان بچا لیا۔ جب سامان اٹھ چکا تو حضرت وہاں سے غائب تھے اور درحقیقت اس وقت آپ تھانہ بھون میں موجود تھے۔

یہ دو واقعات تو "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ ورنہ ایسے بہت سے واقعات حضرت تھانوی کی زندگی میں پیش آئے جن کو عام آدمی کرامت ہی کے ضمن میں شمار کرے گا۔ مگر حضرت نے انہیں انعامات الٰہیہ سے تعبیر فرمایا۔

آپ کی اصل کرامات تو آپ کا تقویٰ و طہارت آپ کا تفقہ فی الدین الشرعی۔ علوم میں مہارت و بصیرت، راست گفتاری، مخلصانہ عمل کوشی، انابت الی اللہ بے لوث خدمت دین اور بے غرضانہ تلقین رشد و ہدایت ہیں۔ یہ اوصاف عالیہ اور فضائل حمیدہ غالباً تمام ہم عصروں میں صرف حضرت تھانوی ہی کا طغرائے امتیاز تھے اور اہل بصیرت کے نزدیک ان سے افضل کوئی کرامت نہیں۔

اصلاح المسلمین کا عظیم الشان کارنامہ :

اور حقیقت کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو حضرت کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ آپ نے اصلاح المسلمین کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جو آپ کے زیر تربیت رہ گیا۔ وہ کندن ہو گیا۔ خزف ریزے آپ کی تعلیم کے زیر اثر گوہر آبدار بن گئے اور بقول کسے جو پیتل تھے وہ زر خالص ہو گئے۔

اصلاح المسلمین کی فکر حضرت تھانوی کو اکثر بے چین کیے رکھتی جب کبھی مسلمانوں کی حالت زار اور دین سے ان کی دوری و بے گانگی کا خیال آجاتا تو فرمایا کرتے۔

"مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اس کے نتائج کا تصور اگر کھانے سے پہلے آجاتا ہے تو بھوک اڑ جاتی ہے اور اگر سونے سے پہلے آجاتا ہے تو نیند اُڑ جاتی ہے"۔

اللہ اللہ! کوئی شفیق سے شفیق باپ بھی اپنی صلبی اولاد کے لیے اس طرح غم میں نہ گھلتا ہوگا اسی فکر اور اسی غم کے زیر اثر ایک صبح نماز کے بعد آپ کے قلب پر وارد ہوا کہ بعض اعمال خاص ایسے ہیں جن پر کاربند ہونے سے مسلمانوں کی دینی و دنیوی ہر قسم کی خرابیوں کا شافی علاج ہو سکتا ہے ان خاص اعمال کو آپ نے پچیس اصولوں کے تحت ترتیب دیا اور حیوٰۃ المسلمین کے نام سے جمع کر کے شائع فرما دیئے وہ اصول آج تک مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں۔

الہامی نظامِ عمل:

"حیوٰۃ المسلمین" میں درج شدہ انہی پچیس اصولوں کی عملی ترویج کے لیے حضرت تھانوی نے ایک لائحہ عمل بھی مرتب فرمایا اور اس کے لیے "صیانۃ المسلمین" کا نام تجویز کیا یہ نظام عمل فی الحقیقت الہامی ہی ہے ایک مرتبہ اپنے ایک قریبی متوسل کے یہ عرض کرنے پر کہ حضرت آج تک ایسا مکمل نظام نہ سنا نہ دیکھا حضرت نے فرمایا۔

کہنے کی تو بات نہیں مگر خیر سب اپنے ہی آدمی ہیں جس وقت میں نظام عمل "صیانۃ المسلمین" لکھ رہا تھا بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عبارت بتلا رہا ہے۔ اس نظام عمل پر جس نے بھی عمل کیا فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہوا حضرت کی حیات ہی میں اس کی ترویج عمل میں آگئی تھی تقسیم ملک کے بعد حضرت کے ایک خلیفہ خاص حضرت مولانا جلیل احمد صاحب شروانیؒ کے ہاتھوں پاکستان میں اس کی نشاۃ ثانیہ ہوئی حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی جامع اشرفیہ جو حضرت تھانوی کے اکابر خلفاء میں سے تھے جب تک حیات رہے اس نظام عمل کی ترویج کی سرپرستی فرماتے رہے اب بھی فضلہ تعالیٰ یہ نظام حضرت مولانا سید نجم الحسن تھانوی کے زیر نگرانی مصروف عمل ہے دراصل صیانۃ المسلمین ایک آہنی قلعہ ہے جس میں داخل ہو کر انسان اپنے آپ کو نفس و شیطان کے ہر حملہ سے محفوظ پاتا ہے۔

اب حضرت اقدس کا وصال ہوئے اگرچہ چونتیس، پینتیس سال گذر چکے ہیں لیکن وہ اپنی تصنیفات اور اپنے عملی کارناموں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کے بعد ان کے زندہ جاوید یادگاروں سے روشنی حاصل کریں اور ان کی رہنمائی میں صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔

حق تعالیٰ اعلیٰ علیین میں حضرت کے مدارج و مراتب بیش از بیش بلند کرے کہ عمر بھر وہ لوگوں کو اسی کی راہ کی طرف بلاتے رہے اور قیامت میں حضرت کا حشر صدیقین و ابرار کے ساتھ کرے کہ انہوں نے اپنی زندگی ہمیشہ ایک مومن قانت و صدیق ہی کی طرح بسر کی۔ آمین یارب العالمین۔

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب
مجذوب "ماثر حکیم الامت ص ۹۴

ہمارا تصوف سلوک کیا ہے؟!

"حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ ہمارا تصوف وسلوک کیا ہے؟ صرف تہذیب اخلاق' اور رسوخ فی الذکر' اس کے منتہی پر ہمارا سلوک متعارفہ تمام ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر تعلقات فیما بین اللہ وبین العبد کے خصوصی انکشافات ہیں جس کی کوئی نہایت نہیں"

(بروایت حضرت مولانا حکیم عبد الرشید محمود گنگوہی نبیرہ قطب العالم حضرت گنگوہی قدس سرہ)
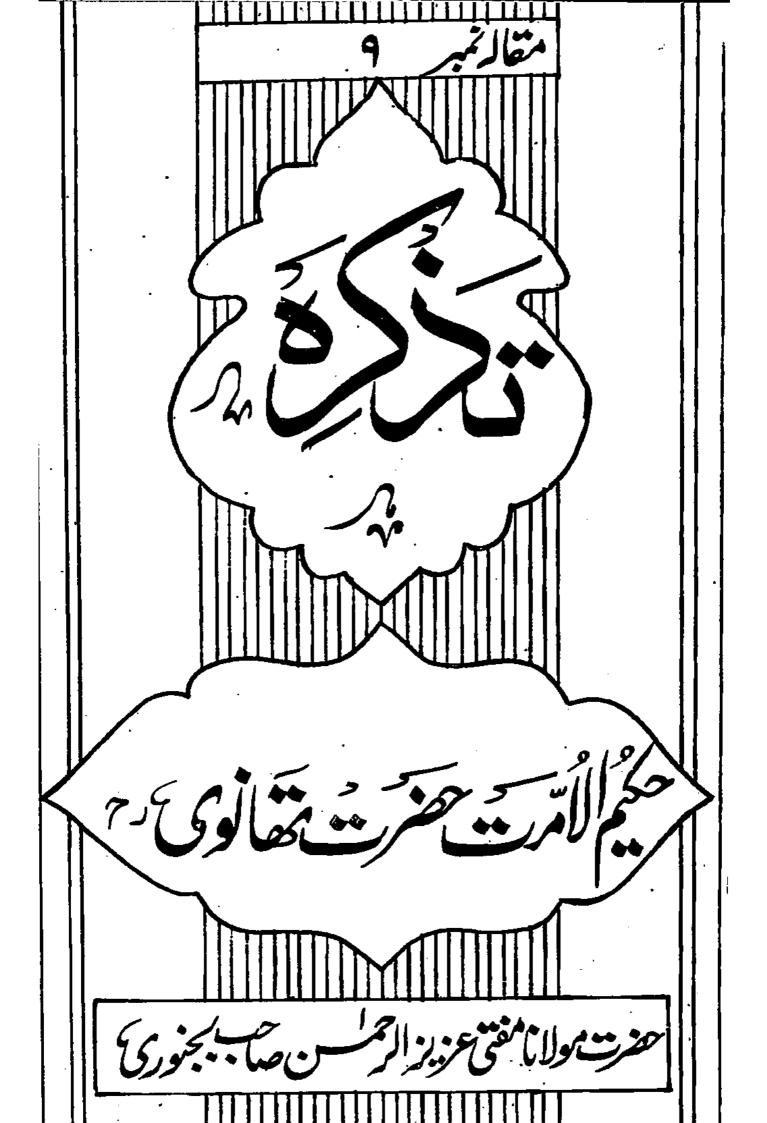
مقالہ نمبر ۹
تذکرہ
حکیم الامت حضرت تھانوی رح
حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری

تذکرہ حکیم الامت

نام ونسب آپ کا تاریخی نام 'کرم عظیم' اور دادھیال کا مقرر کردہ نام عبدالغنی نانہال ۱۲۸۰ھ کی طرف سے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب کا تجویز کردہ نام "اشرف علی" ہے۔ آپ مجذوب ممدوح کی برکت دعا سے پیدا ہوئے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

یہ جو میں کبھی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں ان ہی مجذوب صاحب کی روحانی توجہ کا اثر ہے۔ جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں کیونکہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔ الجھی ہوئی باتوں کی متحمل نہیں۔

علاوہ ازیں شرافت نسبی کے اعتبار سے ماں کی طرف سے آپ سیّد اور علوی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رح کے نسب سے مل جاتا ہے۔ باپ کی طرف سے آپ فاروقی النسل شیخ ہیں۔ چنانچہ مؤلف سوانح کی تحقیق ہے۔

"شیوخ تھانہ بھون حضرت شیخ مجدد الف ثانی حضرت شیخ تھانیسری وحضرت شیخ فرید الدین گنج شکر۔ یہ سب سلطان شہاب ملقب بہ فرخ شاہ کابلی کی اولاد سے ہیں۔ الخ

حضرت والا کیا بلحاظ ظاہر اور کیا بلحاظ باطن شاہی خاندان سے نسبت رکھتے ہیں[1] الخ

---

[1] اشرف السوانح ص۱۳ ج ۱

سونے پر سہاگہ یہ کہ آپ ایک بہت بڑے رئیس شیخ عبدالحق صاحب تھانوی کے گھر میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ ہے چھوٹے بھائی کا نام اکبر علی ہے۔ منشی اکبر علی صاحب عہد حکومت برطانیہ میں بریلی شہر میں مشاہرہ پانچ صد روپیہ ماہوار ملازم تھے۔

غرضیکہ آپ کی پرورش نہایت ہی ناز و نعم میں ہوئی۔ حضرت تھانویؒ ان تمام وجوہات سے بچپن میں ایک مزاج رکھتے تھے جو مشائخ دیوبند میں سے کسی کا نہیں تھا۔ چنانچہ مؤلف سوانح حیات تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت والا بچپن میں کسی کا ننگا پیٹ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دیکھتے ہی بس فوراً قے ہو جاتی تھی یہ حضرت والا نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے سُنا ہے۔ چونکہ لڑکوں کو یہ معلوم تھا اس لیے حضرت والا کو تنگ کیا کرتے تھے۔ اور پیٹ کھول کھول کر دکھاتے اور حضرت والا قے کرتے کرتے پریشان ہو جاتے۔ الخ کسی کا جھوٹا کھانا یا پانی استعمال نہیں فرما سکتے گھن آتی تھی یہاں تک کہ کبھی اپنے بزرگوں کے سامنے کا بچا ہوا کھانا پانی تبرکاً استعمال نہیں کر سکے۔ الخ (اشرف السوانح ص ۲۱-۲۲ ج-۱)

غرضیکہ خاندانی اثرات و اسباب اور ماحول کی وجہ سے قدرت نے آپ کو عجیب غریب مزاج عنایت فرمایا تھا جس کی وجہ سے آپ ایک مخصوص مزاج کے مالک رہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

تعلیم و تربیت

یہ بھی قدرتی امر تھا کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کو عربی تعلیم کے لیے اور چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب

کو انگریزی تعلیم کے لیے منتخب کیا۔ آپ نے قرآن شریف حافظ حسین علی صاحب سے حفظ کیا تھا۔ اور چند پارے آخون جی صاحب سے پڑھے۔ فارسی میرٹھ کے مختلف اساتذہ سے پڑھی۔ اور متوسطات مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ اور انتہائی کتابیں اپنے ماموں امجد علی صاحب اور بعض کتابیں دیوبند میں مولانا منفعت علی صاحب سے پڑھیں۔ زمانۂ طالب علمی میں آپ کو فارسی لکھنے اور بولنے کی کافی مہارت ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں مثنوی زیروبم آپ نے تصنیف فرمائی جس سے آپ کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا فتح محمد صاحب سے تھانہ بھون رہ کر پڑھیں۔ اور آخری ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں آپ بغرض تحصیل و تکمیل علوم دینیہ، دیوبند تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کے مربی و شفیق اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ، مُلّا محمود صاحب اور مولانا سیّد احمد صاحب وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔

قرأت کی مشق آپ نے حضرت قاری محمد عبداللہ صاحب مہاجر مکی کے سامنے مکۂ معظمہ رہ کر فرمائی۔ آپ کی دستار بندی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے دستِ مبارک سے ۱۳۰۰ھ میں ہوئی۔

سلسلۂ تدریس

دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ آخر صفر ۱۳۰۱ھ میں باجازت والد ماجد اور اساتذہ کانپور تشریف لے گئے۔ اور مدرسہ فیض عام میں پڑھانا شروع کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد آپ میں اور اراکین مدرسہ میں اختلاف ہوا۔ وجہ اختلاف یہ تھی کہ

اراکین چاہتے تھے کہ آپ وعظ کر کے چندہ بھی وصول کریں۔ لیکن آپ نے اس کو منظور نہ کیا۔ اور مدرسہ سے استعفیٰ دے دیا۔ کانپور کے دیگر حضرات نے جب دیکھا کہ ایک قابل عالم ہاتھ سے جاتا ہے تو باصرار آپ کو روکا اور ایک مدرسہ جامع العلوم قائم کیا۔ اور آپ کو پچیس روپلے مشاہرہ پر مدرسہ میں ملازم رکھ لیا۔ غرض کہ آپ یہاں چودہ سال تک مقیم رہے اور وعظ، درس و تدریس، افتار، کی خدمات انجام دیتے رہے۔ کانپور کے چودہ سالہ قیام کی وجہ سے آپ کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

> میری اتنی جو شہرت ہوئی تو وہ کانپور والوں کی بدولت ہوئی ورنہ میں واقعی اس درجہ کا شخص ہرگز نہ تھا[1]

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کانپور میں رہ کر دین کی اس قدر خدمت کی کہ غیر اپنے ہو گئے۔ اور آپ سے محبّت کرنے لگے۔ اور اس کے گرد و نواح میں بدعت کا قلع قمع اور سنّت کا اجرار آپ ہی کے دم قدم سے ہوا۔ غرض کہ ۱۴ سال تک آپ نے کانپور میں درس و تدریس کی خدمات انجام دی۔ اور ۱۳۱۵ھ میں آپ کانپور چھوڑ کر وطن یعنی تھانہ بھون تشریف لائے۔ اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی خانقاہ کو آباد کیا۔

بیعت اور سلوک

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی پوری زندگی پر نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے لیے پیدا کیا تھا۔ اس لیے کہ پیدا ہونے سے قبل ہی اس قسم کی چیزوں کا ظہور ہوا۔ کہ جس سے صاف کہا جا سکتا تھا۔ کہ "اشرف علی" کوئی غیر معمولی بزرگ ہوگا۔

---

[1] اشرف السوانح ص۱۲۱ ج۱

اسے دیکھ طفلی میں کہتی تھی دایہ
یہ بچہ طرحدار پیدا ہوا ہے

تولد ہونے کے بعد عربی تعلیم کے لیے آپ کا انتخاب بھی ایک منجانب اللہ امر تھا۔ ورنہ عقل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ آپ کو دنیاوی تعلیم دی جاتی۔ اور آپ کے برادر خورد کو عربی تعلیم۔ کیونکہ ماں باپ پہل کی اولاد کو عموماً اسی طرز پر چلانا پسند کرتے ہیں جس پر خود ہوتے ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی پیشین گوئی "جہاں تم جاؤ گے تم ہی تم نظر آؤ گے" نے اصحاب باطن اور تجربہ کار حضرات کے قلوب میں حضرت مولانا قدس سرہ کے متعلق کہ یہ طالب علم ہونہار ہے۔ یقین کا درجہ دے دیا تھا۔

غرض کہ باطنی اشارات کے ماتحت فطرۃً اسی لائحہ عمل کو اختیار کیا۔ اور اسی راستے پر گامزن ہوئے۔ جس کے لیے آپ کو پیدا کیا گیا تھا۔ علوم ظاہر سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے دل میں تزکیہ باطن کی تڑپ پیدا ہوئی۔

ابتدا میں آپ کا قلبی میلان قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف تھا۔ چنانچہ مؤلف سوانح فرماتے ہیں:۔

> حضرت والا نے طالب علمی کے زمانہ میں اول آپ (حضرت گنگوہیؒ) ہی سے مدرسہ دیوبند میں بیعت ہونے کی درخواست کی تھی۔ لیکن مولانا (حضرت گنگوہیؒ) نے طالب علمی کے زمانہ میں بیعت کرنے کو خلاف مصلحت اور حارج تحصیل علوم دینیہ خیال فرما کر عذر فرما دیا[1]

---

[1] اشرف السوانح ص ۱۳۲ ج ۱

ایک بار حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کسی ضرورت سے مدرسہ دیوبند تشریف لائے۔ حضرت والا (مولانا تھانویؒ) زیارت کرتے ہی غایت اشتیاق میں بغرض مصافحہ دوڑے، تو اینٹوں کی وجہ سے جو اس وقت وہاں نودرہ کی تعمیر کے لیے پڑی ہوئی تھیں۔ حضرت والا (مولانا تھانوی) کا پاؤں بے اختیار پھسلا۔ اور زمین پر گرنے ہی کو تھے کہ حضرت مولانا (مولانا گنگوہیؒ) نے فوراً ہاتھ پکڑ کر سنبھال لیا۔ حضرت والا (مولانا تھانوی) کو حضرت مولانا (مولانا گنگوہیؒ) کی زیارت ہوتے ہی اس قدر کشش اور عقیدت ہوئی کہ بیعت کی درخواست کی۔ مولانا حضرت گنگوہیؒ) نے اس بناء پر کہ بزمانہ طالب علمی شغل باطن مخل تحصیل علم ہوگا۔ انکار فرمادیا۔ الخ (اشرف السوانح صـ۱۹۶)

ھٰکذا فی یادیاراں حضرت والا کے ایک اور ہم سبق نے بھی اسی دوران میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت کی درخواست کی تو ان سے انکار نہیں فرمایا اور ان کو بیعت کر لیا۔ جس سے حضرت والا کو اور بھی حسرت ہوئی۔ الخ[۱]

بہرحال ابتداء میں حضرت تھانویؒ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہونا چاہتے تھے۔ اور اس قدر اشتیاق تھا کہ آپ نے حضرت گنگوہیؒ (جبکہ وہ تیسرے حج کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے جارہے تھے) کے بدست حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا کہ آپ مولانا گنگوہیؒ سے سفارش فرمادیں کہ وہ مجھے بیعت کر لیں لیکن اس

---

[۱] اشرف السوانح صـ۱۹۷ ج ۱

کے بعد آپ اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے ہمراہ حج کے لیئے تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے خدام میں داخل ہو گئے اور شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور چونکہ ؎

مردِ حق کی گویا پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے آپ کو بیعت فرمالیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت گنگوہیؒ نے کسی اشارۂ باطنی کی وجہ سے اس درِ ناشگفتہ کو رشتہ بیعت میں منسلک نہیں کیا تھا ؎

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جس کے ہے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

بہر حال حضرت حکیم الامتؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے میکدہ میں داخل ہو کر نچوڑ میخانہ نکلے۔

چونکہ آپ اپنے والد صاحب کے ہمراہ تھے۔ اس لیے مستقل اقامت کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز نے فرمایا بھی کہ کم از کم چھ مہینے قیام کرو۔ لیکن قیام کرنا ممکن نہ ہوا۔ اور آپ واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔ اور کانپور پہنچ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سلسلۂ بیعت و خانقاہ

حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت گنگوہیؒ کو آپ سے محبت تھی۔ ہر دو حضرات آپ کی بہت زیادہ رعایت فرماتے۔ اور شفقت اور محبت کا برتاؤ بھی کرتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ

تو پیر بھائی ہونے کی وجہ سے احترام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ گنگوہ تشریف لے گئے تو حضرت گنگوہیؒ چارپائی سے نیچے اُتر کر برابر ہی میں بیٹھ گئے۔ بعض لوگوں نے عرض بھی کیا۔ حضرت وہ تو اپنے آپ کو حضرت کا ایک مرید سمجھتے ہیں۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا۔ تم تو اندھے ہو گئے ہو۔ میں تو اندھا نہیں ہوں۔ اسی طرح حضرت حاجی صاحب سے اگر کوئی پوچھتا تو فرماتے یہ میرا لوپتا ہے۔ غرض کہ ہر دو حضرات سے خصوصی اور گہرے تعلقات تھے۔

۱۳۱۰ھ میں آپ پھر دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور تقریباً چھ مہینے آپ نے قیام کیا۔ اور ذکر و فکر میں مشغول رہے۔ اس قیام میں حضرت حاجی صاحبؒ نے مخصوص توجہات سے نوازا۔ اور غالباً اسی قیام میں آپ کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی۔ مؤلف سوانح نے اس سلسلہ میں کوئی خاص تصریح نہیں کی اور نہ ہی کسی تاریخ کی تعین ہی کی ہے۔ ہم نے ۱۳۱۰ھ صرف قرائن کی وجہ سے لکھ دیا ہے۔ بہر حال آپ نے حلقہ توجہ اور سلسلہ بیعت ۱۳۱۰ھ کے بعد کانپور سے شروع کر دیا تھا۔ اور تھانہ بھون پہنچنے کے بعد تو مستقل اصلاحِ خلق کا کام شروع کر دیا۔ اور خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کو آباد کیا۔

اصول وضوابط

اس میں شک نہیں کہ حضرت تھانویؒ نہایت لطیف مزاج تھے متقدین میں سے مزاج کے اعتبار سے آپ کو مرزا مظہر جانِ جاناں ثانی کہا جا سکتا ہے۔ آپ ـــ مترتب المزاج اور اصول وضابطہ کے پابند تھے۔ اور حقیقت یہ کہ اگر آپ مترتب المزاجی اور اصول وضوابط سے کام نہ لیتے تو تصنیف وتالیف کا کام ہر گز نہ کر پا سکتے تھے۔

ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کی خدمت کے لیے پیدا کیا۔ کیونکہ ایک خاص نوعیّت کی خدمت آپ سے لینی تھی۔ اس وجہ سے شروع سے ایسے اسباب مہیّا کر دیئے تھے اور مزاج بھی ایسا ہی مرحمت فرمایا۔ اب ہم آپ کے اصُول وضوابط کو مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

شرائط داخلہ خانقاہ ذیل میں اشرف السوانح سے شرائط داخلہ کا نقشہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ فارم شرائط داخلہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نو واردین کو دے دیا جاتا تھا کہ جس کی خانہ پُری واردین کو اپنے آپ کرنی پڑتی تھی۔ اور اگر کوئی پڑھا ہوا نہ ہوتا تو دوسروں سے بھروا کر داخل کرتا تھا۔

نقشہ شرائط داخلہ خانقاہ

۱۔ نام۔؟

۲۔ وطن اصلی۔؟

۳۔ اس وقت کس مقام سے آنا ہوا اور اس مقام میں کتنا قیام رہا۔

۴۔ شغل ووجہ معاش۔؟

۵۔ موروثی زمین تو آپ کے پاس نہیں۔؟

۶۔ علمی استعداد۔ اردو یا عربی یا انگریزی میں کس قدر ہے۔؟

۷۔ اصلی مقصد آنے سے کیا ہے محض ملاقات یا کچھ کہنا اور لکھ کر دینا یا زبانی اور مجمع میں یا تنہائی میں۔

۸۔ کسی سے بیعت ہیں یا نہیں اور کس سے۔؟

۹۔ اگر مجھ سے بیعت ہیں تو بیعت کو کتنا زمانہ ہوا۔ اور تعلیم کس کے متعلق ہے؟

۱۰۔ میرے مواعظ اور رسائل کیا کیا دیکھے ہیں۔؟

۱۱۔ اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر دکھلایا جائے۔؟

۱۲۔ کتنا قیام ہوگا۔؟

۱۳۔ کہاں قیام ہوگا۔؟

۱۴۔ خانقاہ میں اوّل بار آنا ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں۔ اگر پہلے بھی آئے ہیں تو کتنا قیام ہوا تھا۔؟

۱۵۔ یہاں کے انتظام طعام کی آپ کو خبر ہے یا نہیں[۱]۔؟

۱۶۔ باہر والا بڑا اعلان قلمی دیکھ لیا یا نہیں[۲]۔ (ماخوذ از اشرف السوانح صہ ۲۴۲ ج ۲)

---

[۱] نو واردین کے لیے طعام کا انتظام یہ تھا کہ ایک دکان مقرر کر دی گئی تھی۔ اور کھانوں کا نرخ مقرر کر دیا گیا تھا کہ واردین کو جس کھانے کی ضرورت ہو اس بھاؤ سے ملے گا۔

[۲] یہ نقشہ بھی اسی نقشہ سے ملحق پیش کیا جا رہا ہے۔

(بندہ غفرلہٗ)

بڑا اعلان انضباطِ اوقات

۱۔ صبح سے بارہ بجے تک مجھ کو متفرق ایسے کام رہتے ہیں جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کسی سے ملنے یا بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے اور حرج بھی۔

۲۔ البتہ اوپر کے نمبر سے تین شخص مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہو اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا وہ جو جا رہا ہے اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً درد زہ وغیرہ کا تعویذ لینا ہو یا فوری ضروریات کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو۔ جس میں تاخیر نہ ہو سکے۔ مگر ان تینوں شخصوں کو چاہیے۔ کہ آتے ہی کہہ دیں کہ ہمارے اس وقت آنے کی یہ وجہ ہے تاکہ معلوم نہ ہونے سے پریشانی نہ ہو۔

۳۔ پھر بارہ بجے سے نماز ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں بیٹھنے تک میرے قیلولہ اور نماز کا وقت ہے اس میں ملاقات سے اور سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں۔

۴۔ پھر جب ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے۔ آنے کی بیٹھنے کی ہر قسم کی بات چیت کی۔ تعویذ وغیرہ مانگنے کی۔ البتہ جمعہ کا دن تعویذ سے مستثنیٰ ہے۔

۵۔ پھر اذان عصر سے نماز سے فارغ ہونے کے لیے وہی قاعدہ ہے جو قیلولہ

کے وقت کا ہے جو ۳ میں مذکور ہے۔

۶۔ پھر عصر سے فارغ ہونے کے بعد سے عشاء سے فارغ ہونے تک کے لیے وہ قاعدہ ہے۔ جو صبح سے بارہ بجے تک کے وقت کا ہے جو نمبر ا میں مذکور ہے اور وہی لوگ یہاں بھی مستثنیٰ ہیں جو نمبر ۲ میں مذکور ہیں۔

۷۔ عشاء کے بعد تو معذوری ظاہر ہے باستثنا اضطرار شدید۔

۸۔ یہ قواعد تو ان صاحبوں کے لیے ہیں جو مجمع میں اپنا مقصود ظاہر فرما سکتے ہیں اور جو کسی کو کچھ پوشیدہ کہنا ہو۔ اس کے لیے یہ قاعدہ ہے کہ اگر تحریر کو کافی سمجھیں تو میری مجلس سے ملحق سہ دری کی دیوار میں ایک بکس لگا ہے۔ اس میں لکھ کر ڈال دیں۔ اور جس موقعہ پر جواب چاہتے ہوں اس کا پورا پتہ لکھ دیں۔ مثلاً فلاں نمبر کے حجرے میں یا مسجد کے ممبر پر ہمیشہ بعد نماز فجر ایسے پرچے نکالے جاتے ہیں۔ اس طریقہ سے تحریری جواب مل جائے گا۔ اور اگر وہ پوشیدہ بات زبانی ہی کہنا چاہیں تو ایسے ہی پرچہ کے ذریعہ تنہائی کا وقت پوچھ لیں میں جو وقت بتلاؤں اس وقت بات کرلیں اور اکثر بعد مغرب کا وقت بتلایا کرتا ہوں۔

۹۔ بعض مہمانوں کو میں خاص اجازت دے کر تنہائی کے وقت میں بٹھلا لیتا ہوں دوسرے حضرات اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں۔ اور اسی طرح کسی کو کوئی خدمت پنکھا وغیرہ کی کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے اس کی تقلید نہ کریں۔ جب تک خاص اجازت حاصل نہ کریں۔ جیسے جوتا اٹھانا یا لوٹا بھر کر رکھنا وغیرہ ذالک۔

۱۰۔ راستہ میں بھی کوئی صاحب میرے ساتھ نہ چلیں اور نہ گھر جا کر پکاریں۔

(ماخوذ از اشرف السوانح صہ ۲۲۵ تا ۲۲۴ ج ۲۔)

شرائط بیعت جب کوئی طالب حضرت والا سے رجوع کرتا ہے۔ خواہ تقریراً یا تحریراً، حاضراً یا غائباً تو بجز خاص اطمینانی مواقع کے ایک مطبوعہ پرچہ حوالہ فرما دیا جاتا ہے۔ جس میں بیعت بلا تعلیم اور تعلیم بلا بیعت کی شرائط جدا جدا درج ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ قرآن شریف جتنا پڑھا ہے یا جتنا یاد ہے کسی صحیح پڑھنے والے سے صحیح یاد کرنا ہوگا۔

۲۔ بہشتی زیور کے سب حصے یا سات حصے اور بہشتی گوہر اور اصلاح الرسوم اور قصد السبیل کی تسہیل پڑھ کر یا سن کر پابندی کرنا ہوگی۔

۳۔ میرے چھپے ہوتے وعظ ہمیشہ پڑھنا یا سننا پڑیں گے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم میرے کسی اجازت یافتہ (جس کو میں تجویز کر دوں یا طالب کی تجویز پر اجازت دے دوں) حاصل کرنا ہوگی۔ اور جب تک ۲۵ بار ان سے خط و کتابت نہ ہو چکے براہ راست مجھ سے تعلیم کی استدعا نہ کی جاتے۔

(ماخوذ از اشرف السوانح ص۱۲۹ ج ۲)

حضرت تھانویؒ کے اصول و ضوابط اور آداب متفرقات کو اگر مفصل لکھا جائے تو اس کے لیے ایک مستقل رسالہ درکار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ شاہی دربار کے آداب و قواعد و ضوابط ہوتے ہیں ان تمام امور پر پابند ہونا اور پابندی کرانا یہ حضرت تھانویؒ ہی کا کام تھا۔ اگر کسی سے قواعد و ضوابط کے خلاف ہوا، تو پھر خیریت نہیں تھی۔ خانقاہ سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ اور اگر معافی بھی دے دی گئی۔ تب بھی سزا دی جاتی تھی۔ مثلاً:۔

تدارک اکثر یہی ہوتا تھا کہ کسی قریب کے مقام پر جا کر وہاں سے پھر حاضری کی اجازت طلب کی جائے۔ اور بعض کے لیے صرف اس پر اکتفا فرمایا گیا کہ لکھ کر خانقاہ میں یہ اعلان آویزاں کر دیا جائے کہ مجھ سے فلاں اذیت و حرکت سرزد ہوئی ہے اور بعض کے لیے یہ تجویز فرمایا گیا کہ سب مقیمین خانقاہ سے فرداً فرداً اپنی غلطی کا اظہار کیا جائے۔ (اشرف السوانح صـ۲۴۷ ج ۲)

اصول وضوابط پر حتی الامکان پابند بنایا جاتا تھا۔ مثلاً کوئی ملاقات کی اجازت چاہتا تو مجال نہیں تھی کہ کوئی حرف بھی زبان سے نکال سکے۔ خاموش بیٹھا رہنا لازم تھا۔ (ملاحظہ فرمائیے صـ۲۴۶ ج ۲۔)

مصافحہ کرنے والے نووارد کے لیے لازم تھا کہ مصافحہ کرتے ہی بتلائے کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

(ملاحظہ فرمائیے صـ۲۶۲ ج ۲۔)

خط و کتابت کے لیے لازم تھا کہ ایک پرچے میں ایک ہی قسم کا سوال ہو جواب کے لیے خط ہونا، یا پھر لفافہ ہونا۔ اور لفافہ پر پتہ لکھا ہونا لازمی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض کہ حضرت تھانویؒ نے بہت سے اصول وضوابط وضع کیے جن پر خود بھی پابند رہے۔ اور دوسروں کو بھی پابند بنایا۔ اور یہ سب کچھ تربیت طالبین کے لیے ہوتا تھا۔

مواعظ اللہ تعالیٰ کو جس آدمی سے جو کام لینا ہوتا ہے۔ شروع سے ہی اس کی طبیعت کو اسی کام کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ سے وعظ کے ذریعہ مسلمانوں کی اصلاح کرنی مقصود تھی۔ اس وجہ سے بچپن ہی سے آپ کی طبیعت کو اس کام کی طرف مائل کر دیا تھا لہٰذا آپ اگر کوئی کھیل بھی کھیلتے تو اس میں بھی یہی پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ مؤلف سوانح لکھتے ہیں:

"وعظ کا بھی بچپن ہی سے شوق تھا۔ اور اس کی نقل بھی اتارا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی بازار کی طرف چھوٹے موٹے سودے کے لیے بھیجے جاتے تو جو مسجد راستے میں پڑتی اس میں چلے جاتے اور سیدھے منبر پر چڑھ جاتے اور کھڑے ہو کر کچھ خطبہ کی طرح پڑھ پڑھا کر چلے آتے۔ الخ

زمانہ طالب علمی میں بھی آپ نے اس شغل کو جاری رکھا۔

طالب علمی کے زمانے میں حضرت والا نے اپنے ہم سبق کی ایک جماعت قائم کر کے ہر شب جمعہ کو نوبت بنوبت وعظ گوئی کی مشق کا انتظام فرمایا تھا۔ الخ

آپ کے مواعظ نہایت پُر مغز شخصیت آمیز، حکیمانہ ہوتے تھے۔ قرآن و حدیث اور دین کے مہمات مسائل کو چٹکی بجاتے ہی حل کر دیتے تھے۔ آپ نے وعظ پر کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ اگر کوئی بطور ہدیہ کچھ پیش کرتا تب بھی بہت احتیاط کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کا کانپور میں وعظ ہوا۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی صاحبزادی نے وعظ کہلایا تھا۔ بعد اختتام وعظ صاحبزادی نے کچھ بطور ہدیہ پیش کیا تو آپ نے منع کر دیا۔ عرض کیا گیا کہ حضرت! یہ تو ہدیہ ہے۔ ارشاد فرمایا

صورت معاوضہ کی پیدا ہو گئی ہے۔ دیکھنے والوں کو یہی شبہ ہو گا۔

آپ کے مواعظ میں تمثیلات، حکایات اور اشعار بھی موقع بموقع ہوتے ہیں کہ جن سے آپ حکیمانہ فوائد و نصائح بھی اخذ کرتے چلتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ قبیح سے قبیح حکایات سے عجیب و غریب فوائد اخذ کرتے ہیں۔ وعظ میں تصنع و بناوٹ نام کو نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ ایک سننے والے نے کہا وعظ تو بہت اچھا تھا مگر آواز اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ آپ نے دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا:۔

"میں ڈوم نہیں، ڈوم کی اولاد نہیں، ڈوم کا شاگرد نہیں۔"

غرض کہ آپ کے حکیمانہ مواعظ حسنہ سے مخلوقِ خدا کو بہت فائدہ پہنچا۔ قوم کی بہت زیادہ اصلاح ہوئی۔ آج بھی آپ کے سینکڑوں مواعظ مطبوعہ موجود ہیں جس سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو پہلے ہوتا تھا۔ اگرچہ اب مرور ایام کی وجہ سے بہت سے مواعظ تلف ہو چکے ہیں۔ کاش کہ کوئی ان مطبوعہ مواعظ کی تہذیب و اصلاح کر کے چند مجلدات کی صورت میں طبع کر دے۔ اس سے جہاں یہ فائدہ ہو گا کہ حضرت تھانویؒ کے مواعظ ضائع نہ ہو سکیں گے۔ وہاں یہ بھی فائدہ ہو گا کہ خریداروں اور پڑھنے والوں کے لیے سہولت ہو گی۔ اور اگر کبھی ریسرچ کا کام شروع ہوا تو تلاش و جستجو زیادہ نہ کرنی پڑے گی۔

تصنیف و تالیف

تصنیف و تالیف میں علامہ جلال الدین سیوطی کا نام مشہور ہے۔ موصوف کی اس قدر تصنیف و تالیف ہیں کہ دوسرے کی ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن حضرت تھانویؒ اس سلسلہ میں ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ آپ کے تمام چھوٹے بڑے رسائل کی تعداد ۲۴۵ ہے

اور مواعظ مطبوعہ کی تعداد ۳۲۱ ہے۔ اس طرح کل مجموعہ کی تعداد ۶۶۶ ہے۔

ان میں حضرت تھانویؒ نے دین کے ہر گوشہ پر لکھا اور اتنا لکھا کہ اب ضرورت لکھنے کی باقی نہ رہی۔ آپ کی معرکۃ الآرا تالیف میں بہشتی زیور اور بیان القرآن ہیں۔ بہشتی زیور کے متعلق تو میں نے اپنے ایک ہم سبق سے سنا ہے جو افریقہ کا رہنے والا تھا۔ کہتا تھا کہ ہمارے یہاں بہشتی زیور کا وہی مرتبہ ہے جو ہندوستان میں صحیح بخاری کا ہے۔

بہشتی زیور اگرچہ شروع میں عورتوں کے لیے تالیف کی گئی تھی۔ مگر اس کی افادیت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر گھر میں موجود ہے۔ اور علماء غیر علماء سب کو برابر فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بہشتی زیور محشیٰ ہوجانے کی وجہ سے علماء کے لیے بھی علمی تحفہ ہوگیا ہے۔ مگر ابھی کافی نظر و تہذیب و ترتیب کی محتاج ہے۔ کاش کہ کوئی اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرے۔

ہمارا مشورہ حضرت تھانویؒ کی تالیفات کے بارے میں بھی یہی ہے کہ تمام رسالوں کو مختلف عنوان کے ماتحت ایک کر دیا جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے مواعظ و تالیفات کے ذریعہ جتنی دین کی خدمت کی ہے اور قوم کا سدھار کیا ہے کسی دوسرے کو یہ بات حاصل نہیں ہے

پس ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ حضرت تھانوی کے مزاج میں بہت زیادہ سختی تھی، غلط ہے اور لوگ جھک مارتے ہیں جو ایسا کہتے ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ تعلیم و تربیت اور تصنیف و تالیف کے اس اہم کام کو انجام نہ دیتے تو آج عام مسلمان دین کے صحیح رخ سے واقف نہ

ہوتے۔ رسومات وبدعات وخرافات کو ختم کر کے احیا سنّت واجرائے سنت حضرت تھانویؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حضرت تھانویؒ نے دین کے ان مسائل واحکامات پر عمل کر کے اور ان کا اجرا۔ فرما کر کہ جن کو آج مذہبی مالیخولیا کا نام دیا جاتا ہے۔ دکھلا دیا اور بتلا دیا کہ انسانوں کے رہنے کے یہ طریقے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو طریقے اختیار کیے جائیں گے وہ طریقے انسانوں کے نہیں بلکہ چوپاؤں کے ہوں گے۔ بلاشبہ حضرت تھانویؒ حکیم الامت تھے۔

وصال

۸۲ سال ۳ ماہ گیارہ دن دنیا کو اپنے وجود مسعود سے متبرک اور منور فرمانے کے بعد آپ کا وصال ۱۶ رجب ۱۳۶۲ ہجری شب سہ شنبہ یعنی ۱۹ ار ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب بعد نماز عشا ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔ تھانہ بھون میں قبرستان عشق بازاں میں مدفون ہوئے "وذو الوصفین" تاریخ وصال ہے

تحریکِ دیوبند اور اصلاحِ اُمّت

جس تحریک کو اپنے وقت میں کتاب وسنت کے مطابق دینِ اسلام کی بگڑی ہوئی صورت کو نکھارنے کے لیے رسوم وبدعات کو مٹانے کے لیے دنیادار صوفیہ اور اغلاط جہلاء سے تصوّف کو پاک کرنے کے لیے مُردہ سُنّت کو زندہ کرنے کے لیے اکابر دیوبند نے بفحوائے حدیث "لا یزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خذلھم" اٹھایا تھا۔ اس کی اشاعت کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی۔ اس کو ہندوستان اور بیرونِ ہند میں صحیفوں اور مواعظ کے ذریعے آپ کے قلم وزبان نے پھیلایا اور کس طرح

پھیلایا۔ اس کو مورخ اسلام حضرت مولانا الشاہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی زبان سے سنیے۔" اصلاح اُمّت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی۔ بچوّں سے لے کر بوڑھوں تک۔ عورتوں سے لے کر مردوں تک۔ جاہلوں سے لے کر عالموں تک۔ فاسقوں سے لے کر صوفیوں، درویشوں، زاہدوں تک غریبوں سے لے کر امیروں استادوں اور مدرسوں تک۔ غرض ہر صنف امت اور ہر جماعت کے کاموں تک ان کی نظر دوڑی پیدائش۔ شادی۔ بیاہ۔ غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نگاہ پڑی۔ اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا۔ اور رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراط مستقیم سے ہٹا دیا۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، معاملات، اخلاق، عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے جانتے پورا سامان مہیا کر دیا۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس فن احسان و سلوک کی جس کا مشہور نام تصوف ہے تجدید کی۔" آگے چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک دوربین زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل، نیک اور بد، صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین صحیح تمثال تھی۔ اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں۔ وہ ان کے درست

کرنے میں مشغول تھا۔ اس نے پوری زندگی اس میں صرف کی کہ مسلم کی تصویر حیات اس شبیہ کے مطابق بنا دے جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔

(جامع المجددین ص۲۷ و ص۲۸)

حسن قبول باوجود عزلت پسندی کے آپ نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں سفر کیا۔ اور ہزاروں مواعظ کے ذریعہ کتاب و سنت کی اشاعت کی جن میں سے تقریباً چار سو پانچ سو مواعظ اسی مجلس میں قلمبند ہو کر طبع ہو گئے اور بار بار طبع ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی آپ کے ملفوظات دس پندرہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے۔ اور آج ایک مخلوق کے لیے درس ہدایت بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خدام کی ایسی قدردان جماعت عطا فرمائی تھی کہ جنہوں نے آپ کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے سبق آموز اور پُر از ہدایت ملفوظات کو قلم بند کر کے شائع کرتے رہنے کا اہتمام رکھا۔ آپ کی ساڑھے چار سو سے زائد تصانیف عربی، فارسی، اردو زبان میں مختلف علوم و فنون میں شائع ہوئیں۔ اور حیات ہی میں درجنوں ایڈیشن شائع ہو گئے۔ جن میں اردو زبان میں بہشتی زیور گیارہ حصوں میں ایسا مقبول ہوا کہ آبادی اور علاقہ تو کیا معنی شاید ہی کسی مسلمان کا کوئی گھر ان سے خالی رہا ہو۔

آپ کے مُرشد نے آپ کو بشارت دی تھی کہ تم کو تفسیر و تصوف سے خاص مناسبت ہوگی۔ چنانچہ آپ کی تفسیر بیان القرآن ضخیم بارہ جلدوں میں نہایت مشہور ہے۔ جس سے آج اساتذہ تفسیر استفادہ کرتے ہیں۔ آپ کا امداد الفتاویٰ ضخیم جلدوں میں تقریباً سولہ سو (۱۶۰۰) صفحات میں شائع ہو چکا ہے جو آجکل

مفتیانِ عظام کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے رہا ہے۔ اور اس میں حوادث الفتاویٰ کا باب آپ کی شانِ تجدد کا مظہر بنا ہوا ہے۔ اور ترجیح الراجح اخلاص وتدین کا نایاب مرقع ہے جس میں آپ نے اپنے فتاویٰ وتصانیف کی غلطیوں کو خود ذاتی رائے سے محسوس فرما کر یا کسی اہلِ علم کی اطلاع کے بعد رجوع کیا ہے۔ اور اس رجوع اور آخری محقق رائے کو بلاخوف لومۃ لائم شائع کر کے اسوۂ متقدمین کو زندہ کیا۔ اور آئندہ نسلوں کے لیے غلطی پر جمود اور ہٹ دھرمی کی مذمت اور رجوع الی الحق کا حق وصحیح طریقہ ظاہر کر دیا۔

تصوّف وسلوک میں آپ نے بہت سے مضامین ورسائل شائع کیے۔ جن میں قصد السبیل، تعلیم الدین، آداب المعاشرت التشرف والتکشف امتیازی شان رکھتے ہیں۔

مریدین وطالبین کی اصلاح وتربیت میں احتساب ومواخذہ فرماتے تھے۔ اور حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ تو بارہا نقل فرماتے "کہ مربی وہ ہے جس کا دین انبیاء کا سا ہو۔ تدبیر اطبا کی سی اور سیاست بادشاہوں کی سی" خوب کہا ہے کہنے والے نے کہ:

؎ اے قبائے رہنمائی راست پر بالائے تو
علم وحکمت را شرف از گوہر بالائے تو

نیز بذریعہ خط وکتابت عرضِ حال اور حصولِ ہدایت کے طریقے سے ہزاروں میل دُور بیٹھ کر مسترشدین کو فیض پہنچاتے رہے۔ ان خطوط سے ہزاروں صفحات کی کتاب جو "تربیت السالک" کے نام سے مشہور ہے ضخیم مجلدات میں تیار ہو گئی۔

اور اس طرح قیامت تک اُمت کے لیے ہدایت کا سامان ہوگیا۔

تھانہ بھون کے مستقل قیام کے چند روز بعد ہی مرشد کی اُجڑی ہوئی خانقاہ (خانقاہ امدادیہ) ذاکرین وشاغلین کا مرکز بن گئی۔ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے آپ نے دین کے بعض ابواب کا (جن کی طرف خود دین دار طبقہ کو بھی احساس نہیں رہا تھا یا کماحقہٗ نہیں تھا) خاص اہتمام فرمایا، چنانچہ حقوق العباد کی ادائیگی، اخلاق اور حسن معاشرت کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ ان ابواب پر خاص تصانیف بھی فرمائیں۔ اور مجلس میں بھی اس کا اہتمام رکھا۔ عتاب اور مواخذہ کے ذریعہ غافل قلوب کو متوجہ فرمانے کی سعی فرماتے۔ اگر کوئی صاحب اس طریقہ اصلاح کی ندرت کو ظاہر کرتے کہ اور جگہ یہ دارو گیر اور مواخذہ کا طریقہ نہیں ہے۔ تو فرماتے "کہ اوروں کے یہاں برکت ہے اور میرے یہاں حرکت ہے۔ جس کو یہ طریقہ پسند نہ ہو۔ میں بلانے تھوڑا ہی جاتا ہوں۔

ع۔ جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

رسوم وبدعات اور تمام منکرات کو محض علمی طریقہ پر سمجھا دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ عملاً پہلے اپنے گھر سے اور اپنی ذات سے ان کو مٹانے کی سعی فرماتے۔ رسوم ومنکرات کی مجلس میں شرکت نہیں فرماتے تھے۔ اگر لاعلمی میں عین وقت پر کسی مجلس میں منکرات کا علم ہوا تو بہ لطائف الحیل فوراً علیحدگی اختیار فرمالیتے اور اپنی علیحدگی کی وجہ بھی مناسب عنوان سے ظاہر فرما دیتے تاکہ اور اہل حس بھی ہدایت پاسکیں۔ اس طریقہ پر رسوم موت وشادی کی ناجائز اور غیر ضروری پابندیوں میں فضول خرچی سے برباد ہوجانے والے ہزاروں خاندانوں اور افراد کو تباہی سے بچالیا۔

آپ کا تصوّف

دربار اشرفیہ میں نہ تو روایتی صوفیوں کی طرح دعوے کیے جاتے تھے نہ مجذوبوں کے سے احکام جاری ہوتے تھے۔ نہ کشف وکرامات کے چرچے سننے میں آتے تھے نہ خوابوں اور کیفیتوں کے تذکرے ہوتے تھے نہ فرائض کی طرح ذکر اور شغل کا اہتمام نظر آتا تھا۔ کیونکہ وہاں ہر وقت اور ہر حال میں کتاب وسنّت کی تعلیم دی جاتی تھی جو دراصل روح تصوّف اور جانِ طریقت ہے۔ اسی لیے ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا۔

"یہاں تو ملّاپن ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ درویشی کیا چیز ہے۔ طالب علم ہیں۔ صاحب علم بھی نہیں۔ بس قرآن وحدیث پر عمل کرنا بتاتے ہیں۔ پھر اس میں جو کچھ کسی کو ملنا ہوتا ہے۔ مل جاتا ہے اور الحمد للہ ایسا ملتا ہے کہ مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر۔ مگر ظاہر میں کچھ نہیں نہ ہو حق ہے نہ وجد وحال ہے اور نہ کشف وکرامات۔"

"میرے یہاں ضربیں لگوانے کا دستور نہیں کہ تھوڑی دیر محنت کرلی پھر آزاد پھرتے رہے۔ میرے یہاں تو وہ آدمے جس کو رات دن اپنے نفس پر آرے چلانے ہوں۔ اور قدم قدم پر فکر ہو کہ کون سا کام جائز ہے اور کون سا ناجائز۔"

یہاں تک کہ محض صوفیائے کرام کی طرح آپ کے یہاں توجہ دینے کا بھی قطعاً کوئی التزام نہ تھا۔ بلکہ آپ نے ایک دفعہ اس کی بڑے زور سے تردید فرمائی کہ

"مجھے اپنی ہی فکر سے فرصت نہیں، دوسروں کی طرف متوجہ ہونے کی مجھے کہاں توفیق، میں تو اس توجہ متعارف کو تکلّف ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو اپنی توجہ ہر طرف سے ہٹا کر ایک خاص شخص کی جانب جو مخلوق ہے ہمہ تن متوجہ ہو جانے میں

غیرت آتی ہے۔ کیونکہ یہ حق تو خاص اللہ ہی کا ہے کہ سب طرف سے توجہ ہٹا کر بس اس ایک ذات واحد کی طرف ہمہ تن متوجہ رہا جائے۔ البتہ دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تعلیم کرنا۔ اور دل سے یہ چاہنا کہ طالبین کو نفع پہنچے۔ اور ان کی دینی حالت درست ہو جائے۔ یہ توجہ کا ماثور طریق ہے اور یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنّت ہے اور یہ نفع اور برکت میں بھی توجہ متعارف سے کہیں بڑھ کر ہے۔

بایں ہمہ اکثر لوگوں کا گمان بلکہ یقین تھا کہ جو لوگ حضرت سے طریقہ کے ساتھ اپنی اصلاح کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب انہیں کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے اور اپنے قلوب میں بھی حاضرانہ بلکہ غائبانہ بلکہ کسی ظاہری سبب کے کیفیات خاصہ محسوس کرتے رہتے ہیں یہ سب حضرت کی نظر و توجہ کا ہی نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس خیال کے لوگوں کے شبہات کے ازالہ کے لیے آپ نے فرمایا کہ "یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بغیر قصد توجہ کیے ہوئے اثر کیسے ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے محض قلوب ہی کے اندر تعدیہ کی صفت رکھی ہے جیسے کہ گو آفتاب کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ اس کا نور دوسروں کو پہنچے لیکن پھر بھی اس کا نور دوسروں کو پہنچتا ہی رہتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر یہ صفت رکھ دی ہے کہ جو شے اس کے مقابل میں آجاتی ہے وہ منور ہو جاتی ہے"

مخالفین کے ساتھ معاملہ

مخالفین سے ایسے نرم و مہذّب اور متین سلوک کی مثال شاید تاریخ مشاہیر پیش نہ کر سکے۔ مخالفین سے ایسا نرم سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ آپ ان لوگوں کے جذبات کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ایک اور موقع پر آپ نے ایک ایسی

شکایت کے جواب میں لکھا ہے کہ:۔

"میں اپنے مخالفین اور موذیوں (ایذا دینے والوں) کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں۔ اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ کافر، خبیث، ملعون سب کچھ بنتا رہتا ہوں۔ ابھی ابھی ایک عنایت فرما کا خط آیا تھا اس میں مجھ کو گدھا تک لکھا ہوا ہے۔ مگر ان مراقبات کو اپنا امام بناتا ہوں۔ اپنی زبان قلم یا قلب کو ملوث کیا، میرا کیا بگڑا۔ رہا رنج وہ کوئی بگاڑ نہیں محض خیال کے تابع ہے۔ ممکن ہے اس شخص کی نیت اچھی ہو، مثلاً امر بالمعروف نہی عن المنکر اس لیے وہ معذور ہو۔ گو ہم بھی اس لیے معذور ہوں کہ ہم اپنے کو حق پر سمجھتے ہوں، یا اپنی غلطی بھی نظر میں ہو مگر اصلاح کا طریق ہمارے نزدیک اس سے سہل اور اسلم ہو۔ اگر اس نے ہم کو ناحق بھی رنج دیا تو اپنی عاقبت خراب کی ہم کو صبر کا ثواب ملا نیز ایسے واقعات سے بھی بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عجب و کبر پیدا ہو گیا تھا یا ہو سکتا تھا اس کا ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے نیز خود بھی ایسے مخاطبات اپنے سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ اپنی ناگواری سے ان کی ناگواری سامنے آجاتی ہے۔ اور ایسے مخاطبات سے اجتناب کی توفیق ہو جاتی ہے۔

اعتراف مخالفین

حضرت کا چونکہ ہر قول و فعل مطابق کتاب و سنت ہوتا تھا۔ اس لیے اس اتباع کامل کی برکت سے دیکھنے والوں پر بھی گہرا اثر پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مخالفین کو بھی اس بات

کا اعتراف تھا کہ نہ صرف حضرت تھانویؒ بلکہ ان کے منتسبین بھی صحیح المعاملہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک غیر مقلّد صاحب کسی کام کے سلسلہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے واپس جا کر انہوں نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر اپنے ایک ملنے والے سے کہا۔

"ہم لوگوں میں تو اتباع سنّت کا فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اتباع سنّت تو ہم نے وہاں دیکھا۔ ایک کتاب کی ضرورت ہوئی تو خود اٹھ کر کتب خانہ سے لائے کسی سے نہیں کہا کہ لے آؤ۔ اپنا کام خود کیا کہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔ سبحان اللہ کیا اتباع سنّت ہے۔ اور کتنی تواضع ہے کہ بلا تکلف خود اُٹھ کر لے آتے۔

آپ کی خدمات کا اعتراف

اس سلسلہ میں آپ کی وفات پر ایک علمی مجلّہ کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"یوں تو موت اس عالم آب و گل کی ہر اس چیز کے لیے مقدر ہے جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساطِ ہستی پر نمودار ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی الیسی اموات بھی واقع ہوتی ہیں۔ جو صرف افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان ہزاروں لاکھوں کی عمارت حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت و ارادت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہائے اشک سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ہزاروں دلوں کی پرسکون آبادیاں ایک مستقل غمکدۂ آمال و امانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ امیدوں اور ولولوں کے چراغ بجھ

جاتے ہیں۔ نشاط و کامرانی حیات کے آتشکدے سرد ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثہ جانکاہ نے کائنات عالم کی ہر چیز کو اداس اور غمگین بنا دیا ہے۔ اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا:

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكَ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

(قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں ہے بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا جو منہدم ہو گئی۔)

گزشتہ ماہ جولائی ۱۹۴۳ء کی تاریخ ۱۹، ۲۰، کی درمیانی شب کو تقریباً دس بجے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو سانحہ ارتحال پیش آیا وہ اسی قسم کا سانحہ تھا۔ حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے۔ طریقت و سلوک میں بھی مقام رفیع کے مالک تھے۔ اُن کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی۔ علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔ تحریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں۔ اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے تھے اور کرتے تھے۔ اور اس میں انہیں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گوشہ نشین تھے۔ مگر ان کا "آستانہ" بڑے بڑے ارباب ثروت و دولت اور اصحاب علم و فضل کی عقیدت گاہ تھا جو بات اور جو عمل تھا اخلاص و دیانت کے ساتھ تھا۔ دنیاوی وجاہت اور شہرت مالی حرص و آرزو کا شائبہ دل کے آس پاس بھی گزر نہ ہوا۔ اپنے اصول اور عقیدہ و خیال پر اس مضبوطی اور پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کر سکتی تھی۔

حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا چشمۂ صافی تھا کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب ہوکر جاتے تھے۔ وہ جن کی زندگیاں معصیت کوشی اور عصیاں آلودگی میں بسر ہوئی تھیں۔ یہاں سے پاک و صاف ہوکر اور گوہر مقصود سے دامن آرزو کو بھر کر واپس لوٹتے تھے۔ ان کی زندگی اتباع کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموز طریقت کا دفتر گرانمایہ تھی۔ بعض مسائل میں علماء ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ لیکن تقویٰ و طہارت۔ تفقہ فی الدین، علوم شرعی میں مہارت و بصیرت، راست گفتاری اور مخلصانہ عمل کوشی، انابت الی اللہ، بے لوث خدمت دین، بے غرضانہ تلقین رشد و ہدایت۔ حضرت مرحوم کے یہ وہ اوصاف عالیہ اور فضائل حمیدہ تھے۔ جو ہر موافق و مخالف کے نزدیک برابر مسلّم رہے۔ بعض عوارض و اسقام کی بنا پر گوشہ نشین ہونے سے قبل اپنے مواعظ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اصلاح عقائد و اعمال اور ابطال رسوم و بدعات کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا واحد طغرائے امتیاز ہے۔ قوم نے اُن کو "حکیم الامت" کا خطاب دیا تھا۔ اور بالکل بجا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا جو خزف ریزے تھے وہ گوہر آبدار بن گئے۔ اور جو صرف پیتل تھے وہ زرخالص ہو گئے۔

چھوٹے بڑے رسالے اور مستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد تو تازہ ترین شمار کے مطابق آٹھ سے اوپر بیان کی جاتی ہیں۔

جن میں سے کثیر تصانیف ملک میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور غالباً اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ کہ مولانا کی تصانیف جو اب تک طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ روپے سے کم نہیں ہے۔ مولانا کی سیر چشمی اور فیاضی اور للّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوجود آپ نے کسی کتاب کا حق اشاعت و طبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذنِ عام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا صرف یہ ایک عمل ہی ایسا ہے۔ جو آج کل کے بڑے بڑے نامور علماء کے لیے سرمایۂ عبرت اور درسِ عبرت و عظمت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ تصانیف کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہیں۔ علماء اور فضلاء، اربابِ شریعت اور اصحابِ ظاہر و باطن، مرد و عورت، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اردو خواں، ہر ایک ان سے استفادہ کر سکتا ہے اور اپنے لیے اصلاحِ ظاہر و باطن کا سامان بنا سکتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اسرار و نکات کے علاوہ ایسا عجیب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق و تائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا۔ جس بات کو بیان کرتے نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ حضرت مرحوم کی تحریریں اور ان کی گفتگو غیر معمولی ذکاوت و متانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور ہر طرح کے معاملہ کی اصل حقیقت کو پہچاننا ان کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

خواص کے لیے تفسیر بیان القرآن اور شرح مثنوی مولانا رومؒ اور عورتوں کے لیے بہشتی زیور آپ کی ایسی گراں بہا اور کثیر الشیوع تصانیف ہیں۔ کہ جو اپنی

مخصوص نوعیّت سے اُردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور مؤخرالذکر کتاب تو اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اُردو خواندہ ہوگا جس نے کم ازکم اس کا نام نہ سنا ہو۔

استغناء اور توکل

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل اور کمالات باطنی کے ساتھ استغنائ اور توکل کی نہایت ممتاز اور یگانۂ روزگار دولت عطا فرمائی تھی۔ آپ کا استغناء تنہا آپ کی ذات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ آپ مستغنی گر تھے کہ تمام اہلِ علم اور دینداروں کو مستغنی دیکھنا چاہتے ہیں۔ مستغنی بنانا چاہتے تھے۔ آپ کی خانقاہ اصلاح اعمال واخلاق اور تربیت باطن کی درس گاہ تھی وہاں طالبانِ حق اپنے امراض باطنی، کبر ونخوت، غرور، غصّہ، وساوس وغیرہ لے کر آتے تھے اور علاج کے لیے پیش ہوتے تھے۔ اور یہاں سے مناسب نسخے تجویز کیے جاتے تھے۔ اور شفایاب ہوتے تھے۔ حکیم الامت ؒ نے ضرورت سمجھ کر اپنی خانقاہ میں مسئلہ مسائل اور ابتدائی معلومات کے لیے "امداد العلوم" کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں نہایت مختصر نصاب "ضمان التکمیل فی زمان القلیل" کے نام سے جاری کیا تاکہ ذاکرین ظاہری علم سے بھی کماحقہ واقفیت حاصل کرسکیں۔

اس مدرسہ کا مدار بھی توکل پر رکھا۔ جو بحمد للہ اب تک حسب وصیّت اسی اصل کے ماتحت جاری ہے۔ اس کے مدرسین اور ملازمین کی تنخواہ تو مقرر کر دی جاتی ہے لیکن تنخواہ کی ادائیگی کی ذمّہ داری نہیں لی جاتی۔ تقرر کے وقت ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ گنجائش ہوگی تو دی جائے گی۔ گنجائش نہ ہوگی عذر کر دیا جائے گا۔ اسی لیے قبض الوصول ہی نہیں ہے۔ چندہ کی تحریک کی ہمیشہ کے لیے ممانعت ہے۔ البتہ بلا تحریک جائز

رقم یہاں کے اصول کے مطابق آجائے تو قبول کی اجازت ہے لیکن رسید نہیں دی جاتی۔ جس کو اعتماد ہو چندہ دے، اعتماد نہ ہو نہ دے۔ خرچ کو آمدنی کے اندر رکھنے کی وصیت ہے۔ آمدنی کم ہو جائے تو خرچ بھی کم کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے کبھی اس کی نوبت نہیں آئی، کہ تنخواہ صحیح وقت پر یکم تاریخ کو ادا نہ ہو گئی ہو۔

اس استغناء اور توکل ہی کی برکت تھی کہ بڑے بڑے اہل جاہ و ثروت مدمغ اور فلسفی، نو تعلیم یافتہ سائنسدانی کے دعویداروں کو جب آپ سے گفتگو یا مکاتبت کا واسطہ پڑتا تو چند ہی منٹ کی گفتگو یا دو ایک ہی مکاتبت میں ان کو اپنا پندار، اپنا علم، اپنی جاہ و ثروت، اپنی سائنسدانی محض غرور اور دھوکہ کی پوٹ محسوس ہونے لگتا تھا۔ اور اس کے مقابلے میں اللہ والوں اور رسولؐ کے نائب کا صحیح مقام پیش نظر ہو جاتا تھا جیسا کہ آپ کو ذیل کے دو[۲] واقعات سے معلوم ہو گا۔

حضرت تھانویؒ یہ برداشت نہ کرتے تھے کہ کوئی علمائے حق کو گری ہوئی نظر سے دیکھے۔ اگر کسی سے ایسی غلطی ہو جاتی تو ایسا سبق پڑھاتے کہ وہ عمر بھر نہ بھولتا۔

ایک کانفرنس کے سلسلہ میں آپ کو ڈھاکہ مدعو کیا گیا۔ آپ نے شرح صدر نہ ہونے کی وجہ سے عذر فرما دیا۔ لیکن نواب صاحب ڈھاکہ اور علماء دیوبند کے اصرار پر آپ نے کچھ شرطوں کے ساتھ منظور فرما لیا۔ ایک مرتبہ اس سے پہلے بھی نواب صاحب کی دعوت پر آپ تشریف لے جا چکے تھے۔

اصرار پر آپ نے سفر کا ارادہ تو کر لیا۔ لیکن فراست سے آپ محسوس فرما رہے تھے کہ سفر کا پورا ہونا مشکل ہے۔ اس لیے آپ نے وہ سفر اپنے ذاتی خرچ سے کیا۔ کلکتہ پہنچے تو نواب صاحب نے اپنے ایک عزیز کے ذریعہ ہاں

طعام وقیام کا شایانِ شان انتظام کیا۔ اور حضرت والا سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں نواب صاحب کے عزیز جو خود بھی بہت بڑے رئیس تھے، حضرت سے کہنے لگے کہ آپ کے انکار کے بعد آپ کی تشریف آوری سے نواب صاحب کو بڑی مسرّت ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ آپ کی شرطیں بڑی سخت ہیں۔ جن کو قبول نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک تو یہی شرط کہ کوئی ہدیہ پیش نہ کیا جائے۔

حضرت نے فرمایا۔ نہ دینے کی شرط کیا مشکل ہے۔ دینا تو دشوار ہوسکتا ہے نہ دینا کیا مشکل ہے۔

رئیس نے عرض کیا۔ صاحب! جس سے محبت ہوتی ہے اس کو تو ہدیہ دینے کے لیے جی چاہتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اپنے محبوب کی خدمت نہ کی جائے۔

حضرت نے جواب دیا "یہ ضروری ہے کہ محبوب کو اپنے گھر ہی بلا کر ہدیہ دیا جائے اگر ایسا ہی شوق ہے تو اس کے گھر جا کر یا بھیج کر بھی تو ہدیہ دیا جاسکتا ہے۔

رئیس ہونا اور بات ہے اور سلیقہ سے گفتگو کرنا اور بات ہے۔ اس منتظم کو بات کرنا نہ آئی۔ اور نخوت سے کہا، جناب معاف فرمائیے۔ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔

نخوت کا علاج

حضرت تھانویؒ کو یہ کلمات سن کر بہت رنج ہوا مگر آپ نے ناگواری کو ظاہر نہیں کیا۔ اور نہایت تہذیب سے اس رئیس کو مخاطب کیا کہ:۔

"آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ حضرات کنواں ہیں اور ہم پیاسے۔ اور ہمارے دماغ میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ہم لوگ کنواں ہیں اور آپ پیاسے، اور اس کی ہمارے پاس

دلیل بھی ہے۔ اس لیے کہ ضرورت کی دو چیزیں ہیں۔ دین اور دنیا۔ ان میں سے ہماری حاجت کی ایک چیز تو آپ کے پاس ہے (یعنی دنیا) اور آپ کی حاجت کی ایک چیز ہمارے پاس ہے (یعنی دین) فرق اتنا ہے کہ ہماری حاجت کی جو چیز آپ کے پاس ہے یعنی دنیا وہ اللہ تعالیٰ نے بقدر ضرورت ہمیں بھی دے رکھی ہے لیکن آپ کی حاجت کی جو چیز ہمارے پاس ہے یعنی دین وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں۔ آپ ہمارے محتاج ہوئے یا ہم آپ کے، آپ پیاسے اور ہم کنواں ہوتے یا ہم پیاسے اور آپ کنواں ہوتے۔ وہ رئیس شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے حضرت والا نے وہیں سے قطع سفر کا ارادہ کر لیا۔ اور واپس تشریف لے آئے۔

(۲) آپ حیدر آباد اپنے ایک اہلِ دوست کی فرمائش پر تشریف لے گئے۔ سات ہی روز گزرے تھے کہ ایک نواب صفدر یار جنگ کا پرچہ آیا جو نواب صاحب حیدر آباد کی ناک کا بال اور ارکان سلطنت میں سے تھے۔ لکھا تھا کہ "عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہیں ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے۔"

آپ نے جواب لکھا "بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہلِ دین کی محبّت و عظمت ہے۔ مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا۔ جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا۔ اس کو تو اپنے اوقات فرصت بتلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد رہے۔ یہ کونسی فہم و تہذیب کی بات ہے۔"

اس پر نواب صاحب نے اپنی کج فہمی کی معافی چاہی اور لکھا کہ حضرت والا

ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرمائیں۔ اس پر حضرت نے ان کو ایک اور سبق دیا۔ کہ اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مُردہ بدست زندہ کی طرح مہمان بان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لیے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے۔ آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کر لیں۔

اس پر انہوں نے لکھا بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جارہی ہے۔ میں اب نہ اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں جس وقت فرصت ہوگی حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا۔ اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا۔ جب حضرت نے دیکھا کہ اصلاح پذیر ہو گئے ہیں تو دلجوئی کے طور پر لکھا۔ اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے اس قدر مسرّت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا۔ اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آیئے۔ ورنہ مجھ کو اجازت فرمایئے خود حاضر ہو جاؤں۔ غرض کہ وہ خود آ گئے۔

آپ نے فرمایا کہ میرا یہ طرزِ عمل اس لیے تھا کہ یہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں۔ اہلِ دین کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہلِ علم کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تذلل سے بچنا مقصود تھا مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھنچنا تکبر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے محفوظ رکھا۔ ملاقات کے دوران میں وہ نواب صاحب حیدر آباد کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا۔ کہ اگر نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے تو بہت مناسب ہے۔ آپ نے پوچھا یہ آپ کی خواہش ہے یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے

بعد کہا کہ میری خواہش ہے۔ آپ نے سوال کیا کہ جس وقت آپ نے مناسب یا غیر مناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا۔ اس پر بھی غور فرمایا ہوگا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟ کہا نواب صاحب کا۔ میں نے کہا کہ نفع نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جارہی ہے۔ مطلوب کو طالب اور طالب کو مطلوب بنایا جارہا ہے۔ اس پر کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اب میں خود عرض کرتا ہوں کہ اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں، مضرت ہی مضرت ہے نفع کچھ نہیں۔ اگر میں ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا۔ اس صورت میں ان کو مجھ سے کچھ نفع نہ ہو گا۔ ہاں ان سے مجھ کو نفع ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس جو چیز ہے وہ مجھے ملے گی یعنی دنیا، وہ بقدر ضرورت بحمد للہ میرے پاس بھی ہے۔ اور جو میرے پاس ہے وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین، اور اگر میں گیا بھی اور جو اُن کے پاس ہے (یعنی دنیا، منصب۔ وظیفہ وغیرہ) وہ مل بھی گیا تو اس صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے۔ اگر قبول کرتا ہوں تو اپنے مسلک کے خلاف، اگر قبول نہیں کرتا تو آداب شاہی کے خلاف، کیونکہ قبول نہ کرنے میں اُن کی سُبکی اور اہانت ہوگی۔ اور چونکہ میں اس وقت ان کے حدود میں ہوں۔ اس کی پاداش میں اخراج وغیرہ جو چاہیں میرے لیے تجویز کر سکتے ہیں۔ تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا اور میرا نقصان ہوگا۔

تذکرہ دیوبند

اگر مجھ سے پوچھا جائے
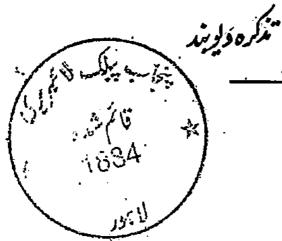
کہ کیا تم نے ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، اعمش، مکحول، ابن مبارک، ابن جوزی کو دیکھا ہے؟ ابن عساکر، شعرانی، غزالی درازی، طاہر مدنی کردی، ولی اللہ دھلوی کی زیارت کی ہے؟

تو استخارہ

کر کے بحلف مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی طرح کہہ سکتا ہوں کہ ہاں دیکھا ہے اور میں اس قسم میں حانث نہ ہونگا کہ میں نے ایسی شخصیتوں کو دیکھا ہے جن میں ان احاد امت کے علوم وکمالات اور تبحر وتورع کا پورا عکس موجود تھا، ان میں سے ایک شخصیت اشرف العلماء تھانویؒ کی بھی ہے۔

حضرت مولانا حکیم عبد الرشید محمود گنگوہیؒ
نبیرہ قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب
گنگوہیؒ

مقالہ نمبر ۱۰
حکیم الامت حضرت تھانویؒ
ایک
اصول پسند شخصیت
حضرت مولانا قاری محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

حکیم الامت حضرت تھانویؒ
ایک اصول پسند شخصیت

تاریخ عالم میں ایسی بہت کم ہستیاں ملیں گے جو عوامی زندگی اور اصلاح و تربیت کے منصب جلیل پر فائز ہوتے ہوئے اس قدر با اصول اور منضبط و منظم زندگی گذار کر گئے ہوں کہ اگر ان کی حیات پر نظر ڈالی جائے تو کوئی گوشۂ زندگی ایسا نظر نہ آئے جو بے اصول اور قول و عمل کے تضاد سے داغدار ہو حضرت اقدسؒ کی تقریباً عام زندگی عامۃ المسلمین کی دینی اصلاح عملی رہنمائی اور عملی تربیت کے لئے وقف تھی۔ آپ نے اپنی اصول پسندی کے تحت ان سب مشاغل کے لئے جو ضابطہ کار تجویز فرمایا تھا اُس کی عمر بھر بے مثال پابندی فرمائی ایسی پابندی کو اصول کے سامنے کسی طاقت یا شخصیت کی رعایت نہیں فرمائی دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحے کو با مقصد بنانے کے لئے حضرت نے ایسا نظامِ اوقات مرتب فرمالیا تھا کہ آپ کے تمام مشاغل از ابتدا تا انتہا مکمل ہوتے رہے۔

اس اصول پسندی کی برکت سے آپ نے اپنی حیاتِ مستعار میں دین و ملت کی جو بے مثال خدمت کی اور عوامی اصلاح کے لئے جو عظیم ذخیرۂ علمی چھوڑا وہ جہاں ایک طرف آپ کی بے لوث زندگی اور بے لاگ حق پسندی کی واضح دلیل ہے وہیں آپ کے علمی فضل و کمال کا آئینہ دار ہے۔ حضرت اقدسؒ کا ذکر آتا ہے تو بے اختیارانہ تصور میں ایک ایسی جامع کمالات شخصیت اُبھرتی ہے جو عقل و فلسفہ حکمت و بصیرت، دین و

دیانت اور فضل و کمال کے اعتبار سے اپنے وقت میں رازی و غزالی کے ہم پلّہ ہے یوں
تو ہر صاحب علم اپنی کچھ منفرد خصوصیات اور کردار کی انفرادیت میں دوسروں سے ممتاز ہو
سکتا ہے مگر حضرت تھانوی کو حق تعالےٰ نے ایسی مجدّدانہ صلاحیتوں کا پیکر بنا دیا تھا کہ آپ
کی ذات علم و عمل کے گوناگوں کمالات کی حامل بنی۔ آپ کی ذکاوت وذہانت اور علمی تفوق
تو مسلم ہے ہی لیکن حضرت کی نمایاں ترین خصوصیات میں جس وصف کو شمار کیا جا سکتا
ہے۔ وہ افراد کی شخصیت سازی اور تعمیر سیرت کی عظیم صلاحیت ہے۔ حق تعالیٰ نے اس
بارے میں آپ کو ایک خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا جس کا جیتا جاگتا نمونہ حضرت کے وہ
منتسبین و مجازین ہیں جو اُس خانقاہ سے نکلے تو اپنی مُربّی کی تربیت کا پیکر بن کر ایک عالم
کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوئے۔ حضرت مولانا کے فیض تربیت سے اُن کے علمی و عملی جوہر
اس طرح نمایاں ہوتے کہ اُن کی صورتوں کو دیکھ کر ہی لوگوں کا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ جہاں یہ
حضرت اقدس کے اخلاص وللّہیت کا ثمرہ تھا وہیں اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کے سلسلے
میں حضرت کے اصول پسندانہ اور بظاہر شخصیت گیرانہ طریقۂ کار کا ایک کرشمہ تھا۔

اصول پسندی کو بالعموم سخت گیری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت
میں اصول پسندی کا مطلب ہے زندگی کو منضبط اور منظم کرنا اور ایک نظام الاوقات کے
تحت جملہ مشاغل کو مرتب کر لینا۔ انضباط کار کی برکت لازمی طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اور کارکردگی
کے صحیح نتائج سامنے آتے ہیں۔ کیونکہ دوسرے لفظوں میں اس اصول پسندی کا مطلب ہے
افراط و تفریط سے ہٹ کر میانہ روی اختیار کرنا جو اعتدال کی راہ ہے۔ انضباط اوقات اور
طبعی اصول پسندی کے بغیر کاموں میں افراط و تفریط کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ایسے کام
جذبات پر ہوتے ہیں۔ ایک وقت جذبہ ہے تو آدمی دنوں کا کام گھنٹوں میں مکمل کر لیتا ہے

اور جذبہ سرد ہو جانے پر گھنٹوں کا کام مہینوں برسوں میں بھی پورا نہیں ہو پاتا۔ البتہ اصول کے تحت معتدل راہ ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے کیونکہ اعتدال کا لازمی اثر کاموں پر مُداومت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور مُداومت عمل ہی شریعت میں مطلوب ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں واضح فرمایا کہ ان احبّ العَمَل الی اللّٰہ اَدوَمَہٗ تو گویا مداومت موقوف ہے اعتدال پر اور اعتدال موقوف ہے اصول پسندی پر لہٰذا اس ترتیب کے تحت اصول پسندی بجائے خود شریعت میں مطلوب ہے۔ البتہ اصول پسندی میں طے شدہ اوقات اور کاموں پر استقامت ناگزیر ہے جس کو بسا اوقات دوسرے بے اصول لوگ بدلحاظی اور عدم تواضع پر محمول کر لیتے ہیں۔ اور نتیجۃً اصول پسند شخص کو درشت مزاج اور اکھڑ قرار دینے لگتے ہیں مگر یہ رائے خود غرضانہ ہوتی ہے یا احساس کمتری اور کم فہمی پر مبنی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اگرچہ بظاہر اصول پسندوں پر زبان طعن دراز کرتے نظر آتے ہیں مگر قلبی طور پر وہ بھی اُس شخصیت کی اولوالعزمی حوصلہ واستقلال اور جُرأت مندانہ کے نہ صرف معترف ہوتے ہیں بلکہ دل و جان سے اُس کی عظمت کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصول پسند انسان ایک ناقابلِ شکست عزم کا مالک ہوتا ہے جو اکثر اوقات ہدف ملامت بنتا رہتا ہے مگر اس لومۃ لائم سے دل برداشتہ ہو کر اپنا اسلوب تبدیل نہیں کرتا جو اس کی مستقل مزاجی اور اولوالعزمی کی واضح دلیل ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کی ذات اسی مزاج استقلال اور جرأت وہمت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی حق پرستی اور حق پسندی کی یہی طبعی افتاد تھی جو بڑے سے بڑے طوفان کے سامنے سینہ سپر رہی اور مخالفتوں کے سیلاب میں بہہ جانے کے بجائے اپنے معقول اور معتدل رجحانات پر پہاڑ کی طرح اٹل رہی حضرت مولانا کو ایسے ہی نامُساعد حالات اور مخالفانہ

ماحول سے گذرنا پڑا اور لبا اوقات لوگوں کے تلخ و ترش تبصرے بھی آپ تک پہونچے۔ تاہم حضرت کے ورع و تقویٰ کو یہ گوارا نہ تھا کہ غیر استدلالی رنگ میں ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ آپ نے محاجۂ لسانی میں بھی جَزاءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا کے تحت اباحت پر عمل نہیں کیا بلکہ عزمیت کے مقام پر استوار رہتے ہوئے فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ کا مظاہرہ فرمایا اور ایسے لوگوں کی طعنہ زنی کو کبھی اپنے لئے ہمت شکن نہ ہونے دیا۔ طبعی ملال فطرت ہے اور وہ ظاہر بھی ہوا لیکن افعال کی ناپسندیدگی کے ساتھ ذوات کو کبھی قابلِ ملامت نہیں سمجھا۔ چنانچہ خانقاہ میں آنے والے طالبین اور عقیدت مندوں کے ساتھ بھی حضرت جو معاملہ فرماتے تھے وہ بظاہر سخت نظر آتا ہے مگر یہ محض اصولوں کے تحت اور دوسروں کو اصول پسندی کا خوگر بنانے کے لئے ہوتا تھا جس پر اصلاح باطن کا مدار ہے حضرت خود ہی فرماتے ہیں کہ "اخلاق کی درستی درشتی پر موقوف ہے مصلح بدون تھوڑی سی سختی کے دوسرے کی اصلاح نہیں کر سکتا" خلافِ قاعدہ باتوں پر ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش ضرور کی جاتی تھی مگر ساتھ ہی اکثر یہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ الحمدللہ عین اس سرزنش کے وقت بھی اُس شخص کی تحقیر کا قلب میں شائبہ بھی نہیں ہوتا بلکہ ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں یہ طریق کار حق تعالیٰ کو ناپسند نہ ہو۔ خانقاہ کے مقیمین میں سے ایک صاحب نے دوسرے شخص کو کسی خلاف اصول بات پر ڈانٹا حضرت نے سنا تو ڈانٹنے والے صاحب سے باز پرس کی۔ انہوں نے عرض کیا کہ امر بالمعروف کے طور پر ایسا کیا حضرت نے فرمایا اس امر کے شرائط بھی آپ میں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ اولین شرط یہ ہے کہ عین سرزنش کے وقت بھی اپنی بڑائی کا قطعاً تصور نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت کی اصول پسندی بھی اتباع شریعت کے تحت تھی۔ جیسا کہ خود صاحب شریعت کی حیات اقدس مکمل طور پر منظم و منضبط تھی۔ اور نظام الاوقات کا پورا اہتمام

فرمایا جاتا تھا۔ مصلحین کی اس شان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار حضرت نے فرمایا کہ "میں ناتمام ہی نقل اسی شان کی کرتا ہوں تو بدنام کیا جاتا ہوں کہ متشدّد ہے۔ میں تو واللہ اپنے نفس پر متشدّد ہوں اور اپنی فکر میں واللہ دوسروں سے زائد لگا ہوا ہوں۔ جو شخص اپنی اصلاح کی فکر میں ہو وہ دوسروں کی اصلاح کے معاملے میں کیا خوشامد یا چاپلوسی کرے گا۔

جس شخص کے جذبات یہ ہوں اُس کو متشدد قرار دینا سراسر ظلم و ناانصافی کہلائے گا کیونکہ تشدّد کو اگر حقیقی معنی میں لیا جائے تو اس کے ساتھ رعایت اور پاسداری مفقود ہوتی ہے جب کہ حضرت اصول کے دائرے میں رہتے ہوئے دوسروں کے لحاظ اور پاس خاطر کا انتہائی اہتمام فرماتے تھے۔ حضرت تھانوی کے تذکرے میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ نے لکھا ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا تھانوی ضوابط و قوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے اور جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں مگر خود مولانا کا یہ حال تھا کہ آپ کی مجلس مبارک میں لوگ کبھی اِدھر اُدھر کی خبروں کا ذکر چھیڑ دیتے بعض شدت پسندوں نے اس کو نامناسب سمجھتے ہوئے حضرت سے اس کا ذکر کیا۔ حضرت نے جواباً فرمایا کہ کوئی میرے پاس آکر بات کرے اور میں مونھ موڑ لوں تو اُس کو صدمہ ہوگا۔ پھر فرمایا کہ زائد اذکار باتوں کی برائی میرے نزدیک دل شکنی کرنے سے کم ہے۔

حضرت کے مزاج میں جو انتظام اور نظم وضبط تھا وہ بھی شرعی اصولوں کی روشنی میں تھا جس کا مطلب ہے کہ اصل مقصود شریعت کی پیروی تھی چونکہ شریعت خود متبعین کی زندگیوں میں انتظام پیدا کرنا چاہتی ہے اس لئے حضرت نے اپنے مزاج میں وہی رنگ بھرا۔ شرعی زندگی کے اصول اصولِ مطلوبہ ہیں کیونکہ ان ہی کے اتباع سے دل و دماغ

میں تقویٰ شعاری کو فروغ ہوتا ہے۔ جب اصول شرعیہ کسی شخص کی ذات میں پوری طرح رچ بس جاتے ہیں تو اس کا مزاج بھی شریعت کے مزاج کا عکس بن جاتا ہے یہاں تک کہ مزاج شریعت سے مانوس ہوجانے کی بنا پر ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اس کی نظران گہرائیوں تک پہونچتی ہے جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ شریعت کا مزاج شناس بن جانے کے بعد اُس کا وجدان اُس معاملے کے حسن وقبح پر مطلع کردیتا ہے اور اُسی کے تحت اُس سے قبیح پرداروگیر سرزد ہونے لگتی ہے اب یہ مقابل کا مبلغ علم وفکر ہے کہ وہ ژرف نگاہی اور اتباع شریعت کے اس مقام کو تشدد سے تعبیر کرے یا تقویٰ شعاری کا انتہائی مقام قرار دے۔

حضرت مولانا کے یہاں معاملات میں جو باریک بینی اور دور رسی پائی جاتی ہے وہ اسی بنا پر ہے کہ ہر معاملے کے لئے حضرت کے یہاں جو معیار مقرر تھا وہ شرعی نقطۂ نظر تھا اور شریعت وطریقت کے باب میں طالبین سے اخفار جائز نہیں۔ لہذا حضرت کی گرفت بروقت اور سخت ہوتی تھی۔ چنانچہ اس باریک بینی اور شرعیات کے باب میں دارو گیر کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب حضرت کے یہاں آئے۔ حضرت نے پوچھا کیسے تشریف لانا ہوا۔ کہا فلاں صاحب نے بھیجا ہے کہ تم جاکر حضرت کو لے آؤ۔ حضرت نے فرمایا شاید آپ کو میرے عذر کی خبر نہیں۔ کہا مجھ کو تو خبر ہے۔ پوچھا پھر کیوں آئے۔ کہا اس خیال سے کہ اس بہانے زیارت ہوجائے گی۔ اس پر حضرت نے ناراضگی سے فرمایا کرایہ ان کا اور زیارت تم کرو۔ یہ جائز ہے ؟ یہ تو خیانت ہے۔ آپ کو مشورہ دینا چاہئیے تھا کہ اس کو آنے میں یہ عذر ہے۔ غرض حضرت کو ان کی اس حرکت پر اس قدر ناگواری ہوئی کہ فرمایا آپ کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں واپس تشریف لے جایئے۔

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا کی معاملات و دیانات میں کس قدر احتیاط اور باریک بینی تھی اور یہ احتیاط ایسے ہی شخص میں ہوسکتی ہے جو تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو اور اس کی نظر ہر اہم اور غیر اہم معاملے کے حرام و حلال اور جائز و ناجائز پہلو پر رہتی ہو۔ اس محتاط روش کے لئے یوں تو ہر مومن مامور بہ ہے لیکن ایک مصلح جو ہدایت و ارشاد کے منصب پر فائز ہوتا ہے جب تک ان جزئیات کا اہتمام کرنے والا نہ ہوگا حقیقۃً اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفوس کی ذمہ داریوں سے صحیح معنی میں عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ دوسروں کے جزئیاتِ امور تک میں دار و گیر کا اہتمام ایک منتظم طبیعت اور با اصول مزاج ہی کرسکتا ہے۔ اور اسی کی دار و گیر مؤثر ثابت ہوسکتی ہے۔ کیونکہ فی نفسہٖ وہ دار و گیر بھی اصولی ہوگی اور اصول پر ہی مبنی ہوگی ورنہ وہ طبائع جو ضوابط و قوانین کی حد بندیوں میں رہنا گوارا نہیں کرتیں مقابل کی بے اصولیوں کو اوّل تو سمجھ ہی نہیں پائیں گی اور اگر سمجھ پائیں گی تو ان پر اصولی نقد و جرح نہیں کرپائیں گی وہ اپنی اس نااہلیت کو اگرچہ اغماض و چشم پوشی کا نام دیں لیکن حقیقۃً اس کا منشاء صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے جبکہ اصول پسند انسان صاحب بصیرت ہوا کرتا ہے اور صاحب بصیرت سے ایسی رو رعایت یا فرو گذاشت مستبعد ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے رو رعایت کی توقع بھی عبث ہوتی ہے چنانچہ حضرت مولانا خود ہی اپنے ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "میری عادت مدعیان علم و فہم کے ساتھ معاملات کی گفتگو میں تسامح و رعایت کی نہیں۔ اس سے ان کو دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ دبتا ہے اور اس خیال سے ان کا جہل بڑھتا ہے"۔

یہ ہے وہ اصلاحی شان اور تربیت کا انداز جس میں مصلح کی نظر ہمیشہ مخاطب کی حالت پر رہتی ہے اگر استدلال یا بحث مباحثہ بھی ہے تو وہ بھی مخاطب کے نفع کے لئے ہوتا ہے اپنے علم کے مظاہرے کے لئے نہیں پھر اسی صدق نیت اور حق آگاہی کا کرشمہ مخاطب کی

اثر پذیری کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ ادھر یہ صدق و اخلاص بھی اولوالعزمی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے جو ایک ایسی کلی حقیقت ہے جس کے ذیلی افراد میں سے ایک فرد اصول پسندی ہے۔ اس کے آثار میں حق گوئی کی جرأت اور ناقابلِ شکست حوصلہ ہوتا ہے۔ اسی سے معاملات میں صفائی اور بے لوثی باقی رہتی ہے اور اسی سے حقوق العباد کی کما حقہ ادائیگی ہو پاتی ہے یہ سب برکات ایک منضبط زندگی کی ہیں کیونکہ انضباطِ طبیعت سے ہی اعتدال پیدا ہوتا ہے جو سرچشمہ ہے ہر قسم کی خیرات و برکات کا معتدل الحال شخص خود نمائی و خود بینی عجب و خود پسندی اور کبر و ریاء جیسے رذائل سے کوسوں دور رہتا ہے اور قدرتی طور پر ان رذائل کے مقابل جو خصائل حمیدہ ہیں اُن سے متصف ہوتا ہے۔ جن کا اعلیٰ ترین فرد مکارم اخلاق ہیں لہٰذا یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت مولانا کے یہاں تواضع و انکسار اور بشاشت و خوش خلقی کی کمی نہ تھی۔ البتہ ہر وصف کا مظاہرہ حدِ اعتدال کے اندر ہوتا تھا جس کے ذریعہ ایک مومن تخلقوا باخلاق اللہ صحیح امتثال امر کر سکتا ہے۔

حق تعالیٰ نے اپنے چشمہ فیضان سے حضرت مولانا کو جو محاسن عطا فرمائے تھے اُن کے ہوتے ہوئے کسی شخص کا خود بین و خود پسند بن جانا معمولی بات ہے مگر ایک صاحب کمال کا سب سے بڑا کمال یہی ہوتا ہے کہ اُسے جتنی سرفرازی نصیب ہوتی ہے اس میں اتنی ہی تواضع و فروتنی بڑھتی جاتی ہے۔ اُسے جتنا عُلوِ مرتبت حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خوف و خشیت کی فراوانی سے اتنی ہی سرافگندگی پر مجبور پاتا ہے اسی تواضع کا اثر تھا کہ آپ القاب و آداب سے ہمیشہ کنارہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک صاحب کا خط آیا تو پتے میں نام کی جگہ "حکیم الامت" لکھا۔ حضرت نے جواب میں لکھا۔ کیا حکیم الامت میرا نام ہے،

آپ کو کس دلیل سے ثابت ہوگیا کہ ڈاک خانہ والے مجھے اس لقب سے پہچان لیں گے۔
اس واقعہ پر کسی نے عرض کیا کہ حضرت وہ ادب کی وجہ سے نام نہیں لکھ سکے۔ فرمایا کہ ادب
کی وجہ سے پھر کبھی خط بھی نہ آتے اور نہ خود کبھی آئیں گے۔ ایک پہلو پر تو نظر جاتی ہے دوسری
جانب کا احتمال نہیں ہوتا۔ نظر محیط ہونی چاہئیے۔ جو کچھ ہو رہا ہے سب رسم کے ماتحت ہے۔
محض تکلفات ہیں لوگوں میں عجمیت غالب ہے حالانکہ عربیت ہونی چاہئیے۔" اسی طرح ایک
صاحب نے اپنے خط میں حضرت سے بیعت کی درخواست کرتے ہوئے تحریر کیا سلسلۂ عالیہ
اشرفیہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے اس تعبیر پر سخت گرفت فرمائی اور سرزنش کرتے
ہوئے لکھا کہ یہ سلسلۂ عالیہ اشرفیہ کیا ہوتا ہے۔ (گویا دوسرے حضرات کا سلسلہ بیعت غیر عالیہ
ہوا) اللہ اکبر اب دین میں بھی تحزّب اور پارٹی بندی ہونے لگی۔ کمال کے جو آثار صاحب کمال میں
ہونے ضروری ہیں حضرت مولانا کی ذات ان کا حسین مرقع تھی سادگی و بے تکلفی اور فقر و
درویشی میں آپ کو حق تعالیٰ نے جو ہیبت و دبدبہ دیا اس کی مثال دور دور تک نہیں ملتی۔
ظاہری تکلفات اور اسباب آرائش سے حضرت مولانا اس قدر نفور رہے کہ خود ہی فرماتے تھے۔
سادگی علو اور عظمت کی دلیل ہے۔ میں جب کسی کو بنا ٹھنا دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ نہایت
پست خیال شخص ہے۔ اگر بلند ہمت ہوتا تو اس کی اسے فرصت ہی نہ ملتی جو شخص علوم عالیہ
میں مشغول ہوتا ہے اس کا ذہن ہی ان چیزوں تک نہیں پہونچتا۔"

علمی حیثیت سے حضرت کے تحریری و تقریری کارنامے ایسے بے مثال اور اتنے
بے شمار ہیں کہ ایک بدترین مخالف بھی اعتراف و تسلیم کے سوا کوئی مفر نہیں پاتا۔ ایک مبصر
حضرت کی تصنیفات و تالیفات کی فراوانی دیکھ کر عالم تحیر میں سوچتا رہ جاتا ہے کہ علمی و اصلاحی
شہ پاروں کا یہ انبار کسی ایک ہستی کی حیات مختصر کی کاوش ہے یا کسی ادارہ و انجمن کا اجتماعی

کارنامہ! عالمی انسائیکلو پیڈیا نے حضرت مولانا کی شخصیت کا تعارف صرف کثرت تصانیف کی بنیاد پر کرایا ہے لیکن اگر کوئی مغربی محقق حضرت کی پوری حیات اور کارناموں کا مطالعہ کرے تو بجا طور پر وہ آپ کی شخصیت کو بیسویں صدی کے بطل جلیل کی حیثیت سے متعارف کرانے پر مجبور ہوگا۔ حضرت مولانا کی ایک ہزار کے قریب تالیفات میں تفسیر بیان القرآن کے علاوہ سینکڑوں وہ شاہکار کتابیں ہیں جنہوں نے برصغیر کے پورے مسلم معاشرے میں انقلاب آفریں اثرات پیدا کئے اور لاکھوں گم گشتگان راہ کو ہدایت و نجات کی ابدی سعادتوں سے ہم کنار کر دیا۔ ہزاروں وہ دین کے تاجر جنہوں نے سادہ لوح عوام کے سامنے مذہب کو ایک اضحوکہ بنا کر پیش کیا تھا۔ اور دین کو اپنی اغراض نفسانی کے لئے آلہ کار بنا رکھا تھا۔ حضرت مولانا کے سحر آفریں مواعظ اور باطل شکن تصانیف کے سامنے اس میدان سے روپوش ہوگئے اور جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کے آوازے سے بام و در ایک بار پھر گونج اُٹھے۔

حضرت مولانا کو ایک مصلح ہی نہیں دورِ حاضر کا مُجدد کہنا ایک ایسی حقیقت افروز صدا ہے جس میں مخالف و موافق ہم آواز ہیں۔ حضرت مولانا کی مردم سازی اور تعمیر سیرت کے جیتے جاگتے اور براہ راست نمونے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ابھی تک اِکّا دُکّا موجود ہیں جن کے کردار سیرت میں حضرت مرحوم کی تربیت و محنت نے جو گل کاری کی ہے۔ وہ زبانِ حال سے اس رجلِ عظیم کے اخلاص کی گواہ ہے حضرت کے مجازین کی صف شریعت و طریقت کے اُن شہپاروں سے مزین ہے۔ جنہیں دیکھ کر لاکھوں دلوں کو زندگی ملی اور مل رہی ہے۔ جنہیں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (بانی دارالعلوم کراچی) اور مسیح الامت حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی دام ظلہم وغیرہم وہ مایۂ ناز ہستیاں ہیں کہ

ان اخلاف کو دیکھ کر اس سلفِ صالح اور عالی مرتبت میر کارواں کی بے لوث اور باعمل زندگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کے اخلاص وللّٰہیت کا یہ حضرات کرشمہ ہیں۔ یہ مجازین حضرت تھانوی کے اُس بااصول طرزِ تربیت کی آنچ سے کندن بنے ہیں جو جماعتِ دیوبند میں حضرت مولانا کا طرّہ امتیاز ہے اور جس کی افادیت کا اقرار دبی زبانوں سے حضرت کے وہ معاصرین بھی کرتے رہے جو اس دور میں اس پر نکتہ چیں بھی رہے۔ یہاں تک کہ حضرت کے متوسلین و منتسبین بطور تعریض تھانوی الفکر کے لقب سے نوازے گئے یعنی حضرت مولانا جس جتھے بندی اور گروہ سازی کے خلاف زندگی بھر زبان و قلم سے جہاد کرتے رہے اسی تحزّب اور جتھے بندی کو خود حضرت کے سر منڈھ دیا گیا۔

مخالفتوں کا طوفان جب تک نہ ہو کسی شخصیت کے حقیقی کردار اور استقامتِ مزاج کے خد و خال نمایاں نہیں ہوتے مصلحین کو ناسازگاری ماحول اور نامساعد حالات سے گذر کر ہی اپنے نصب العین کی حقانیت واضح کرنی پڑتی ہے۔ تب ہی ان کی اولوالعزم شخصیت کے بلند قامت لقب سے یاد کیا گیا۔ تب ہی وہ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ کی ترتیب میں آئے اور تب ہی وہ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ کے حقیقی مصداق بنے یہ مخالفت و عداوت ان حضرات کے حق میں دین و دنیا کی سرخروئی اور کامرانی کی دینی و تاریخی علامت ہے۔ حضرت مولانا کی بلند و بالا بصیرت کے بہت سے نقوش اس طعن و تشنیع کے سیلاب میں نمایاں ہوئے اور آپ کی عالی ظرفی۔ بلند فکری۔ صبر و ثبات اور وقار و تمکین کے انمٹ نشان دلوں پر چھوڑ گئے جو آپ کے مجازین کرام اور صحبت یافتوں کے لئے مشعلِ راہ اور نمونۂ عمل بن گئے۔ حضرت مولانا کو ہدفِ تنقید بنانے والے اکثر لوگ اصلاح و ارشاد کے میدان میں خود معارف تھانوی کے خوشہ چیں رہے کیونکہ طریقت کے باب میں حضرت نے

جو تحریری و تقریری ذخیرہ پیش کیا وہ چونکہ اصولی لائحہ عمل سے لے کر فروعی ہدایات اور جزئیات طریق کار تک کو مشتمل ہے اس لئے اس سے اُسی دور میں تقریباً تمام خانقاہوں اور مشائخ نے اس سے فیض حاصل کیا اور ان ہی خطوط پر سب حضرات اپنے متوسلین و منتسبین کو تعلیم کرنے لگے کیونکہ طریق و تعلیم میں جو رطب و یابس بھر دیا گیا تھا۔ حضرت نے اس کی چھان پھٹک کر کے اصولِ تصوف کی ایسی تنقیح فرمائی کہ اس باب میں آپ کا اسم گرامی ایک مجدد کی حیثیت اختیار کر گیا اور اب کسی کو ان اصول و فروع کے اختیار کئے بغیر چارۂ کار نہیں۔

یہ حضرت مولانا ہی کی ذات ہے جو طریقت و تصوف کو حیات نو بخشنے کا سامان بنی۔ آپ نے اس طریق کے نوک پلک ہی نہیں سنوارے بلکہ اس کے اصول و فروع کو عملی اور آسان قالب میں ڈھال دیا۔ حضرت اقدس کی ان مجددانہ خدمات سے مخالفین خود بھی مستفید ہوتے رہے اور آج تک ان کے اخلاف ہو رہے ہیں لیکن اس کے باوجود معاصرانہ چشمک سے بڑھ کر حضرت اقدس کی ذات کو مخاصمت و عناد کا نشانہ بنایا گیا۔ حتیٰ کہ قتل تک کی دھمکیاں دی گئیں۔ انگریزی سامراج کی حمایت اور حکومت نوازی کے الزامات عائد کئے گئے اور تھانوی الفکر حضرات کو تھانے سے ڈرنے والا کہا گیا۔ مگر حضرت کی طرف سے اس پروپیگنڈا مہم کا جواب سوائے ایک باوقار خاموشی اور صبر و سکوت کے اور کچھ نہیں تھا۔

مخاصمت و عداوت کے طوفان سر آتے اور گذرتے رہے لیکن اُس مردِ آہن کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی۔ آپ نے جن محکم اصولوں کی روشنی میں اپنا طریق کار اور فکر و عمل کا دستور مرتب کیا تھا اس پر بے مثال استقامت کے ساتھ گامزن رہے آپ کے کارخانۂ تربیت میں شخصیت سازی اور تعمیرِ سیرت کا مثالی کاروبار جاری رہا اور سیرت و کردار

کے اعلیٰ نمونے مستقبل کے مشائخ کی صورت میں ڈھلتے رہے خانقاہِ تھانہ بھون کے یہ فوائد و ثمرات ہر چشم بینا کے لئے سرمایۂ اطمینان تھے تو حاسدین کے لئے خارزنگاہ ۔ حضرت کی اصول پسندی اور منضبط مزاج نے اُمت کے لئے جو حزب اللہ تیار کیا اُس کے معاندین اور تخرّب پسندوں نے تھانوی گروہ قرار دے کر ایک مستقل اختلاف کی بنیاد ڈالنا چاہی ۔ مگر یہ بھی حضرت مولانا کے اخلاص نیت کی کرشمہ کاری ہے کہ حضرت کے متوسلین اپنے شیخ اور مربی کے اصولوں پر راسخ و ثابت رہتے ہوئے آج تک سیاسیات اور گروہ بندیوں کی لعنت سے پاک رہے انہیں ان کے شیخ کے نقوش قدم سے شان مظلومیت کی دستار وراثۃً ملی ہے جو آج تک ان کے زیب سر ہے لیکن اسی مظلومیت میں ان کی مقبولیت ہے کیوں کہ مظلومیت کا مقام مقام صبر ہے اور صبر ہی بوجہ مظلومیت باعث اجر ہے ۔"

واصبر علی ما اصابک ان ذالک من عزم الامور ،

بطور تحدیث نعمت حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء منتسبین و متوسلین کی دعاؤں سے فیضیابی کے لئے یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راقم ناکارہ کو بفضل خداوندی اور سعی و توجہ والد ماجد حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) یہ سعادت میسر آئی کہ عربی نصاب دارالعلوم دیوبند کی اولین کتاب "میزان الصرف" حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھنے کا موقعہ ملا ۔

فللحمد للہ علی ذالک ۔

اس حبر جلیل کے
یہاں کیا ملتا تھا!

تو میں کہوں گا بصائر و حکم' معرفت امر و خلق' حقوق کا اہتمام' فرائض کی شناخت' مال کے مصارف ومداخل میں احتیاط' معاملات و معاشرت میں حدود کی رعایت' سنتہ اللہ اور عادت اللہ کی خبر' ایام اللہ اور آلاءِ اللہ پر نظر' مکاسب اور مواہب کی تمیز' مقام وحال کی معرفت' تہذیب اخلاق' واقفیت احوال' مکارم ومحاسن اور رذائل خبائث کا امتیاز' اس کی عالیانہ الوہیت وعظمت' اپنی عاجزانہ حیثیت عبدیت کا استحضار

او نیازے عجبے من بنیاز عجبے کا مکمل مرقع تھے۔

حضرت مولانا حکیم عبد الرشید محمود صاحب گنگوہیؒ

مقالہ نمبر ۱۱

حکیم الامت حضرت تھانوی رح

چودھویں صدی کے

مجدد

حضرت علامہ انظر شاہ صاحب کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کہنے والے نے کہا تھا اور سچ ہی کہا پندرہ سو سال پہلے کہا تھا اور کسی سازگار ماحول یا موافق فضا میں نہیں بلکہ گرد و پیش، گھٹا گھٹا، ذرہ ذرہ مخالف، گھر گھر دشمنی، فرد فرد آمادۂ مخالفت قبائل برسرپیکار، خاندان معاند، قریش کے جیالے جان لینے پر تیار اور سب کا متفقہ فیصلہ یہ،

ترجمہ:۔ نہ سنو قرآن کو اور پڑھنے کے وقت غل غپاڑہ کرو شاید یہ تدبیر تمہیں غالب کر دے اسی تاریک تر ماحول میں دبے بھینچے انداز میں نہیں بلکہ کھلے اور اعلانیہ انداز میں سنانے والے نے سنایا۔ کیا سنایا؟ ایک پیغام سرمدی کس کا پیغام؟ اسی کا جس کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی چوں کہ وہ فعال لما یرید ہے سنایا ہے یہ

ترجمہ:۔ ہم ہی نے اتارا ذکر اور ہم ہی ہیں اس کے حفاظت کرنے والے۔

اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس بھرپور لب و لہجہ اور پُر اعتماد انداز میں اتنے اہم اور تاریخی اعلان کا حوصلہ بجز اس واحد القہار کے کون کر سکتا ہے کہ قوتوں کا مرکز وہی اور ہمہ جہت اقتدار اسی کے لئے ہے"

مصرعہ سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

ورنہ تو سورۂ کہف میں ہے کہ اک "دشمن خرد و ہوش" نے جب اپنا سرسبز و شاداب باغ شاخیں پھلوں سے لدی ہوئیں کیاریاں پھول پھلواری سے لبریز، آب رسانی کے انتظامات، درخت قطار اندر قطار، دیکھ کر نشۂ مال میں مستانہ نعرہ لگایا،

ما اظن ان تبید ھٰذہٖ ابدا "بولا مجھ کو نہیں آتا خیال یہ سب کچھ دیکھ کر، کہ خراب ہو یہ باغ کبھی پھر ہوا کیا؟ یہ

واحیط بثمرہٖ فاصبح یقلب کفیہ علی ما انفق فیھا وھی خاویۃ

علیٰ عروشھا ویقول یٰلیتنی لم اشرك بربی احداً"

اور سمیٹ لیا اس کا سارا پھل پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نچاتا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا اور ڈھا پڑا تھا اپنی چھتوں پر اور کہنے لگا کیا خوب تھا کہ میں ساجھی نہ بناتا اپنے رب کا کسی کو، حالانکہ اس تباہی و بربادی سے پہلے اس کا خیال خام تھا کہ زمینی و آسمانی آفات اس کے باغ کو آنچ تک نہیں پہنچا سکتیں اور اگر کسی مصیبت نے بھول کر ادھر کا رخ کیا تو اپنے تموّل کے طمانچوں سے یا پھر گروہی قوت سے پیچھے دھکیل دوں گا مگر جب جھنجوڑنے والے نے جھنجوڑا تو

ولم تکن لہٗ فئۃ ینصرونہٗ من دون اللہ وما کان منتصرا

اور نہ ہوئی اس کی جماعت کہ مدد کریں اس کی اللہ کے سوا اور نہ ہوا وہ کہ بدلہ لے سکے"

بلا شان و گمان تہلکہ خیز بربادیوں کے جب یہ مہیب منظر سامنے آتے ہیں تو منکر ہو یا مقر مومن ہو یا کافر ہر ایک کہہ اٹھتا ہے، ھنالك الولایۃ للہ الحق وہاں سب اختیار ہے اللہ سچے کا" اور رہا مومن تو کسی لمحہ اور کسی لحظہ بھی ہمہ جہت وسائل کے ہوتے ہوئے القہار کی عظمت طاقت و قوت سے اپنے دل و دماغ کو خالی نہیں کرتا چنانچہ سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے بارے میں ارشاد ہے"

انا مکنّا لہٗ فی الارض واٰتیناہ من کل شیٔ سببا

اور ہم نے اس کو جمایا تھا ملک میں اور دیا تھا ہر چیز کا اسباب زمینی طاقت کا یہ سرمایہ دار جس کو دینے والے نے اقتدار کے لئے مطلوب ہر چیز عطا کی تھی یاجوج ماجوج کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط دیوار کی تیاری کے بعد بولا تو صرف یہ،

ھٰذا رحمۃ من ربی فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکا

وکان وعد ربی حقا

یہ اک مہر ہے میرے رب کی، پھر جب آوے وہ وعدہ میرے رب کا

گرادے اس کو ڈھا کر اور ہے وعدہ میرے رب کا سچا

حالانکہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ سربہ فلک یہ دیوار بلکہ سیسہ پلایا ہوا یہ حصار اپنے مقصد میں کامیاب تھا ارشاد ہے

فما استطاعوا ان یظھروہ وما استطاعوا لہ نقبا

پھر نہ سکیں کہ اس پہ چڑھ آویں اور نہ سکیں اس میں سوراخ کرنا

کچھ سمجھے آپ انسانی کوششوں پر اعتماد اور ایسا جو خود فراموشی سے خدا فراموشی کی طرف لے جائے مومن سے تو بعید ہی ہے رہ گیا منکر سو وہ اپنے وسائل و اسباب کے بوتے پر زوال کا تصور نہیں کرتا ٹھیک اسی وقت بطش شدید کا ایک جھٹکا اس کے تصورات کی کائنات کو درہم برہم کر دیتا ہے پھر کون ہے کہ اپنے کسی شاہکار پر اس پر اعتماد لہجے میں اعلان کرے

"ہم ہی نے اتارا اس قرآن کو اور ہم ہی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

پندرہ سو سال کے طویل عرصے میں قرآن کے مضمون و مطالب۔ مقاصد و معانی پر سفاکانہ حملوں کے ساتھ خود اس "الذکر" پر کیسی کیسی یورشیں ہوئیں مگر یہ اسی آن بان کے ساتھ محفوظ ہے اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گا یہ عالم عالم اسباب ہے خود قدیر وقادر نے اسباب اختیار کئے بلکہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ" فرما کر اختیار اسباب کی راہ سجھا دی تو اس دور میں جب کہ چھپائی کے یہ لگے بندھے اور ترقی پذیر اسباب نہ

تھے مگر حفاظت کی ذمہ داری لی جا چکی تھی قرآن پر ایمان لانے والوں کو وہ بے نظیر حافظے عطا کیئے کہ جوان، بچے، بوڑھے، مرد و عورت، پڑھے لکھے، اَن پڑھ، ادنیٰ اور اعلیٰ ہر صیف اور ہر حلقے میں حفاظ لاکھوں کی تعداد میں مہیا ہیں حفاظت کے وعدے کے ایفاء کا یہ وہ مظاہرہ ہے جسے حریف بھی تسلیم کرتے ہیں۔

اور چونکہ قرآن دین کا سرچشمہ و معدن ہے اس لئے قرآنی حفاظت کے وعدے میں دین کی حفاظت کا بھی وعدہ نکل آیا پھر اس پر بھی غور کیجیے کہ قرآن نہیں صرف اترا بلکہ پیغمبر اعظمؐ کو بھی مبعوث کیا گیا اور ان پیغمبرؐ نے قرآن ہی نہیں پہونچایا بلکہ قرآنی نقشے کے مطابق افراد رجال تیار کیئے اس سے معلوم ہوا کہ دین میں قانون کے ساتھ شخصیت بھی ایک مقام رکھتی ہے "ما انا علیہ واصحابی" سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اس کو مختصر یوں سمجھئے کہ دین نام ہے اتباع سنت، بوساطت شخصیات کا لہٰذا اسلام میں صرف قانون کو تھام لینا صحیح نہ ہوگا اور ایسے ہی "نری شخصیت پرستی" صحیح اسلام نہ ہوگا جب اسلام مذکورہ بالا مجموعے کا نام ہوا تو ایمانیات پر گفتگو کرنے والا متکلم کہلائے گا قرآن و حدیث سے احکام کا استنباط کرنے والے فقہاء ہوں گے قرآن موضوع ہوگا تو مفسر کہلائیں گے، حدیث اور اس کے تمام گوشوں سے بحث ہوگی تو محدثین کا طائفہ سامنے آئے گا، صحیح نسبت احسانی کے حامل صوفیاء، دین پہونچانیوالے مبلغ کہلائیںگے دین سنانے والے واعظ، اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جانسپاری کرنے والے مجاہد، سرچشمۂ دین سے بدعات و محدثات کا غبار ہٹانے والے مجدد، یہ سب مل کر دین کی حفاظت کا کام کریں گے تو عالم اسباب میں خدا تعالیٰ کے اس وعدے کے ایفاء کا ظہور ہوگا جو "نحن نزلنا الذکر" سے کیا گیا تھا۔

پس جس طرح جسم کی گاڑی کو اعضائے ظاہر و باطن مل کر کھینچ رہے ہیں دین کے قافلے کی قیادت میں سب ہی کا اشتراک و حصہ ہے پیش کردہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ تجدید دین، دین کا ایک اہم شعبہ ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہر صدی میں ایک اہم شخصیت اس ذمے دارانہ منصب کے لئے پیدا کی جاتی رہے گی چاروں خلفاء، ہر چہار فقہاء، عمر ابن عبدالعزیز خلیفہ راشد، سلسلہ تصوف کے مستند مکاتیب فکر کے چاروں سرخیل، ہندوستان میں مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ وغیرہ اسی مقدس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ کبھی تجدیدی شان کی جلوہ نمائی فرد واحد کے بجائے جماعت کی صورت میں ہوتی ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ دین کے جس شعبے پر بدعات و محدثات حملہ آور ہوں گے اور اس سے جس قدر ماحول ابتر ہوگا تجدید اسی شعبے میں نمایاں ہوگی اور قرب قیامت میں چونکہ فتنے کسی ایک ملک یا کسی ایک شعبے کے نہیں ہوں گے بلکہ ایسے عالمگیر فتن پھوٹ پڑیں گے جس سے کل اسلام متاثر ہوگا تو اولاً مہدی اور متصلاً عیسیٰ علیہ السلام کو بحیثیت مجدد سامنے لایا جائے گا کہ جب تک بیماریاں معمولی ہوں تو معمولی طبیب و ڈاکٹر کا معالجہ کام دے جاتا ہے لیکن جانگسل عوارض کی صورت میں اختصاصی معالج ہی درکار ہوں گے معلوم ہوا کہ مجدد کا کام سمٹتا اور پھیلتا رہتا ہے اور اسی لئے مجددین بھی فرق مراتب رکھتے ہیں یہ بھی نہ بھولئے کہ کبھی مجدد کو اپنے مجدد ہونے کا علم تک نہیں ہوتا بعد والے اس کے کارناموں کو دیکھ کر مجدد ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن نبی و رسول تو ان پر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا کہ وہ اپنی نبوت و رسالت سے لاعلم ہوں اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ راقم السطور کے علم و یقین میں "حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز بلاشبہ مجدد ہیں اور ابھی آپ مجھ سے سن لیں گے کہ خود حضرت کا اپنے بارے میں یہی خیال تھا چنانچہ اپنے شہرۂ آفاق مجاز علامہ سید سلیمان ندوی سے ایسے ہی استفسار کے جواب میں فرمایا۔

"خیال تو میرا بھی یہی ہے لیکن بہ مرتبہ ظن، یقین کی کوئی دلیل میرے پاس موجود نہیں البتہ سلوک و تصوف میں بلاشبہ مجدد ہوں کہ اس شعبے کو میں نے ایسا نکھار دیا کہ سو سال تک بدعت و جہالت کا گرد و غبار اثر انداز نہ ہوگا"۔

جن سعید اشخاص کو حضرت کے ذوق و افتادِ طبع سے براہ راست واقفیت ہے یا تصانیف و ملفوظات کی وساطت سے آپ کی فطرت سلیم کا اندازہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت روایتی نہیں بلکہ حقیقی کسر نفسی، نمائشی تواضع نہیں بلکہ واقعی ہضم نفس کے پیکر تھے اپنے بارے میں بار بار فرماتے۔

"میں بقسم کہتا ہوں کہ دنیا میں مجھے اپنے سے زیادہ ذلیل نظر نہیں آیا بلکہ میں اپنے آپ کو ہر مسلمان سے فی الحال اور کافر سے فی المآل حقیر جانتا ہوں"۔

کیا ایسے متواضعانہ خیالات و افکار کے حامل سے ممکن ہے کہ وہ بلا وجہ اپنے لئے مجدد ہونے کا گمان رکھے؟ پھر اس کے ساتھ اسے بھی ملایئے کہ حضرت والا کے ہی عہد میں حضرت مولانا سید حسین احمد ہیں سیاسی ذوق میں دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہے لیکن الجمعیتہ شیخ الاسلام نمبر میں ہے کہ حضرت تھانوی کی وفات کے بعد جب مولانا مدنی سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا حضرت تھانوی مجدد تھے فرمایا بلاشبہ مجدد تھے خصوصاً سلوک و تصوف میں جو کام حضرت نے کیا وہ تجدید سے تعلق رکھتا

ہے اس لئے مجھ بے بضاعت کو توقیق ہے کہ وقت کے ساتھ مجدد تھانوی کی تجدیدی شان کو تسلیم کرتے ہوئے امت کا صالح طبقہ آپ کے مجدد ہونے پر اتفاق کرلے گا اب آیئے پہلے توان اوصاف و میزات کا جائزہ لیں جو مجدد کے لئے مطلوب ہیں پھر اس فاسد گردوپیش کا جائزہ بھی ضروری ہے جس سے آپ کا عہد بری طرح متاثر تھا اور اس علمی و عملی تجدید کا نقشہ بھی سامنے لانا ہے جس سے آپ کی تجدید کے طول وعرض کا علم ہو عرض کرچکا ہوں کہ مجدد کا منصبی فریضہ طاغوت کی پیدا کردہ اندھیریوں کو دور کرنا ہے اس لئے ماننا ہوگا کہ مجدد۔ شریعت اور اس کے قریب و بعید شعبوں پر تام مہارت کا حامل اور خفی و جلی گوشوں پر کامل بصیرت رکھتا ہے شریعت کے شعبے تنوع و تعدد کے اعتبار سے بے شمار ہیں تاہم ان میں کچھ اصولی ہیں اور کچھ فروعی عقائد کا معاملہ مہتم بالشان ہے عبادات، احکام، فرائض، واجبات، منہیات، صحتِ عقیدہ کے بعد ہیں معاملات کی درستی تیسرے نمبر پر ہے باطنی و ظاہری نزہت، نمبر چار پر اور معاشرت پانچویں درجے پر، الحمد للہ ان تمام شعبہ جات میں التھانویؒ کے قدم رسوخ کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔

اگر عقائد میں جھول اور عمل صالح میں کوتاہی ہو تو پابند شریعت نہیں کہا جاسکتا اس لئے جہاں مستند اور صحیح علم کی ضرورت ہے وہیں اتباع سنت کا اہتمام اس طرح مطلوب ہے کہ سنن نبوی سے سرمو بھی انحراف نہ ہو الحاصل علم صحیح ہو اور جن معادن سے اس کو لیا گیا ہو وہ صاف و شفاف ہوں چونکہ علم معلومات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ وہ اک نور ہے جو عالم ربانی کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے جن اشخاص و رجال سے علم حاصل کیا جائے وہ ہمہ جہت ٹکسالی ہوں چونکہ اسلامی علوم نرے علوم نہیں بلکہ اجزائے دین ہیں

اسی لئے مشہور ہے کہ اِنّ ھٰذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم خدا کا شکر ہے کہ مجدّد تھانوی کے اساتذہ اعتقادات میں سلف صالحین، کی روش پر، علوم عبقریت کے حامل، عمل میں اکابر کا نمونہ، اتباع سنت میں ممتاز، تزکیہ وتجلیہ کی مسافتیں طے کئے ہوئے امانت دیانت، تقوی وتورع، احتیاط وثقاہت کے پیکر تھے ان خزینوں سے علوم کے جو موتی التھانوی کے جیب و دامن میں پہونچے ان کے آب دار وتاب دار ہونے میں کیا شبہ ہے پھر یہ بھی ہے کہ صرف حصول علم سے کیا ہوتا ہے تا وقتیکہ علم کے تقاضوں کی تکمیل کا فکر سوار نہ ہو تو اس باب میں بھی تحقیق وتفتیش سے کام لے کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت کا کوئی عمل، علم صحیح سے ہٹ کر نہیں ہے لاریب وہ عالم ربانی ہیں اور اس جلیل منصب کے لئے مطلوب تمام اوصاف بقوت ان میں موجود ہیں چند واقعات آپ بھی سن لیجئے کہ یہ دعوی مدلل ہو کر آپ کے سامنے آئے ملفوظات میں ہے کہ

> "اک روز اک نو وارد نے حضرت والا کی خدمت میں قیمتی مصلّٰی پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ مصلی خرید کر آپؐ کی جانب سے مولانا اشرف علی کو پیش کروں۔"

اگرچہ حضرت کے یہاں یوں بھی ہدایا کے قبول کرنے میں احتیاط قاعدے اور ضابطے تھے لیکن یہ واقعہ منفرد نوعیت کا تھا مگر حضرت نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا یہ شخص تین روز مسلسل اپنے ہدیہ کے قبول کرنے پر بہ لجاجت مصر رہا اس کی بے قراری وبے تابی دیدنی تھی اس لئے بعض مزاج داں بھی سفارش کے لئے کھڑے ہوگئے اس پر حضرت نے فرمایا کہ "یہ شخص مغلوب الحال ہے اور شرعاً اس کا مال لینا حرام

ہے" اللہ اکبر پیش کرنے والا جس ذات اطہر کی جانب ہدیہ کی نسبت کر رہا تھا اس کے باوجود اک شرعی مسئلے کا اس درجہ اہتمام نام نہاد مشائخ کی رسوائے عالم لوٹ مار میں حیرت انگیز ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اُلجھے ہوئے مسائل میں ابوحنیفہ الامام آخری فیصلہ مبتلیٰ بہ پر چھوڑ دیتے ہیں اور پھر حضرت تھانوی تو بلاشبہ فقیہ الامت تھے جن کے فتاویٰ پر آج بھی کروڑوں مسلمان باطمینان خاطر حرام و حلال، جائز و ناجائز، کے فیصلے قبول کر رہے ہیں مگر آپ ہی کو اک روز نماز کے ختم پر دانتوں میں کچھ خون کا شبہ ہوا تو نماز کی صحت و عدم صحت کے بارے میں اپنی رائے پر اعتماد کے بجائے دو مستند اہل فتویٰ کو دکھا کر نماز کی صحت کا اطمینان حاصل کیا ان علمائے ربانی کی یہی شان تھی سنا ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی علیہ الرحمہ کو اک استفتاء انگریزی اشیاء کے استعمال و عدم استعمال کے بارے میں دیا گیا تو آپ نے جواب لکھنے کے لئے اپنے ممتاز شاگرد علامہ کشمیری کو دیا عقیدت کیش شاگرد نے والا شان استاذ کی موجودگی میں جواب سے گریز کیا تو حضرت نے فرمایا کہ مجھ پر فرنگ دشمنی جس درجہ غالب ہے اس کے ہوتے ہوئے میں خود کو مامون نہیں سمجھتا خدانخواستہ کہیں فتویٰ طبعی جذبات سے متاثر نہ ہو جائے۔"

ع اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

یہ واقعہ تو بے اختیار قلم پر آگیا میں تو آپ کو حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کے ورع، تقویٰ اور احتیاط کے واقعات سنا رہا تھا دانت کی تکلیف کے دوران لاہور کے کسی معالج نے دانت میں سونے کے استعمال کی تجویز کی حضرت کو اس میں کچھ اُلجھن تھی تو باضابطہ دارالعلوم کے دارالافتاء سے استفتاء فرمایا اس وقت کے مسند نشین

اہتمام وافتاء حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب و حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے تھانہ بھون حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ خود فقیہ الامت ہیں آپ کے ہوتے ہوتے ہم اس پر کیا لکھیں فرمایا کہ یہ میری ذاتی الجھن ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے لئے کوئی سہولت کی راہ نکال لوں" اگر مقالے کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس طرح کے احتیاط کے واقعات آپ کی سوانح سے بکثرت پیش کئے جاسکتے ہیں علم کامل، عمل صالح متورعانہ انداز کے ساتھ تدبیر و تدبر مصلحت اندیشی اور اقدام و عمل میں جس درجے کی حکمت و بصیرت تجدیدی کام میں مطلوب ہے تو حضرت میں ان اوصاف کی تلاش میں کسی کاوش کی ضرورت نہیں آپ اپنے عہد ہی میں حکیم الامت کے لقب سے معروف ہو چکے تھے تربیت سالکین جو آپ کے خصائص میں ہے اس ذیل کی مراسلت مطبوعہ موجود ہے اس کے مطالعے کے بعد یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ مکاید نفس پر اطلاع میں حضرت بے مثال واقع ہوئے ہیں پھر صحیح تشخیص کے ساتھ کارآمد تجویز آپ کی انفرادیت ہے غرضیکہ جو اوصاف اک مجدّد کی شخصیت میں درکار ہیں التھانوی ان کے جامع ہیں۔

اب آیئے اس ماحول کی جانب جس میں حضرت نے تجدیدی کام کا آغاز کیا تو معلوم ہے کہ ہندوستان میں باستثناء چند علاقوں کے اسلام ان واسطوں سے نہیں پہونچا جو رسول اعظم فداہ روحی کے تربیت کردہ تھے یہاں کا اسلام صوفیاء و علماء کی دین ہے جہاں جو چیز راسخین فی العلم اور محقق صوفیاء سے پہونچی وہ تو بے غبار ہے اور اگر درآمد کرنے والے خام کار ہیں وہی الجھی ہوئی ہے پھر یہ بھی ہے کہ ملکی اثرات حقائق کو بھی متاثر کرتے ہیں دوسری طرف فرنگی اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے فرقہ بندیاں اور ان میں تصادم، حکمت عملی کا اہم تقاضہ تھا اس لئے شیعیت و غیر شیعیت کے جھگڑے، دیوبند اور بریلی کی آویزشیں،

تقلید و عدم تقلید کا ہنگامہ، شریعت و طریقت کی باہمی رقابت، بدعت و سنت کی مقابلہ آرائی، فرقہ پرستی، پیر پرستی، اور خدا جانے کتنی اور بلائے بے درماں مستزاد قدیم و جدید تعلیم ایک دوسرے کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑی تھیں اور دونوں سے وابستہ حلقے ایک دوسرے پر تبرا کر رہے تھے اور اسے بھی کیوں چھوڑیئے کہ غیر منقسم ہندوستان میں سیاسی اختلافات نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا تھا نیز پنجاب سے ختم نبوت پر جو سفاکانہ حملہ ہوا اس کی شدت نے تو پورے ماحول کو تنور بنا رکھا تھا اس تیرہ و تار ماحول میں چودہویں صدی کے مجدد کو کام کرنا تھا۔

یہ تسلیم ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی سے تجدیدی کام کی بنیاد پڑ چکی تھی اور امام دہلوی کو بھی اپنے دور میں اسلامی اقدار و افکار کی حفاظت کا اہم کام انجام دینا پڑا مگر اول الذکر کی تمام تر محنتیں اکبر کے الحاد و زیغ کے مقابلے میں تھیں اور ثانی الذکر کی کوششوں کا دائرہ دور زوال میں در پیش ابتلاء کے حل تک محدود تھا اگرچہ مجدد تھانوی کے ماحول سے متعلق فتنے ان دونوں عظیم شخصیتوں کے دور میں تھے لیکن ان فتنوں نے شدت اسی زمانے میں اختیار کی جو حضرت تھانوی کا عصر ہے اور اسے بھی مت بھولیے کہ حضرت مجدد الف ثانی کے وقت میں اکبری الحاد کے اثرات آہستہ آہستہ مضمحل ہو چلے تھے فتنہ صرصر کی صورت میں نہیں رہا تھا بلکہ اسلامی اقتدار ہونے کی بناء پر فتنے کی مزاحمت شدید تھی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے تجدیدی اوقات اس طرح گذر رہے تھے کہ مسلمانوں کا عروج اگرچہ تیزی سے زوال پذیر تھا تاہم مقاومت کی توانائیاں یکسر ختم نہیں ہوئیں تھیں لیکن مجدد تھانوی کے عہد میں صرف تن رنجور تھا اور امراض کے تابڑ توڑ حملے دفاعی قوتوں سے محرومی، مزاحمت کے جذبات سے عاری دل و دماغ، خانقاہ نشین گنگوہ، سہارنپور،

رائے پور اور دیوبند سے اسلام کا دھڑکتا دل دار العلوم دیوبند ضرور مصروف کار تھے لیکن مجددانہ کاروبار وہی شخصیت کرسکتی تھی جو خزاں آشنا ماحول پر دل سوزی و غمگساری کے مخلصانہ جذبات سے بہرہ ور ہو موصوف کو ملت کے دینی و ذہنی افلاس کے نتیجے میں مسلمانوں کے چند در چند مصائب کا احساس کس درجہ مضطرب کئے ہوئے تھا اس کا اندازہ اک مجلسی بیان سے ہوسکتا ہے فرمایا کہ

"اگر مسلمانوں کی کوئی مصیبت کھانے سے پہلے یاد آجاتی ہے تو میری بھوک اڑ جاتی ہے اگر نیند سے پہلے یاد آجاتی ہے تو نیند اڑ جاتی ہے ترکوں پر مصیبت آئی تو میرا حال یہ تھا کہ لقمہ منہ میں رکھتا تھا لیکن نگلا نہیں جاتا تھا۔"

اندوہ و ملال کی یہ کیفیات اک سچے پکے مسلمان ہی کی خصوصیت ہے ورنہ اب تو ملت کی حرماں نصیبی کا یہ حال ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو جن عالمی مشکلات کا سابقہ ہے اس پر کچھ نام نہاد مسلمان تو اسلام ہی میں کیڑے نکالنے لگے اور کچھ ناداں دوست مسلمانوں میں کیڑے ڈالنے لگے فالی اللہ المشتکی۔

اور یہ بھی سنئے کہ ایک جانب موصوف ان کرب انگیز کیفیات سے دوچار تھے لیکن اس عالم میں بھی آپ کی معروف احتیاط اس طرح زبان پر آتی کہ اسی مجلس میں مزید ارشاد ہوا

"اس بات سے بھی ڈر لگتا ہے کہ اگر اللہ تعالی یہ فرمائیں کہ جب سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا تھا تو رضا بالقضا کیوں نہ تھی اور یہ خوف بھی نہیں جاتا کہ کہیں یہ سوال نہ فرمادیں کہ مسلمانوں پر مصائب آرہی تھیں تمہیں صدمہ کیوں نہیں تھا۔"

دیکھا آپ نے کہ اس بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز پل صراط پر مومن

کا اندازہ فکر اور گفتار کیا ہوتا ہے الم انگیز ان جذبات کے دوش بدوش مومن کی یہ بھی اک شان ہے کہ مسلمانوں کی آسودگی و آسائش پر اس کا ایمان اہتزاز میں آجائے مجدد تھانوی میں یہ ایمانی رخ بھی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے خود فرماتے ہیں۔

"جب میں باہر نکلتا ہوں اور مسلمانوں کی بڑی عمارتیں دیکھتا ہوں تو دل خوش ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دنیاوی نعمتوں سے بھی محروم نہیں فرمایا۔"

اس مسرت و طمانیت پر یہ اشکال نہ ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو پُرشکوہ عمارات، رفیع الشان بنگلوں، امیرانہ کوٹھیوں کو قیامت کی علامات میں شمار کیا ہے اہل علم جانتے ہیں کہ اس مضمون کی حدیث میں یتطاولون کا لفظ موجود ہے جس کا صاف وسیدھا مطلب عمارات سے آسودگی و آسائش مقصود نہیں بلکہ اپنے رئیسانہ نخوت کے جذبات اور امیرانہ ٹھاٹ باٹھ کا مظاہرہ ہو پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ دوسری قوموں کے مقابل اگر مسلمانوں کی پسماندگی رلانے والا سانحہ ہے تو ان کی آسودگی و خوشحالی مسرور کرنے والا واقعہ ہوگا۔

پھر تری دلسوزی سے کام نہیں چلتا بلکہ معاشرے کو مریض بنانے والے اک اک جرثومے پر مجدد کو تام اطلاع ہونی چاہیئے تو اس سلسلے میں حضرت کے مجلسی ارشادات اور آپ کی تصانیف شاہد عدل ہیں کہ آپ کو من جانب اللہ کیسی دوربین نظر اور کتنی دوراندیش عقل عنایت کی گئی تھی مسلم معاشرے میں مرغوب و پسندیدہ رسوم میں آپ کی حذاقت و فراست نے کن کن مفاسد کی نشاندہی کی ہے وہ آپ کا منفرد امتیاز ہے شھد شاھد من اھلھا کے اصول پر ایک دو ملفوظ پیش خدمت ہیں عملیات کے سلسلے میں افراط و تفریط سب کو

معلوم ہے ایک طبقہ جادو، منتر، ٹوٹکے، ٹونے کے استعمال سے بھی مجتنب نہیں حالانکہ ان کا بڑا عنصر استمداد بغیر اللہ اور کلمات کفر آمیز ہیں دوسرا طبقہ اعمالِ قرآنی کو بھی شرک بتا رہا ہے استعمال کرنے والے جائز و ناجائز حرام و حلال کا فرق اٹھا کر اندھا دھند استعمال کر رہے ہیں ملت کے غمگسار نے اعمالِ قرآنی لکھ کر صراطِ مستقیم سمجھائی لیکن یہ تنبیہ بھی ضروری سمجھی کہ ان عملیات کو ناجائز و حرام مواقع پر قطعاً استعمال نہ کیا جائے گا یا یہ کہ کسی عمل و تعویذ کو حقیقی مؤثر و تقدیر الٰہی کو بدلنے والا نہ سمجھا جائے اس ذیل میں بھی حضرت کی مجددانہ طبیعت اور محتاط روش نے اک دقیق شرعی مسئلے کی جانب عاملین کو توجہ دلائی فرمایا کہ

"عاملین کے پاس عورتیں شوہر کی تسخیر کے لئے تعویذ کے لئے آتی ہیں اور یہ بے تکلف دیئے چلے جاتے ہیں حالانکہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر حقوق واجبہ ادا کر رہا ہے تو اسے کلیتاً مسخر کرنے کا تعویذ یا عمل دینا لینا حرام ہے اور اگر حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہے تو صرف ایسا ہی تعویذ یا عمل کیا اور کرایا جا سکتا ہے کہ شوہر حقوق واجب کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہو۔"

دیکھنے میں تو بات چھوٹی سی ہے لیکن میرا یقین ہے کہ عوام تو درکنار لاکھوں خواص کو بھی مسئلے کی اس نزاکت کا احساس تک نہ ہوگا اور سنئے نہ فن طبابت پر اطلاع، نہ امراض کے نشیب و فراز، سے واقفیت نہ ادویہ کے خواص سے آگاہی، نہ موسم کے آثار نہ چڑھاؤ کا لحاظ چند نسخے ادھر اُدھر سے لے کر دوکانداری کے لئے مطب کھول دینا اور مریضوں کی جان خطرے میں ڈالنا شرعی نقطۂ نظر سے یہ بھی حرام ہے اس عمل کی شناعت و قباحت پر بھی اپنی تصنیف اصلاح الرسوم نامی میں توجہ دلائی مختصر یہ کہ معاشرے میں موجود اک

اک روگ پر اس باخبر نے باخبر کرنے کے ساتھ علاج و ازالہ کی مفید تجاویز اور مثمر تدابیر بتائی ہیں۔

اور جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ غیر منقسم ہندوستان کا اسلام ملکی اثرات و تمدن سے متاثر ہوا تو خود بدنصیب مسلمان نے پیدائش سے موت بلکہ موت کے بعد تک وہ رسوم و رواج بے تکلف اختیار کر لئے جس سے ایمان و اسلام کی کشت زار خزاں آشنا ہو کر رہ گئی سینکڑوں باطل رسوم میں گھرے ہوئے مسلمان کو اک اک رسم کے باطن میں موجود زہر ہلاہل پر حضرت نے اطلاع دی اور ماحول کے غلط اثرات کے نتیجے میں جس طرح مسلمانوں کو اقتصادی تباہ کاریوں کا شکار ہونا پڑا اور قرضے پر لی ہوئی سودی رقم کے خوفناک اثرات کے نتیجے میں جس طرح معاشی ڈھانچہ بدل گیا اس زبوں حالی سے نکالنے کے لئے کامیاب تدابیر کا سراغ لگایا ان کو پڑھ لیجئے تو حضرت کے مجدد ہونے کا مسئلہ صاف و شفاف ہو جائے گا حضرت ہی نے بتایا کہ غیر مسلم قوموں میں لڑکی نہ میراث میں شریک ہے نہ اس کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام اس کوتاہی کی تلافی کے لئے دوسری قوموں نے شادی کے بعد دینے لینے کے غلط سلط طریقے ایجاد کئے تو دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی ان رسوم کا خود کو پابند کر لیا حالانکہ اگر لڑکیوں کا شرعی حق ادا نہیں ہوا تو تلافی کی تمام صورتیں بے سود اور اگر حق ادا ہو چکا تو بلا وجہ کا یہ التزام اس پر بھی نظر پہونچی کہ شادی کی بیشتر رسموں میں تفاخر و نمائش کے جذبات کارفرما ہیں اور موت کے بعد کی رسوم میں ایصال ثواب تو اک شرعی حقیقت ہے لیکن رسمی جکڑ بندیوں میں آکر وہ بجائے ثواب کے عذاب بن جاتا ہے الحاصل اک ہمدرد مصلح شفیق معالج، اور بالغ النظر مجدد کے شاہکار آپ کی ہر تصنیف اور ہر مجلس سے نمایاں ہیں۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد گرامی میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ

کے تمسک کو امت کے صراط مستقیم پر مستقیم رہنے کا سب سے قوی ذریعہ بتایا تھا امام دہلوی نے اپنے دور میں تباہ حال ملت کے لئے ان ہی دو اہم بنیادوں سے کام لینے کی بنیاد ڈالی خود قرآن مجید کی تفسیر لکھی فہم قرآن کے اصول قلم بند کئے امام مالک کے جمع کردہ ذخیرۂ حدیث کی شرح کے لئے قلم اُٹھایا اور اسے بخت و اتفاق نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب کے خانوادے کے نامی گرامی اشخاص ان ہی دو بنیادی امر کی قولاً و قلماً لگے رہے ایسا نہیں بلکہ یہ شاہ صاحب کی اسکیم کے اجزاء ہیں اور مرحوم کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل ہے ٹھیک اسی طرح مجدد تھانوی نے بھی قرآنی پیغام کو عام کرنے کے لئے اردو تفسیر پر قلم اٹھایا یہ تفسیر بجائے خود کتنی منضبط، مستند اور باوقار ہے کہ قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری کے اصول کے مطابق علامہ انور شاہ کشمیری کا وہ پرشکوہ تبصرہ سنئے جو بیان القرآن کے مطالعے کے بعد منتہی طلبہ کے سامنے فرمایا،

"میں اُردو زبان سے حد درجہ بدگمان تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کا دامن علوم سے خالی ہے اور اسی لئے میں نے اپنے ذوق علمی کو محفوظ رکھنے کی خاطر نجی مراسلت بھی عربی میں کی یا فارسی میں لیکن بیان القرآن کے مطالعے کے بعد اُردو سے میری بدگمانی یکسر ختم ہو گئی اتنی چست تفسیر آج تک دیکھنے میں نہیں آئی تھی"۔

خود اس بھاری بھرکم تبصرے کو امام تھانوی نے سننے کے بعد فرمایا"

"کہ جب اتنے بڑے علامہ کی توثیق مجھے حاصل ہو گئی اب میں مزید کسی توثیق کا منتظر نہیں ہوں"۔

قرآن کی روشنی میں ان احکام کی بھی ترتیب آپ کے پیش نظر رہی جو احکام القرآن

کہلانے کے مستحق ہیں یہ اہم علمی ذخیرہ حال ہی میں پاکستان میں چھپ گیا میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ حضرت موصوف کے دور میں تقلید و عدم تقلید کے جھگڑے شباب پر تھے اور ایک گروہ تقلید کو شرک گردانتے ہوئے ابو حنیفہ الامام کو بڑا مجرم ثابت کر رہا تھا اور ان کی فقہ کو عقلی موشگافیاں بتا کر حدیث سے اس کا استناد پوری قوت سے توڑ رہا تھا امام تھانوی نے اس طرف بھی توجہ کی اور آپ کی کوششوں کے نتیجے میں اعلاء السنن نامی وہ ذخیرہ علمی حلقوں میں پہونچ گیا جس سے حنفی فقہ کی استنادی حیثیت اتنی مضبوط ہو گئی کہ اب اسے اقوال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بے نیاز بتانا مکابرہ ہے بات بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن کیا جائے حکیم الامت کا واقعی امتیاز اس وقت تک نہیں کھلے گا تا وقتیکہ شریعت و طریقت کو شیر و شکر کرنے کے لئے آپ کی بے پناہ کوششیں سامنے نہ ہوں جہالت کی آندھیاں جب تیز رفتار ہو کر چلیں تو شریعت و طریقت میں ٹھنا ٹھنی کرادی گئی حالانکہ ان میں اک قلب ہے اور ایک قالب اک روح ہے اور دوسرا کالبد جھگڑا شروع ہوا تو مہاجر مکی علیہ الرحمہ نے کسی خاص سلسلے میں بیعت لینے کے بجائے سلاسل اربعہ میں بیک وقت بیعت کی بنیاد ڈالی مگر یہ تدبیر تریاق اسی وقت ثابت ہوئی جب مجدد تھانوی نے جسم و روح کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو استوار کیا اور یہ مسافت اس کامیابی سے طے کی کہ حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ اکبر کو ایک منزل پر لا کھڑا کیا اور یہی کیا آپ نے تو بانی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے اس بدگمانی کو بھی ختم کیا جو اس غریب سے مذہبی حلقوں میں چلی آتی تھی۔

اک مجدد کی نظر سے اس سیاسی اتھل پتھل کا عجیب منظر کیسے اوجھل رہتا جو ملت کو اس کے واقعی مقام تک پہونچانے کے لئے عالم ارواح سے بے قرار روح لے

کر چلا تھا اس گوشے میں بھی آپ نے مومنانہ فراست کے قندیل روشن کئے آپ کا سیاسی ذوق معلوم ہے اور جس جانب آپ کی دلچسپیاں تھیں وہ بھی متعارف ہیں مجھ سے مختصر اتنا سن لیجئے کہ آپ کے مجاز مولانا عبدالباری لکھنوی کی "جامع المجددین" اور تجدید تصوف وسلوک" نامی کتب جب ایک انشاء پرداز کے پاس تبصرے کے لئے پہونچیں تو ان صاحب نے بجائے تصنیف و مصنف کے امام تھانوی کو قلم کی زد پر لے لیا اور کئی قسطوں میں صرف حضرت کی شخصیت کو ہدف بنائے رکھا اور جب ان زہریلے خیالات سے رجوع کی توفیق ہوئی تو اس کا اعتراف کیا کہ موجودہ حالات نے سیاسی معاملات میں حضرت کی فکری اصابت کو تو تسلیم کرا لیا بہر حال بارہ سو کے قریب تصانیف کا یہ مصنف، لاکھوں مستفیدین کا یہ معلم، ہزاروں مسترشدین کا یہ مربی، اپنے اوصاف جلیل ممیزات خصوصی کے اعتبار سے جب کسی خانے میں فٹ کرنے کے لئے جانچا جائے گا تو اہل نظر خانۂ تجدید ہی میں اس بوقلموں شخصیت کو فٹ کر سکیں گے خاتمے پر اپنی کوتاہ علمی کا اعتراف خود کرتا ہوں اور اس ہیچ پوچ تحریر کے پڑھنے میں آپ کے ضیاع وقت کے لئے معذرت طلب ہوں۔

وانا الاحقر الاواہ

محمد انظر شاہ الکشمیری

خادم التدریس بدار العلوم وقف جامع مسجد

دیوبند

مقالہ نمبر ۱۲

حکیم الامت حضرت تھانوی

کی

شخصیت تجدیدی اور اصلاحی جامعیت

کی

بے مثال مرصع تھی

حضرت مولانا محمد اسحق صاحب سندیلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا عبد الباری صاحب کی تین کتابوں (جامع المجددین، تجدید تصوّف وسلوک اور تجدید تعلیم و تبلیغ) کا اجمالی تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"آفتاب آمد دلیل آفتاب" مشہور مصرعہ ہے، اور اس کی صداقت میں کسے کلام ہو سکتا ہے، دنیا کا کون شخص ہے جو آفتاب سے واقف نہیں، لیکن دنیا کے کتنے آدمی ایسے ہیں جو اس کی جسامت، اس کے مدارات طلوع وغروب کے طریقوں اور اس کی شعاعوں کی حقیقت و خاصیت سے واقف ہوں، یہ روشن ستارہ اس قدر متعارف ہونے پر بھی تعارف چاہتا ہے۔

بعض انسانی شخصیتیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جو اپنی عظمت اور بلند پائیگی کی وجہ سے معروف و مشہور ہونے پر بھی صحیح معنوں میں متعارف نہیں ہوتیں اور اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ان کا تعارف کرائے۔

حضرت حکیم الامت، مجدد الملت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی بلند و برتر شخصیت بھی اسی قسم کی تھی، شہرت عرب وعجم میں پھیلی ہوئی مگر صحیح معنیٰ میں پہچاننے والے بہت کم، دیکھنے والی آنکھیں لاکھوں، مگر پہچانتے والی خال خال، حکیمانہ باتیں سننے والے بہت مگر سمجھنے والے شاذو

---

[۱] رسالہ "دار العلوم" (دیوبند) بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ

نادر۔

حکیم الامت کیا تھے؟ کیا چاہتے تھے؟ ان کی دعوت کیا تھی؟ اُمت کی نبض دیکھ کر انہوں نے کن کن امراض کو پہچانا تھا؟ اور ان کا کیا کیا علاج تجویز کیا تھا؟ ان کا مخصوص طریق علاج کیا تھا؟ ان لوگوں کو جانے دیجئے جنہوں نے حضرت کو دُور سے دیکھا تھا۔ قریب سے دیکھنے والوں میں سے کتنے ہیں جو اُن سوالات کا جواب دے سکیں۔

اس آفتاب ہدایت کا تعارف ضروری تھا، اس ضرورت کو حضرت رحمہ اللہ کے خلیفہ و مُجاز بیعت حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے زیر نظر کتابیں (جامع المجددین[1]، تجدید تصوف[2] و سلوک اور تجدید تعلیم و تبلیغ[3]) لکھ کر پورا کیا ہے۔

حضرت مرشدی حکیم الامت رحمۃ اللہ کی سب سے بڑی اور اس زمانہ میں بے نظیر خصوصیت علمی جامعیت سے یہاں بحث نہیں، اگرچہ وہ بھی اپنی جگہ بہت بڑا کمال ہے اور حضرت نور اللہ مرقدہٗ اس کمال میں درجۂ کمال پر فائز تھے اور علوم دینیہ کا جیسا صحیح اور اعلیٰ امتزاج حضرت اقدس میں پایا جاتا تھا اس کی نظیر ممکن ہے کہ موجود ہو مگر دیکھنے میں نہیں آئی، یہاں اس جامعیت کا بیان مقصود نہیں ہے۔ اظہار کرنا اس تجدیدی اور اصلاحی جامعیت کا ہے جس کی مثال صدیوں میں بھی بمشکل مل سکتی ہے یعنی دین کے ہر شعبہ کی اصلاح و تجدید اور مومن کی پوری زندگی کو افراط و تفریط کے کانٹوں سے نکال کر صراطِ مستقیم کے راستہ پر ڈال دینے کی کوشش کا۔

"جامع المجددین" حضرت اقدس رحمۃ اللہ کی اسی شانِ تجدید کی تشریح ہے، اس آئینہ میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ مختلف صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ دیکھنے والا کبھی ایک مربی ربانی کو دیکھے گا جو کبھی انذار اور کبھی تبشیر کے ذریعہ لوگوں کو "بشیر و نذیر" صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ کبھی وہ ایک فقیہ بے عدیل کو فقہی موشگافیاں کرتا ہوا پائے گا، کبھی اسے کوئی متبحر عالمِ ربانی نظر آئے گا جو قرآن و حدیث کے بحرِ ذخار سے قیمتی اور نادر موتی نکال نکال کر خدا شناسوں کے سامنے ڈھیر کر رہا ہے، کبھی اسے ایک حاذق طبیبِ روحانی دکھائی دے گا جس کی انگلیاں امت کی نبض پر ہیں اور زبان نسخہ لکھوانے میں مصروف، کبھی وہ ایک درویش خانقاہ نشیں کی زیارت کرے گا جو تزکیۂ نفوس اور تربیتِ روحانی کے راستہ سے بندوں کو اللہ سے ملا رہا ہے، اور اپنے مزکّیٰ و مطہر قلب سے محبتِ ایمانی اور عرفانِ الٰہی کے انوار و برکات تقسیم کر رہا ہے۔

غرض اس کتاب کے آئینہ میں اس برگزیدہ ہستی کی زیارت کی جا سکتی ہے جو اپنی خصوصیات اور جامعیتِ کمالات کے لحاظ سے حیرت انگیز، صدیوں میں بے نظیر اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔

(جامع المجددین) کے یہ ۵۴۰ عنوانات انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہیں اور ان کے مطالعہ سے عقائد، اخلاق، عبادت، معاشرت، معاملات، دین کے ہر شعبہ کے متعلق حضرت حکیم الامتؒ کا اصلاحی نقطۂ نظر اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے اور یہ حقیقت بالکل الم نشرح ہو جاتی ہے کہ اسلام کس قسم کی زندگی کا مطالبہ

کرتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ:-

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ہ

اے ایمان والو! اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

کے کیا معنی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس امت کو "امتِ وسط" کے لقب سے ملقب فرمایا ہے۔ اس لئے عدل و "اعتدال" اور دین کے ہر شعبہ کو اسی کے درجہ پر رکھ کر ایک متوازن اور عادلانہ نظامِ زندگی کی تعمیرِ مسلم کا "مزاجِ اسلامی" ہے جس کے فساد کے بعد مسلم کی صحتِ روحانی کا درست رہنا ناممکن ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ صدیوں سے مسلم کا یہ مزاج فاسد ہو چکا ہے اور افراط و تفریط کا ہر طرف دور دورہ ہے۔ اس فقدانِ عدل و اعتدال کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ہستی بھی پیدا کی تھی جو اس عدل کا مجسمہ اور عملی نمونہ تھی۔ یہ ہستی حضرت مرشدی حکیم الامت رحمہ اللہ کی تھی۔ "عدل و اعتدال" حضرت رحمہ اللہ کی ایک خاص امتیازی شان تھی۔ جو عملاً بھی ظاہر ہوتی تھی اور تعلیم و ارشاد میں بھی نمایاں رہتی تھی۔ حضرت رحمہ اللہ کی یہ صفت متعدی تھی یعنی ہزاروں فاسد المزاج اور افراط و تفریط کے مرض میں مبتلا اشخاص کو حضرت کے فیوض و تربیت سے صحت حاصل ہوئی اور معتدل و متوازن زندگی اور صحیح اسلامی مزاج کی نعمتِ بے بہا نصیب ہوئی۔

اعلیٰ درجہ کے اتباعِ سنت اور اخلاص کامل کا یہ اثر تھا کہ حق تعالیٰ نے حضرت کی صفت افادہ و فیضان میں عجیب غیر معمولی قوت و برکت عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ یہ نعمت عدل و اعتدال جس طرح حضرتؒ کی صحبت میں تقسیم ہوتی تھی، اسی طرح

حضرتؒ کی تصنیفات و تالیفات سے بھی حاصل ہوتی تھی، "جامع المجددین" اس عام حقیقت کا ایک نمونہ ہے جس میں حضرت رحمۃ اللہ کی یہ خصوصیت واضح طریقہ سے دیکھی جا سکتی ہے اور نہ صرف دیکھی جا سکتی ہے بلکہ اگر اصلاح کی نیت سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو بہت آسانی کے ساتھ اس خصوصیت کو اپنے اندر جذب کیا جا سکتا ہے اور اس آفتاب ہدایت کے انوار سے آج بھی اپنی روح کو منور کیا جا سکتا ہے جو عالمِ حواس سے غروب ہو چکا ہے۔ لیکن تالیفات و تصنیفات کے افق سے آج بھی ضیا باری کر رہا ہے۔

یوں تو دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کا احیا حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے نہ کیا ہو اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کی اصلاح کی کوشش حضرتؒ نے نہ کی ہو۔ لیکن دین کے چند شعبے ایسے ہیں جن کی طرف حضرتؒ کی خصوصی توجہ مبذول رہی ہے اور ان میں حضرت ممدوح نے بہت دُور رس تجدیدات فرمائی ہیں۔ یہ شعبے معاشرت، اخلاق، معاملات اور احسان ہیں۔

(۲) "تجدید تصوّف و سلوک"، اسی شعبۂ احسان کا بیان ہے۔ اور اس کتاب میں مولانا مدظلہ نے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے تجدیدی اور مجتہدانہ افکار و تعلیمات و ہدایات کو مناسب عنوانات کے ماتحت اپنے تعارفی بیانات کے ساتھ جمع فرمایا ہے............ فنِ تصوّف و سلوک کے متعلق جتنی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب کو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے ھَبَاءً مَّنْثُوْرًا بنا دیا ہے اور تصوّف کی حقیقت و ضرورت۔ نیز اس کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا روزِ روشن سے زیادہ واضح کر دیا ہے۔ تاہم ایسے خوش فہم بھی موجود ہیں۔

جو کتاب پڑھنے کی زحمت گوارا کرنے سے پہلے ہی فیصلہ فرمادیتے ہیں کہ تصوف بدعت ہے کیونکہ یہ فن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نہیں تھا۔ یہ غلطی "احداث فی الدین" اور "احداث للدین" کے فرق کو نظر انداز کردینے کا نتیجہ ہے۔ تصوف اتباعِ احکام اور تحصیلِ احسان کی تدابیر کا نام ہے نہ کہ خود احکام کا۔ احکام شرعیہ کا اپنی طرف سے ایجاد کرنا بدعت ہے۔ تدابیر کی ایجاد ہرگز بدعت نہیں ہے۔ ان کا کتاب و سنت میں مذکور ہونا بھی ہرگز ضروری نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ یہ تدابیر احکام شرعیہ کے خلاف نہ ہوں اور اس کے عدم جواز کی کوئی دلیل موجود نہ ہو، اسی تعلیم کے لئے مدارس کا قیام، اشاعتِ دین کے لئے اخبارات و رسائل کا اجرا، پریس، ریڈیو، ٹیلی فون، مائکروفون وغیرہ سے کام لینا ہے۔ کیا یہ سب چیزیں "خیر القرون" میں موجود تھیں؟ کیا یہ سب بدعات ہیں؟ اگر یہ تدابیر بدعات نہیں ہیں تو تصوف کیوں بدعت ہے؟ ایسے خوش فہم معترضین سے تو بطورِ لطیفہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت آپ خود مجسم بدعت ہیں اس لئے کہ آپ بھی "خیر القرون" میں موجود نہ تھے۔ یہ جواب تو علی سبیل التنزل تھا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ صوفیاءِ محققین نے جو تدبیریں تکمیلِ طاعت کے لئے اختیار کی ہیں وہ اکثر و بیشتر (بلکہ قریب قریب سب کی سب) کتاب و سنّت سے ماخوذ ہیں۔ خود حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے کئی ہزار تصوف کے مسائل کو کتاب و سنّت ہی سے اخذ فرماکر قلم بند فرمایا ہے۔ رہے صوفیاءِ غیر محققین ان کے احوال و اعمال کو سند بناکر فن پر اعتراض کرنا خالص مجادلہ ہے۔

(۳) "تجدید تصوف و سلوک" حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ کے تجدیدی اور مجتہدانہ افکار و تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد اس فن کے متعلق وہ پیچیدہ گتھیاں آن کی آن میں کھل جاتی ہیں۔ جو صدیوں سے پڑی ہوئی تھیں۔ اور سالکین کے لئے سخت پریشانی و ہمت شکنی کا باعث بنی ہوئی تھیں، اور اللہ تعالیٰ کا راستہ اس قدر صاف اور سہل و آسان نظر آتا ہے کہ کمزور سے کمزور آدمی اس پر چلنے کی ہمت کر سکتا ہے۔

(۴) "تعلیم و تبلیغ" بھی دین کے اہم شعبے ہیں اور ان میں امت عرصۂ دراز سے سخت اور مہلک غلطیوں میں مبتلا رہی ہے۔ حکیم الامت کی نظر سے امت کا یہ مرض بھی مخفی نہیں رہا۔ انہوں نے اس کے اسباب و علامات معلوم کر کے کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا علاج بھی تجویز ہی نہیں فرمایا بلکہ عملاً کر کے بھی دکھا دیا۔ کتاب "تجدید تعلیم و تبلیغ" اسی شعبۂ زندگی کے متعلق حضرت حکیم الامت کی تجدیدات و اصلاحات کا عطر ہے۔ یہ ان والدین کی بھی رہنمائی کرتی ہے، جو اپنی اولاد کی فلاح چاہتے ہیں، اس اولاد کے لئے شفیق و مربی ہے جو تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اہل مدارس کے لئے خضر راہ ہے اور مبلغین و واعظین کے لئے رہبر طریق۔

حضرت[1] والا کے اساتذہ حضرت والاؒ کی ذہانت و ذکاوت کی ہمیشہ تعریف فرمایا کرتے تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے بھی حضرت والاؒ اپنے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ اس وقت بھی حاضر جوابی، طلاقت لسانی، ذہانت و فطانت اور منطق میں کمال مہارت کا یہ عالم تھا کہ دیوبند میں جب کوئی مذہب والا مناظرہ کی

---

[1] اشرف السوانح جلد اول ص ۲۸ تا ۳۱

غرض سے آتا تو حضرت والاؒ فوراً پہنچ جاتے اور اس کو مغلوب کر دیتے، عیسائیوں، آریوں، شیعوں، غیر مقلدوں، سب ہی سے طالب علمی کے زمانہ میں مناظرہ فرمایا تھا۔

مقالہ نمبر ۱۳
حکیم الامت
حضرت تھانویؒ
کی
دینی خدمات
جناب مولانا محمد نعیم صاحب — دیوبندی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی دینی خدمات

حضرت شیخ الہندؒ کے بعد دار العلوم کی سرپرستی کا یہ "منصب جلیل" حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو تفویض کیا گیا، حضرت مولانا کا علم و فضل، ضبط و نظم، طہارت و تقویٰ، ضرب المثل اور شہرۂ آفاق رہا ہے جس کی وجہ سے دار العلوم کو "دن دونی، رات چوگنی،، ترقی ہوتی رہی۔ زمانہ طالب علمی کے علاوہ مستقلاً کبھی حضرت کا قیام دیوبند نہیں رہا۔ بلکہ حضرت گنگوہیؒ کی طرح مقیم تو وطن میں رہے البتہ ظاہری و باطنی توجہات و تصرفات سے تربیت فرماتے رہے، ہنگامی اور وقتی ضرورتوں کے پیش نظر آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ لیکن امراض جسمانی کی وجہ سے جب عام اسفار کا سلسلہ بند ہوگیا تو بتدریج اس کو بھی موقوف کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ آخر عمر میں معذور ہونے کے باوجود دیوبند آنے کی آرزو برابر زندہ رہی، مگر قدرتی مجبوری کے باعث یہ آرزو پوری نہ ہوسکی، ہنگامی یا اہم ضرورت کے پیش نظر ارباب شوریٰ خود حضرت مولانا کے مستقر پر حاضر ہوکر قیمتی آراء حاصل کرلیا کرتے تھے۔ ورنہ عام حالات میں صرف حضرت کی منظوری کافی سمجھی جاتی تھی۔

دار العلوم پر، زمانہ کے حوادث و مصائب کی گوناگوں یورش ہوئی مگر الحمدللہ مولانا کی استقامۃ اور توجہات کی بدولت دار العلوم کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ اور

علم وعرفان کا یہ جہاز طوفانِ حوادث میں کامیابی کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔

دارالعلوم کی داغ بیل پڑنے سے تقریبًا ۳ رسال قبل یعنی ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ بروز چہار شنبہ بوقت صبح یہ آفتاب علم وہدایت طلوع ہو چکا تھا، گویا دنیا میں مولانا کی آمد ایک عظیم الشان "باب العلم" کھلنے کی تمہید تھی، ولادت کا مادہ تاریخ بھی ۱۲۸۰ھ کرم عظیم ہے، مولانا کی حیات طیبہ اور فیوضات علمیہ کی فراوانی پر اگر نظر کی جائے تو واقعی یہ ولادت کرم عظیم ہی ثابت ہوئی ویسے بھی یہ ولادت ایک کرامت عظیمہ کا نتیجہ تھی جس کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا سے پہلے آپ کے والد ماجد کے کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ رہتی تھی حتیٰ کہ پانی پت کے ایک بزرگ حضرت غلام مرتضیٰ صاحب تشریف لائے تو آپ کی نانی صاحبہ نے عرض کیا کہ حضرت میری لڑکی کے نرینہ اولاد زندہ نہیں رہتی" فرمایا کہ "عمرؓ اور علیؓ" کی کشاکش میں زندہ نہیں رہتے" یہ مجذوبانہ چیستاں اس وقت تو کسی کی سمجھ میں نہ آئی لیکن بعد میں حضرت کی والدہ نے کہا کہ شاہ صاحب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک لڑکوں کے نام ددھیالی ناموں پر جو فاروقی النسل ہیں رکھے جاتے رہے ہیں لیکن اس کے بعد ننہیالی ناموں پر جو علوی ہیں نام رکھنا چاہیئے" شاہ صاحب یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ لڑکی عقلمند معلوم ہوتی ہے، میرا مقصد یہی تھا، اور فرمایا کہ دیکھو دو لڑکے ہوں گے، ایک کا نام "اشرف علی خاں" اور دوسرے کا "اکبر علی خاں" رکھنا " بڑا لڑکا میرا ہوگا جو مولوی اور حافظ ہوگا، اور دوسرا دنیا دار رہے گا" ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

کون کہہ سکتا ہے کہ مجذوب صاحب کی یہ صاف پیشگوئی حرف بحرف پوری نہیں ہوئی، نام کے ساتھ لفظ "خان" یا تو جوش جست میں اتفاقیہ اضافہ فرما دیا ہوگا، اور یا شاید مولانا کے فاروقی مزاج کی حدت کی طرف اشارہ ہو، بہر حال اگرچہ دادھیال نام آپ کا عبد الغنی تھا لیکن مشہور وہی نانہالی نام اشرف علی ہوا۔

زمانہ طالب علمی میں آپ کے نام کا سجع آپ کے مشفق استاد حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دار العلوم نے تجویز فرمایا تھا۔

"از گروہِ اولیاء اشرف، علی"

جو بالآخر مقبول اور آپ کے لیے فال نیک ثابت ہوا۔ اور منجانب اللہ لوگوں کے قلوب میں "حکیم الامۃ" جیسے وقیع خطاب کے القاء کا باعث بنا۔

پانچ سال کی عمر میں والدہ کی آغوش شفقت و محبت چھن جانے سے ایک سنت اضطراری کی ادائیگی کا شرف حاصل ہوا لیکن والد ماجد کے خصوصی التفات و عنایات نے اس کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔ شاید شفیق باپ کو "ہونہار بیٹے کی ذکاوت و ذہانت کا صحیح اندازہ ہو گیا ہو۔

مولانا کی تعلیم کا دور قرآن کریم سے شروع ہوتا ہے۔ حسین علی دہلوی اور آخون جی نے حفظ قرآن کا مرحلہ طے کرایا، فارسی کی ابتدائی کتابیں مختلف اساتذہ سے، اور متوسطات اور عربی کی ابتدائی کتب حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے اور انتہائی کتابیں اپنے ماموں اور فارسی کے ماہر استاد واجد علی صاحب سے پڑھیں، بعد میں دیوبند آ کر مولانا منفعت علی صاحب سے تکمیل فرمائی۔ جس

کی وجہ سے فارسی پر آپ کو اس قدر عبور اور مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ بے تکلف فارسی میں گفتگو فرماتے تھے۔ تحصیل علم کے بعد اٹھارہ انیس سال کی عمر میں ایک فارسی مثنوی زیر و بم کے نام سے تصنیف فرمائی۔

عربی درسیات کی تکمیل کے لیے مولانا آخر ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں داخل دارالعلوم ہوئے۔ غالباً اسی سال بانی دارالعلوم حضرت نانوتوی نے دوبارہ سفر حج فرمایا۔ اس وقت دارالعلوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر مدرس، حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس دوم، حضرت مولانا ملا محمود صاحب دیوبندی مدرس سوم، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی مدرس چہارم، ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

مولانا ابتدا ہی سے ذہین اور ذکی اس بلا کے تھے کہ معقولات میں صدرا، شمس بازغہ جیسی مشکل اور ادق کتابیں حافظ کی طرح پڑھتے چلے جاتے تھے، زمانہ طالب علمی میں ہر قسم کے غیر علمی مشاغل سے بے توجہ ہو کر ہمہ تن کتب بینی میں مصروف رہتے یا اپنے شفیق استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل کرتے، گاہ گاہ حضرت مولانا نانوتویؒ کے درس جلالین میں بھی شرکت فرما لیتے، افتاء کا کام حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں رہ کر سیکھا ہے غرض کہ مولانا اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی "اشرف الطلبہ" بن کر رہے۔

اسی زمانہ میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب اول مہتمم دارالعلوم کے حلقہ ذکر و توجہ میں بھی شریک رہے ہیں۔ جس کی کیفیت خود ہی بیان فرمایا کرتے کہ ایسا

معلوم ہوتا تھا۔ کہ "میں نورانی فرشتہ ہو گیا ہوں" ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب کی ہمراہ حضرت مجدد صاحب کے مزار پر حاضری کے لیے سرہند تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں سائیں توکل شاہ صاحب مشہور بزرگ سے ملاقات ہو گئی اور ان سے بہت کچھ دعائیں حاصل کیں، سائیں صاحب نے فرمایا کہ ذکر اللہ میری زبان سے اس طرح میٹھی ہو جاتی ہے جیسے مٹھائی سے۔"

آپ کی صلاحیتوں اور سعادتوں کو دیکھ کر حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کو آپ سے اس قدر انس پیدا ہو گیا تھا کہ مولانا سے امامت کراتے اور خود پیچھے اقتدا فرماتے لیکن کچھ دنوں کے بعد گھبرا کر مولانا نے معذرت پیش کی۔ اور مدرسہ کے قریب چھتہ کی مسجد میں نماز پڑھنی شروع کر دی، عموماً یہاں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب یا حضرت حاجی عابد حسین صاحب مہتمم دارالعلوم نماز پڑھایا کرتے تھے، لیکن مولانا کو دیکھ کر اب دونوں حضرات انہی سے نماز پڑھوانے لگے، جس بار سے بچ کر یہاں آئے تھے وہی پھر اٹھانا پڑ گیا، یہاں میاں شہاب الدین ولایتی اور میاں بڈھن شاہ مشہور مجذوبوں سے ملاقات ہوئی ہے۔ فن قرأۃ و تجوید آپ نے حضرت قاری عبداللہ مکی سے حاصل کیا ہے مادۂ اخذ مولانا میں اس قدر موجود تھا کہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں پڑھتے وقت بسا اوقات دیکھنے والوں کو استاذ شاگرد میں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

طب کی تکمیل ماہر فن عالی جناب حکیم عبدالمجید خاں صاحب عرف حکیم بھورے خاں سے فرمائی۔ لیکن حکیم صاحب بھی مولانا کے اس قدر گرویدہ اور معتقد ہو گئے تھے، کہ باوجود استاد اور ہر اعتبار سے باوجاہت ہونے کے آخر

عمر میں حضرت کی زیارت کے لیے خود تھانہ بھون حاضری کی تمنا کی، جس کا علم اُن کی وفات کے بعد مولانا کو ہوا تو بڑے حسرت اور قلق کا اظہار فرمایا۔ زمانہ طالب علمی میں مولانا نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ ایک بزرگ اور ایک حاکم نے دو مختلف تحریروں پر مجھے یہ عبارت لکھ کر دی کہ "ہم نے تم کو عزت دی" جن میں سے پہلے پرچہ پر "محمد رسول اللہ" کے نام کی مہریں چاروں طرف ثبت تھیں لیکن دوسرے پرچہ کی مہریں صاف طور پر نہیں پڑھی جاتی تھیں۔

دوسرا خواب یہ دیکھا کہ ایک چشمہ جس میں چاندی کے فوارے ابل رہے ہیں میرے پیچھے چلا آرہا ہے" ان دونوں خوابوں کی تعبیر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ فرمائی کہ "تم کو دین و دنیا کی عزت ملے گی، اور دنیا تمہارے پیچھے چلے گی مگر تم اس کی طرف رُخ بھی نہ کرو گے" دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کہنے والے کی بات کا ایک ایک حرف کس طرح پورا ہوا اور صحیح نکلا۔

۱۲۹۹ھ میں جب کہ حضرت گنگوہی اتفاقاً دیوبند تشریف لائے تو مولانا زیارت اور مصافحہ کے لیے آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ پاؤں پھسل گیا، فوراً حضرت نے بڑھ کر بازوؤں پر تھام لیا اور گرنے سے بچا لیا۔ چونکہ فال نیک تھی اس لیے موقعہ پاکر مولانا نے بیعت کی درخواست کر دی، کہ جس طرح حضرت نے اس وقت تھام لیا ہے ہمیشہ کے لیے اسی طرح دست گیری فرما رہیے — لیکن حضرت نے حسب معمول تعلیمی مشغلہ کی بناء پر نامناسب سمجھ کر انکار فرما دیا۔

اتفاقاً اسی سال حج کے لیے حضرت گنگوہی مکہ معظمہ جانے لگے تو مولانا نے عجب ظرافت یہ کی کہ دیوبند سے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے نام ایک

شکایتی عریضہ حضرت ہی کی معرفت اس مضمون کا بھیجا کر "یہ مجھے بیعت نہیں فرماتے" اعلیٰ حضرت حاجی صاحب نے غایت شفقت اور کمال صلاحیت کی بناء پر از خود غائبانہ "بیعت عثمانی" سے نواز کر اطلاع بخش دی۔

سنہ ۱۳۰۰ھ میں فراغت کے سال جب حضرت گنگوہی جلسہ دستار بندی کے لیے دیوبند تشریف لائے اور مولانا کو اپنی دستار بندی کی نسبت معلوم ہوا تو بغایت ادب اپنے مشفق استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے کہ حضرت ہماری دستار بندی مدرسہ اور اکابر کی بدنامی کا باعث ہوگی، ہم ہرگز اس قابل نہیں ہیں، اس لیے براہ کرم اس ارادہ کو منسوخ فرما دیا جائے؟ یہ سن کر ایک خاص جوش اور مسرت کے ساتھ حضرت مولانا نے فرمایا کہ تمہیں ایسا ہی سمجھنا چاہیئے، کیوں کہ اپنے باکمال اساتذہ کی موجودگی میں اپنی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی لیکن جب باہر جاؤ گے اس وقت تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی، جہاں جاؤ گے انشاء اللہ تم ہی تم ہوگے۔

اس سے جہاں مولانا کی انکساری، فروتنی، کمال تواضع معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی باکمال استاد کے الہامی اور کشفی جملوں کی صحت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

تحصیل علوم کے بعد ۱۳۰۱ھ میں جب وطن مراجعت ہوئی تو گنگوہ میں ایک باعزت گھرانہ کی خاتون سے عقد ہو گیا اور اسی سال پہلی مرتبہ جامع مسجد تھانہ بھون میں وعظ فرمایا۔ وعظ کیا تھا ایک نافہ مشک تھا، جو مہک اُٹھا۔ اور دماغوں کو معطر کرتا چلا گیا، پھر تو ایسی شہرۃ ہوئی کہ جہاں جاتے پہلے وعظ کے لیے فرمائش اور اصرار ہوتا، حتیٰ کہ بڑے بڑے اکابر کی موجودگی میں وعظ فرمایا

اور ان سے خراج تحسین وصول کیا، حضرت گنگوہی نے "حقانی وعظ" کہہ کر مہر تصدیق ثبت فرمائی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے "بیان میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی" فرماکر تصویب کی۔"

اسی سال کانپور میں حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی کی جگہ پر بمشاہرہ مبلغ ۳۰ صہ، سریر آرائے مسند تدریس ہوئے، پہلے ہی سال بڑے بڑے اسباق پڑھانے کے لیے ملے لیکن جی کھول کر ایسا پڑھایا کہ حق ادا کر دیا۔ اور مولانا جیسے جید عالم کی جگہ پُر کر دی، ورنہ کہاں ایک "نو فارغ" اور کہاں تجربہ کار شہرت یافتہ قدیم عالم مگر مولانا نے خدا داد قابلیت اور بشارات اکابر کے اثر سے اس خلا کو پورا فرما دیا۔

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب سے بیعت کا واقعہ تو بزمانہ طالب علمی پیش آچکا تھا۔ ادھر والد ماجد پہلے ہی سے حاجی صاحب سے منسلک ہو چکے تھے اس دوگونہ تعلق کی بناء پر خود حاجی صاحب نے اس عاشق نادیدہ سے ملاقات کی خواہش کی، چنانچہ والد ماجد کی ہمراہ بارادہ حج بیت اللہ حاضر خدمت ہوئے، راستہ کی مشکلات اور سمندری تلاطم کے باوجود خیر و خوبی سے منزل مقصود پر پہنچ گئے شیخ سے کیمیا اثر صحبتیں رہیں، بالمشافہ تجدید بیعت ہوئی، نوبت بایں جا رسید کہ "مطلوب" طالب، اور "طالب، مطلوب" بنا، اور شیخ کی طرف سے چھ ماہ قیام کے لیے اصرار ہوا۔ لیکن بعض مجبوریوں کی بناء پر مناسک حج کے بعد وطن واپسی ہو گئی۔ بالآخر ۱۳۰۵ھ میں والد ماجد رحلت فرما ہو گئے لیکن مولانا ہمہ تن وعظ و ارشاد، درس و تدریس میں مشغول رہے تا آنکہ ۱۳۰۷ھ یعنی سات سال کے بعد

ذکر و شغل، ریاضت و مجاہدات کی دوسری منزل کا آغاز ہوگیا۔

انہی اثنار میں دوبارہ پھر ۱۳۱۰ھ میں بارادہ حج چھ ماہ قیام کے ارادہ سے شیخ کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا، اور دیر تک باہم صحبتیں رہیں، سلوک کی منزلیں طے ہوئیں، حجابات خودی اٹھائے گئے۔ آداب بے خودی سکھائے گئے، اور خدا جانے کیا گنجینہ اس سینہ بے کینہ میں بھر دیا کہ وقت رخصت شیخ نے یہ "الہامی جملہ" ارشاد فرمایا کہ "کسی وقت کانپور سے اگر طبیعت بھر جائے تو بنام خدا تھانہ بھون آکر میری جگہ سنبھال لینا"، اس وقت تو شاید مولانا کو اس کا وہم بھی نہ ہو مگر بالآخر ہوا وہی جو حاجی صاحب نے کہا تھا "قلندر آنچہ گوید دیدہ گوید"

بعض اعزہ نے مولانا کے اولاد نہ ہونے کی بنار پر حاجی صاحب سے درخواست دعا کی تو فرمایا کہ "بھائی! جی تو یہ چاہتا ہے کہ جس طرح میں فارغ ہوں، اسی طرح یہ بھی رہیں" چنانچہ بہی خواہوں نے ہر چند اولاد کے لیے ممکنہ کوششیں کیں حتیٰ کہ مولانا کا عقد ثانی بھی کرایا، لیکن فرمودۂ شیخ ہی پورا ہوا۔

غرضیکہ حاجی صاحبؒ نے عشق و معرفت کی جو آگ لگائی تھی، قلب مبارک کی انگیٹھی میں وہ دہکتی رہی تا آنکہ ۱۳۱۵ھ میں واردات و جذبات، اور قلبی کیفیات و حالات کے سمندر میں اس قدر ہیجان و تلاطم پیدا ہوا کہ ۱۴ سالہ مشاغل درس و تدریس بالکلیہ ترک کر کے مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن ہو جانا پڑا۔

فرمودۂ شیخ کے پورا ہونے کا وقت چونکہ آچکا تھا اس لیے خانقاہ تھانہ بھون پہلے کی طرح پھر "دکان معرفت" بن گئی، اور ہزاروں تشنگانِ طریقت اس

"چشمہ زلال" سے سیراب ہونے لگے، سینکڑوں گم گشتگان بادیۂ ضلالت اس آفتاب رشد و ہدایت سے فیضیاب ہوئے۔

حکیم الامۃ نے اپنی خداداد مجددانہ صلاحیتوں اور تحقیقات کی بدولت، زنگ آلود قلوب کو صاف و شفاف کر کے راہ طریقت کو اس طرح بے غبار بنا دیا ہے کہ صدیوں کسی نئی روشنی یا تحقیق کی ضرورت نہیں رہی، سینکڑوں جوگیانہ رسوم اور راہبانہ و بدعانہ اختراعات کو الگ کر کے اصل حقیقۃ و طریقت کو آئینہ کی طرح صاف و شفاف بنا دیا۔

تصانیف:

حکیم الامۃ نہ صرف ایک متبحر اور بے نظیر عالم تھے بلکہ زبردست عالم گر بھی تھے، علماء کی جماعۃ میں وہ ایسے رہتے جیسے پروانوں میں شمع، اور سینکڑوں علماء اس مرکز علم کے گرد اس طرح جمع رہتے جیسے ماہتاب کے چاروں طرف ہالہ، ان کے علمی کارنامے نہ صرف اس حد تک ہیں کہ انہوں نے کسی علمی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا، اور ایک ابجد خواں سے لے کر باکمال عالم تک ان کے علمی احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، مرد، عورت، بچہ، جوان، جاہل عالم، مسلم، غیر مسلم کوئی بھی ان کی سینکڑوں سے متجاوز بے مثل تصانیف سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اپنی طرح انہوں نے دوسروں کو بھی بڑی بڑی خدمات پر لگا دیا۔

نشر و اشاعت کے اس دور میں حکیم الامۃ کا یہ امتیازی کارنامہ ہے کہ

ایک ہزار کے قریب تصانیف کہ جن کی صرف فہرست ہی سو صفحات پر مشتمل ہے آپ کے قلم حقیقت رقم سے نکلی ہیں، ہر علم و فن میں تصنیفات و تالیفات اس قدر فرمائیں کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، بعض تصانیف تو مولانا کی اس درجہ مقبول ہوئیں کہ درجنوں ان کے اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور اپنی مخصوص نوعیت کے لحاظ سے اردو مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ بعض کتابوں کے متعلق تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی خواندہ گھرانہ ایسا ہو جو ان کتابوں سے نا آشنا ہو، تاریخ بہت کمی کے ساتھ ایسے کامیاب مصنفین کی نشان دہی کرتی ہے جو اپنی حیات ہی میں تصانیف کے ذریعہ حیات جاوید حاصل کر چکے ہوں۔ لیکن مولانا اس نعمت سے بھی پوری طرح بہرہ اندوز ہوئے ہیں۔

اور اگر اُن علمی خدمات کو بھی شامل کر لیا جائے جو آپ کے خدام کے واسطہ در واسطہ سے منصۂ شہود پہ آئیں تو دنیائے علم کی پیشوائی آپ کے حصہ میں آسکتی ہے۔ درآنحالیکہ یہ سلسلہ ابھی منقطع نہیں ہوا۔ اور خدا جانے کہاں تک اور کب تک ان علمی احسانات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ پس اس اعتبار سے بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی لگائی ہوئی جو شاخیں بار آور ہوں گی وہ سب آپ ہی کا فیض ہوگا اور جب آپ کی یہ فیض رسانی جاری ہے تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپ علمی دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں بلکہ ایک تھانوی شمع سے سینکڑوں تھانوی اور غیر تھانوی شمعیں روشن ہو رہی ہیں۔" ان

ابراھیم کان امۃ "۔ حکیم الامۃ کے خلوص وللہیت، دینی حمیت ومحبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ کی آمدنی گرانقدر تصانیف کا تخمینہ چالیس لاکھ روپے تک پہنچتا ہے لیکن مولانا کی سیرچشمی، بے لوث فیاضی نے کسی کتاب کا حق طباعت بھی اپنے لیے محفوظ رکھنا پسند نہیں کیا بلکہ رفاہ عام کے کاموں کے لیے اپنی زندگی کی طرح ان کتابوں کو بھی وقف فرما دیا۔ آئیے حکیم الامۃ کی تالیفات پر سرسری نظر ڈالیں۔ اور اُن کا ہلکا سا جائزہ لے لیا جائے کہ جس سے اندازہ ہو سکے کہ دیوبند نے اس سلسلہ میں ملک وقوم کی کیا خدمت انجام دی۔

صرف علمی دنیا ہی میں نہیں بلکہ ضروریات زندگی میں شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس کو مجدد الملۃ نے تشنۂ تکمیل چھوڑا ہو۔ عربی، فارسی، اردو تین زبانوں میں آپ کی تصانیف موجود ہیں بلکہ بعض رسالے دوسرے زبانوں میں بھی ترجمہ کیے گئے ہیں۔ فراغ علم کے بعد سب سے پہلے آپ نے فارسی زبان میں زیر وبم کے نام سے ایک مثنوی تصنیف فرمائی، جس میں سوز وگداز کی پوری چاشنی موجود تھی اس کے بعد تو مواعظ وتصنیفات کا ایک طویل سلسلہ جاری ہوگیا لیکن بایں ہمہ مولانا کو تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف سے خصوصی شغف اور طبعی مناسبت رہی ہے اس لیے ہم علی الترتیب اسی ذیل میں مختصر تعارف کرانا مناسب سمجھتے ہیں۔

تفسیر:

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز قرآن کریم کا سلیس اور بامحاورہ اردو

ترجمہ ہے، جو قوسین کے مابین ضروری اور مفید مگر مختصر اضافوں پر مشتمل ہے۔

تفسیر بیان القرآن جس کو ڈھائی سال کی مدت میں تصنیف فرمایا نہایت مفید اور مقبول تفسیر ہے، جس میں صحیح روایات، فقہی اور کلامی مباحث ترکیب نحویہ کے ساتھ، عقلی شبہات وتوہمات کا قلع قمع کیا گیا ہے اور متصوفانہ نکات اور اپنے ذوقی لطائف کا پوری طرح التزام کیا گیا ہے یہ تفسیر نہ بہت زیادہ طویل ہے اور نہ بہت مختصر بلکہ اس کو چاہے مفصل ترجمہ کہہ لیجیے یا مجمل تفسیر" لیکن عام اردو تفاسیر کے برخلاف عوام سے زیادہ خواص اور علماء کے لیے جذب وکشش کا سامان بنی ہوئی ہے۔ اسی لیے مولانا کی یہ خدمت بے حد مقبول ہوئی۔ اصلاح ترجمہ دہلویہ اور اصلاح ترجمہ حیرت کے نام سے دو رسالے اردو میں ہیں جن میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب اور مرزا حیرت کی لغزشوں اور اغلاط ترجمہ پر متنبہ فرمایا۔ اسی طرح التقصیر فی التفسیر اور الھادی للحیران فی وادی تفصیل البیان میں بعض ابناء زمانہ کی تاویلات باردہ پر نقد وتبصرہ فرمایا گیا ہے۔

سبق الغایات فی نسق الآیات میں آیات کا باہمی ربط بیان فرمایا گیا ہے دلائل القرآن علی مسائل النعمان یہ کتاب احکام القرآن جصاص کے طریقہ پر حنفی مذہب کی رعایت کرتے ہوئے شروع کی گئی تھی، اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن اس میں قرآنی لطائف ونکات بیان کیے گئے ہیں۔ تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبادات میں مقطعات قرآنیہ پر کلام کیا گیا ہے۔ مسائل السلوک من کلام الملوک اور تائید الحقیقة

بالآیات لعتیقہ ان دونوں رسالوں میں مسائل سلوک قرآن وحدیث سے مستنبط کیے گئے ہیں عملیات کے سلسلہ میں بھی دو رسالے اعمال قرآنی اور خواص فرقانی تصنیف فرمائے ہیں۔ اسی کا ایک حصہ آثار تبیانی بھی ہے، علیٰ ھذا تجوید اور آداب قرآنی پر بھی مختلف رسائل تصنیف فرمائے مثلاً آداب القرآن، متشابہات القرآن لتراویح رمضان، یادگار حق القرآن، ذنابات فی الروایات تنشیط الطبع فی اجراء السبع، وجوہ المثانی، زیادات علیٰ کتب الروایات رفع الخلاف فی حکم الاوقاف، تجوید القرآن۔ جمال القرآن وغیرہ۔

حدیث :

حدیث نبویؐ سے مجدد الملۃ کو جو خصوصی شغف اور مناسبت رہی ہے اس کا اندازہ ان کے مواعظ اور عمومی تصانیف سے ہو سکتا ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ انھوں نے مخصوص طریق پر بھی کچھ تالیفات اس سلسلہ میں فرمائی ہیں چنانچہ ۱۳۲۷ھ میں حقیقۃ الطریقۃ کے نام سے اور التشرف کے چاروں حصص، بہت ہی اہم کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ زیادہ تر ان میں تصوف کے اذکار و اشغال، اور اعمال و احوال پر محدثانہ رنگ میں کلام فرمایا ہے، اہل علم کے مطالعہ کے لیے بہت ہی خصوصی اور قابل قدر چیزیں ہیں، غالی اہل حدیث کے رد میں ایک کتاب جامع الآثار تصنیف فرمائی ہے، دراصل یہ کتاب احیاء السنن کا نقش ثانی ہے، احیاء السنن میں ابواب کی ترتیب فقہی طرز پر رکھی گئی تھی لیکن افسوس کہ اس کا مسودہ ضائع ہو گیا۔ ازاں بعد ایک جدید

اسلوب پر جامع الآثار کو مرتب فرمایا، جو صرف کتاب الصلوٰۃ تک پہنچ سکی، بعد میں اسی کا ضمیمہ تابع الآثار لکھا گیا، ۱۳۳۱ھ میں پھر حضرت کو خیال ہوا، اور دوبارہ احیاء السنن کے احیاء کا کام علماء کی جماعت کے سپرد فرمایا گیا جو کتاب الحج تک پہنچ سکا، لیکن بعض وجوہ کی بناء پر مولانا کا خیال اس پر استدراکات لکھنے کا ہوا چنانچہ اس کے لیے مولانا ظفر احمد تھانوی کو منتخب کیا گیا، موصوف نے احیاء السنن پر نظر ثانی کر کے الاستدراک الحسن کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اور احیاء السنن کو اعلاء السنن کا جامہ پہنا کر کام شروع کر دیا گیا، جس کی ایک درجن جلدیں شائع ہو چکی ہیں، عیدین اور جمعہ کے لیے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے خطبات کا ذخیرہ جمع کیا۔ اور آیات و احادیث و آثار سے ترغیب و ترہیب کے مضامین پر مشتمل الخطب الماثورۃ من آثار المشہورۃ اور خطبات الاحکام دو رسالے تصنیف فرمائے، اسی طرح اوراد و وظائف کے سلسلہ میں حصن حصین اور حزب اعظم وغیرہ کتابوں سے التقاط و تلخیص کر کے مناجات مقبول تصنیف فرمائی جو بے حد مقبول ہوئی۔

فقہ:

حکیم الامۃ کو فقہ میں جس قدر تبحر اور ملکہ حاصل تھا، اور اپنے باکمال اساتذہ سے جو ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تقریباً ۶۰ سال اس فن کی خدمت کی، اس سلسلہ میں ہزاروں ہی استفتاء آپ

کے زیرِ قلم آتے ہوں گے، چنانچہ امداد الفتاوی اور تتمہ امداد الفتاوی کی ضخیم جلدیں اس پر شاہد ہیں، بہشتی زیور اور بہشتی گوہر جیسی بے نظیر اور مقبول عام کتابیں کہ جن سے ہندوستان کا شاید ہی کوئی لکھا پڑھا گھرانہ خالی ہو مصنف کے کمال پر دلالت کرتی ہیں۔ اگرچہ ایک زمانہ ان پر ایسا بھی گزر چکا ہے کہ ان کو جلایا گیا، پھاڑا گیا، اور نہایت تذلیل وتحقیر کی گئی، بلکہ مصنف کی تکفیر تک سے دریغ نہیں کیا گیا، لیکن آج عوام تو عوام، پڑھے لکھے اہل علم کو بھی اس کتاب سے استغناء نہیں ہے، اول الذکر میں زیادہ تر عورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور موخر الذکر میں مردوں کے مخصوص مسائل کو پیش نظر رکھا گیا ہے حوادث الفتاوی میں مسائل جدیدہ پر کلام فرمایا گیا ہے، فتاوی اشرفیہ تین حصوں میں شائع ہو چکی، ترجیح الراجح کے نام سے حضرت نے ایک سلسلہ قائم فرمایا تھا جس میں متقدمین کی سنت قدیمہ پر از خود یا کسی دوسرے کے متنبہ سے بعض مسائل میں اپنی سابقہ تحقیق یا خیال سے رجوع فرما کر اپنی حق پسندی، بے نفسی اور انصاف کا ثبوت دیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے رسائل وقتی مسائل پر بھی ارقام فرماتے مثلاً ریڈیو، تار، فلم، بنک، سینما، سود وغیرہ کے سلسلہ میں، جن کو قبولیت عام حاصل ہوئی۔

کلام :

جدید تقاضوں اور نئے مسائل کو سامنے رکھ کر اس فن میں بھی مولانا نے متعدد تصانیف فرمائی ہیں جن میں دینی احکام کے مصالح وحکم پر کلام فرماتے ہوئے

عقلی شبہات اور تعلیم یافتہ لوگوں کے خلجانات اور عام وسوسوں اور خدشوں کے تسلی بخش جوابات ارقام فرمائے ہیں مثلاً اشرف الجواب، المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ الانتباھات المفیدہ عن الشبہات الجدیدہ اس سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں المضمون الحمیدہ کا ترجمہ اسلام اور سائنس کے نام سے کرایا۔

تصوّف :

فن تصوّف میں تو مولانا مجدد اور امام کا درجہ رکھتے ہیں، صدیوں کے بعد اس فن کو قرآن وحدیث کی روشنی میں ایسا زندہ کیا کہ اب ان شاء اللہ صدیوں دوکاندار فقیروں اور پیشہ ور صوفیوں کے بس میں نہیں آئے گا، تصوف کے اسرار و رموز شریعت حقہ کی روشنی میں بیان کرکے اس راہ کو بے غبار اور اس وادی کو بے خطر بنا دیا، مغز علیحدہ کر دیا۔ اور چھلکا الگ پھینک دیا، جاہل صوفی، اور خشک ملا کی نوک جھونک پر ہمیشہ کے لیے خط تنسیخ کھینچ کر دونوں کو ہم آغوش کر دیا، شریعت، طریقت، حقیقت و معرفت کے دھاروں کو باہم ملا دیا۔

اس سلسلہ کی پہلی کڑی قصد السبیل ہے۔ مسائل السلوک، تائید الحقیقۃ، التشرف، حقیقۃ الطریقۃ کا تذکرہ پہلے آچکا ہے جن میں براہ راست قرآن وحدیث سے مسائل سلوک کو مستنبط کیا گیا ہے، ایک نہایت جامع کتاب التکشف بمہمات التصوف تالیف فرمائی جس میں بڑے تدقیق

وتحقیق سے کام لیا گیا ہے مثنوی معنوی سے جو خصوصی ذوق مولانا کو حاصل تھا وہ ان کے عام مواعظ سے ظاہر ہے، اس فن میں یہ کتاب جس درجہ اہم اور وقیع سمجھی جاتی ہے وہ "ہست قرآن در زبان پہلوی" کے مخصوص تمغہ سے ظاہر ہے، اس لیے مولانا جیسے محقق کا اس پر قلم نہ اٹھنا عجائبات میں سے ہوتا، چنانچہ اپنی طبعی مناسبت کمال قابلیت، حضرت حاجی صاحب کی مخصوص توجہات کی بدولت حکیم الامت نے کلید مثنوی لکھ کر اس خزانہ کی کنجی بھی سب کے ہاتھ میں دے دی، علی ہذا تدبیۃ السالک ۱۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی اہل سلوک کے لیے مشکل ترین گھاٹیوں میں اور تاریک ترین وادیوں میں مشعل راہ بن رہی ہے۔

حضرت سلطان الاولیاء اور خواجہ اجمیری وغیرہ اکابر کے طرز پر آپ کے یہاں بھی زرین اقوال، بیش قیمت ملفوظات کی ترتیب وتدوین کا سلسلہ قائم تھا، اور خوش نصیبی سے حضرت مجذوب مرحوم جیسے سچے عاشق آپ کو میسر آگئے تھے، جنہوں نے تقریباً ۶۰ جلدوں میں اس "دفتر معرفت" کو دوسروں کے لیے محفوظ کر دیا۔

اِصلاحِ خلق :

انبیاء علیہم السلام جس عظیم الشان کام کے لیے وقتاً فوقتاً مبعوث فرمائے گئے ہیں حضرت خاتم المرسلین کے بعد اس سلسلہ کو تو موقوف فرما دیا گیا، لیکن تشریفاً "للامۃ المکرمۃ" وہی کام علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل اور العلماء

ورثۃ الانبیاء کے بموجب جانشین انبیاء سے لے لیا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے حکیم الامت کو اس کام کے لیے پہلے ہی سے منتخب فرما لیا تھا۔ اور وہ اسی کے لیے ڈھلے تھے، مولانا کی ساری زندگی پر نظر ڈالیے، ان کی ہر حرکت وسکون، مسلمانوں کی اصلاح، فلاح وبہبود کے لیے وقف نظر آتی ہے، مسلمانوں کی زبوں حالی اور پستی پر ان کا قلب مبارک بے چین ہے اور اس کے ازالہ کی تدبیروں پر ان کا بے پناہ قلم وزبان تیز رو ہو جاتے تھے۔ چنانچہ چار سو کے قریب مختلف موضوعات پر مواعظ کے نام سے اسی قسم کے رسائل شائع ہو چکے ہیں جن میں سے اصلاح الرسوم صفائی معاملات، اصلاح امت، اصلاح انقلاب امت، حیوۃ المسلمین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، موخر الذکر تالیف پر تو کئی دفعہ حضرت نے اظہار مسرت فرماتے ہوئے کہا کہ مجھے جس قدر زحمت ومحنت اس تصنیف میں اٹھانی پڑی ہے کسی دوسری تالیف میں نہیں ہوئی۔ اور اپنی تمام تصنیفات میں اسی کو ذریعہ نجات تصور کرتا ہوں۔"

آخر عمر میں بوادر النوادر کے نام سے عجیب وغریب ایک کشکول تیار ہوا جس کے اہتمام میں بڑی دلچسپی کا اظہار فرمایا پھر یہی نہیں کہ میدان صحافت میں آپ ایک بے نظیر اور کامیاب مصنف کی حیثیت سے جلوہ فرما نظر آتے ہیں بلکہ خطابت میں بھی آپ کے لاثانی مواعظ، اور تقریروں سے ابھی تک ہندوستان کی فضا گونج رہی ہے۔ اور آج تک کان اس سامعہ نوازی کو نہیں بھولے جس سے دیوبند کے اس بوریہ نشین درویش عالم نے نصف

صدی امت کو درس حیات بخشا، بے نظیر خطبے دیتے، علماء، صلحاء، امراء، فقراء اپنوں اور غیروں کے مجامع میں بے مثل وعظ کہہ کر خراج تحسین وصول کیا۔

اور صرف علمی ہی حد تک نہیں بلکہ عملی ریاضت و مجاہدات کے ذریعہ ہزاروں مسترشدین کا نہایت وسیع حلقہ پیدا فرما دیا۔ مولانا اگرچہ ایک گوشہ نشین، اور مستغنی درویش تھے۔ مگر آپ کا آستانہ بڑے بڑے اہل دولت و ثروت لوگوں کے لیے عقیدت گاہ بنا رہتا۔

۸۳ سال کی مختصر سی عمر میں تنہا ایک شخص کے اس قدر کارنامے جن کے لیے بڑی بڑی جماعتیں بھی ناکافی ثابت ہو سکتی ہیں عالم اسباب میں بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کرشمہ سازیاں ضبط و نظم اور انضباط اوقات کی ہیں، مولانا کے یہاں وقت کی بڑی قدر و قیمت تھی، نظام الاوقات کا بڑا لحاظ اور اہتمام رہتا تھا۔ تہذیب جدید کے دلدادہ حضرات، ضبط و نظم کا کا اہتمام بہت کرتے ہیں لیکن عمل کے اس پتلہ نے انضباط و نظم کا وہ ثبوت پیش کیا جس سے سب دنگ اور انگشت بدنداں رہ گئے۔

مولانا کی زندگی میں یہ زریں اصول جس شدت و پابندی کے ساتھ دائر و سائر رہتا تھا دیکھنے اور برتنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ ہر کام کا ایک مقررہ وقت تھا۔ اور مولانا کو بڑی سے بڑی کوئی مجبوری بھی اس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

ایک مستعد انسان کی طرح مقررہ اوقات میں کام پر لگ جاتے تھے۔ اور

قدرتی نظام کی طرح اصولی محور پر ان کا نظام زندگی گھومتا رہتا تھا کسی کی مجال نہیں تھی جو سرمو اس سے ان کو ہٹا سکے، یا کسی درجہ میں بھی خلل انداز ہو جاتے۔

سینکڑوں تلامذہ، خلفاء، ہزاروں مسترشدین، مجازین، صحبت و بیعت، لاکھوں وابستگان عقیدت، اور تصنیفات و تالیفات جیسی پائیدار یادگاروں اور باقیات صالحات کے ہوتے ہوئے اگر آپ نے کوئی فانی جسمانی یادگار نہیں چھوڑی تو کیا منقصت ہوگئی، بلکہ ایک درجہ میں" ما کان محمد ابا احد" کی سنت اضطراریہ کا شرف حاصل ہو گیا۔

جماعت دیوبند کے لیے تنہا آپ کی ذات اور خدمات ہی سر اونچا کرنے کے لیے کافی ہیں، جو کام بڑی بڑی جماعتیں مل کر بھی پورا نہیں کر سکیں وہ قدرت نے صرف آپ کی ذات کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا ؎

"لیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد"

کسی نے خوب کہا ہے ؎

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام

بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے کہ تین مرتبہ اس مجدد طریقت حکیم الامت کی زیارت سے" تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل" کا یہ مصداق بھی شرف اندوز ہو چکا ہے۔

آخری مرتبہ، غالباً جب کہ قاضی بیضاوی، مشکوٰۃ، میر زاہد، ملا جلال وغیرہ کتابیں پڑھتا تھا، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کا تعارفی گرامی نامہ اور طلبہ کی جماعت تبلیغ کو لے کر تھانہ بھون حاضر خدمت ہوا تو حضرت والا نہایت درجہ محظوظ و مسرور ہوئے، اور فرمایا کہ "یہ مری ہی تحریک۔ اور دلی تمنا تھی کہ فارغ اوقات میں طلبہ بھی تبلیغ میں حصہ لیں اور فرمایا کہ بھائی یہ پڑھنا پڑھانا، درس تدریس بھی تبلیغ ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مدارس کی یہ تبلیغ خاص ہے اور وہ عام، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب درس و تدریس مقدمات اور ذرائع ہیں۔ مقصود اصلی وہی تبلیغ ہے جس کے لیے انبیاء کرام کو بھیجا گیا۔ اس لیے تبلیغ کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کا فرض منصبی ہے، ان زبانی نصائح ہی پر بس نہیں کیا بلکہ حضرت مہتمم صاحب موصوف کے مکتوب کی پشت پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے یہ مصرعہ بھی زیب قلم فرما دیا ؎

"اے وقت تو خوش کہ دل ما خوش کردی"

اس سے پہلی مرتبہ حاضری کے موقعہ پر احقر نے خانقاہ میں خواب دیکھا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہوں مگر روضہ اقدس، بشکل خانقاہ تھانہ بھون ہے" جس سے میں نے حضرت کا، کمال اتباع سنت اخذ کیا۔

بہر حال حضرت والا مدت العمر دینی فروغ، اور خدمت خلق میں مشغول رہے، اور ہمیشہ اپنے کو دار العلوم دیوبند کا خادم ہی تصور فرماتے رہے۔

آخری زمانہ میں بعض مصالح کی بناء پر حضرت والا ظاہری سرپرستی سے مستعفی ہو گئے تھے، لیکن توجہات و تصرفات اسی طرح کارفرما رہے، دارالعلوم نے بھی اس نسبت کا یہ احترام کیا کہ حضرت کے بعد باضابطہ اس عہدہ پر کسی کو نامزد نہیں کیا اگرچہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ صدر مدرس دارالعلوم کی خصوصی اور مربیانہ عنایات و توجہات دارالعلوم پر سایہ فگن ہیں لیکن تاحال رسمی طور پر اس عہدہ کو ختم ہی کر دیا گیا ہے گویا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے لیے خاتم سرپرستان ہیں"

افسوس ہے کہ ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء منگل کی شب میں بزم قاسم و رشید کا یہ چراغ بھی گل ہو گیا۔ اور ۸۲ سال، ۳ ماہ ۱۱ روز بعد حکیم الامت نے اس خاکدان عنصری سے رحلت فرمائی۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

مولانا کے وصال کا منظر بھی نہایت اندوہگین اور غم آفرین تھا، جماعت دیوبند کے لیے حضرت قاسم و رشید کے سانحہ ارتحال کی یاد دوبارہ تازہ ہو گئی، اور پوری جماعت نے اس صدمہ اور ناقابل تلافی نقصان کو محسوس کیا۔

مولانا کی وفات پر ہر قسم کے تاریخی مادے جس قدر نکالے گئے ہیں شاید ہی کسی بزرگ کی وفات پر اتنے مادے نکالے گئے ہوں اُن میں سے چند یہ مادے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"اشرف علی نور اللہ مرقدہٗ، مولانا اشرف علی، لقد فاز فوزاً عظیما"
۱۳ ھ ۶۲ ۱۳ ھ ۶۲ ۱۳ ھ ۶۲

بگفت، لھم فیھا فاکھۃ ولھم ما یدعون سلام قولاً من رب الرحیم۔
۱۳ ھ ۶ ۲

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون

عجب فرحت گہے ایں خانقاہ است　　عجب نزہت گہے ایں خانقاہ است

یکے ساقی دے خواران ہزار اند　　دو چشم مست او مشغول کارند

دل اینجا میکند اللہ اللہ　　کہ ہر دم بشنود اللہ اللہ

چہ صحت بخش ہست اینجا فضائے　　دل اینجا بے دوایا بد شفائے

تعالیٰ اللہ چہ عالی بارگاہے

کہ اینجا ہر گدائے بادشاہے

حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ

مقالہ نمبر ۱۴
حکیم الامت حضرت تھانوی رح
کی
جامع شخصیت
اور
ہماری ذمہ داریاں
حضرت مولانا عبداللہ سلیم صاحب مدرس دارالعلوم وقف دیوبند

"سعادۃ الخلف فی تشریف الاشرف"

حضرت تھانوی قدس سرہ کی جامع شخصیت اور ہماری ذمہ داریاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

اما بعد:

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی صف میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جو امتیاز حاصل تھا، اور جو آپ کی اہم ترین خصوصیت تھی۔ اس کی نشاندہی قرآن حکیم میں ایک جگہ "لِلنَّاسِ اِمَامًا"[1] کے لفظ سے کی گئی ہے اور دوسری جگہ ان مختصر ترین مگر جامع ترین الفاظ سے خبر دی گئی ہے۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا[2]۔ بلاشبہ ابراہیم مقتدا اور اللہ کے تابع فرمان تھے یکسوئی کے ساتھ۔

اُمَّۃً کے معنی رأس المفسرین حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قوم اور جماعت کے کیے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جو کمالات پوری قوم اور جماعت میں منتشر ہوتے ہیں وہ تنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات میں جمع تھے۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۱۲۴۔ [2] سورۃ النحل آیت ۱۲۰۔

اور جمہور مفسرین نے اُمَّۃً کے معنی اس جگہ مقتدائے قوم کے کیے ہیں گویا جس بات کو سورۂ بقرہ میں للناس اماماً سے بتلایا گیا ہے۔ وہی بات یہاں اُمَّۃً کے لفظ سے بتلائی گئی ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر اور جمہور مفسرین کی تفسیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ اس لیے کہ جو ذات قوم کے کمالات کی جامع ہوگی وہی دراصل مقتدائے قوم بھی ہوگی۔

جماعت انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کا امتیاز:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس خاص خصوصیت کو سمجھنے کے لیے اس بات پر نظر رکھنا ضروری ہے کہ یوں تو ہر پیغمبر خوبیوں کا حامل اور کمالات کا جامع ہوتا ہے، لیکن ہر نبی میں وہ وصف خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے جو اس کی شریعت کا آئینہ دار ہو۔ اور پھر وہ وصف اور وہ خاص رنگِ شریعت اصلاح کے باب میں قوم کی افتادِ طبع کے مطابق ہو ——— یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سخت تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت میں غضب اور غصہ غالب تھا، ——— شریعت موسوی کی سختی کا اندازہ قرآن حکیم کی ان آیات سے ہوتا ہے جو بنی اسرائیل سے خطاب میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر فرماتے ہوئے نازل کی گئی ہیں اور جن میں فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم قوم موسیٰ کے بوجھ کو ہلکا فرمائینگے

اور بہترین اور متوازن احکام شرعیہ کے ذریعہ ان کے قانون کی آہنی زنجیروں کو کاٹ دیں گے۔

یامرھم بالمعروف وینھاھم	وہ نبی امی حکم کرتا ہے ان کو
عن المنکر ویحل لھم الطیبت	بھلائی کا اور روکتا ہے ان کو برائی
ویحرم علیھم الخبائث ویضع	سے اور حلال کرتا ہے ان کے لیے
عنھم اصرھم والاغلال	پاکیزہ چیزیں اور حرام کرتا ہے ان کے
التی کانت علیھم۔	اوپر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے بوجھ
(الاعراف آیت ۱۵۷)	اُن سے اور بیڑیاں جو تھیں اُن کے اوپر۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غضب اور غصہ کی شدت کا اندازہ اِس حکایتِ قرآنی سے بھی ہوتا ہے

ولما رجع موسیٰ الیٰ قومہٖ	اور جب لوٹے موسیٰ اپنی قوم کی طرف
غَضبانَ اَسِفًا۔ (الاعراف آیت ۱۵۱)	غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے۔

اس کے برعکس حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل شدہ احکام شرعیہ میں نرمی تھی تو خود ان کے اندر نمایاں صفت بھی نرمی اور نرم خوئی کا تھا، جس کا اندازہ ان کے یہاں کی اس ہدایت سے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی پیش کر دیا جائے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے امتیازی اوصاف کا فرق:

اسی طرح جس قوم کی طرف کوئی نبی مبعوث ہوتا تھا اس قوم میں جو علم و فن

رائج ہوتا، اسی علم و فن میں معجزانہ کمال کے ساتھ وہ پیغمبر مبعوث کیا جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے دور میں طب و حکمت اپنے عروج پہ تھی، تو حضرت مسیحؑ کو بطور خاص ایسے معجزے عطا ہوئے جن سے لا علاج مریض شفایاب ہوئے۔ اور مدعیان فن لاجواب ہو گئے۔

اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام کے زمانہ میں جادو اور سحر کو عروج حاصل تھا۔ اس فن میں بڑے نامی گرامی ماہرین موجود تھے اور ان کے کرتبوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ تو ان کے مقابلہ میں حضرت موسٰی علیہ السلام کو ید بیضا اور عصا دیئے گئے۔ جن سے نامور جادوگر بھی عاجز ہو کر اقرار حق کرتے ہوئے دینِ موسوی کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم کی جامعیت:

مگر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ قیامت تک کے لیے اور سارے عالم کے لیے پیغمبر بنائے گئے۔ اس لیے آپ کی ذات جامع علوم و کمالات بھی ہوئی اور اخلاقی مراتب و مدارج کی رفعتوں کی حامل بھی، اسی وجہ سے آپ نے ایک طرف یہ اطلاع دی اوتیتُ علم الاولین والآخرین (مجھے اولین و آخرین کے علم دیئے گئے) اور دوسری طرف آپ نے کمالِ اخلاق کے ایسے نمونے پیش کیے کہ جن کی نظیر ایسے ہمہ گیر انداز پر ملنی ممکن نہیں اس طرح جو کمالات اور خوبیاں تمام انبیاء علیہم السلام میں منتشر تھیں وہ آپ کی ذات والا صفات میں مجتمع ہو گئیں۔ اس لیے سچ کہا گیا ہے ؎

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جامعیت اور شریعت و شخصیت میں ہمہ جہتی توازن جب بدرجۂ ادنیٰ حضرت ابراہیم خلیل میں نمایاں ہوئی تو امام الناس کا منصب عطا ہوا، اور یہی جامعیت اپنی کمال وسعت و ترقی کے ساتھ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں جلوہ گر ہوئی تو آپ سید الانبیاء اور خاتم المرسلین قرار پائے۔

حضرات انبیاء اور علماء :

ان دو باتوں کے بعد ایک تیسری بات کی طرف بھی توجہ کی جائے اور وہ یہ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء حضرات انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں)۔

اور یہ بات شاہد ہے کہ حضرات علماء میں اخلاق و اطوار اور اہلیت و صلاحیت کا کافی فرق ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی عالم کو کسی نبی کے وصف خاص سے مناسبت ہے اور کسی عالم کو کسی نبی کے خاص وصف سے، مثلاً کسی عالم میں غضب دینی غالب ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس امتیازی وصف کا ظہور ہے۔ اور اگر کسی میں نرمی اور لینت ہے تو کہنا چاہیئے کہ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کے وصف خاص کا اثر ہے، اسی طرح کسی میں سوز و گداز اور دعاء ذکر کا غلبہ ہے تو کہا جائے گا کہ اس میں شان داؤدی جلوہ گر ہے اور

کسی میں سیاست و سیادت نمایاں ہے تو کہا جائے گا کہ یہ شانِ سلیمانی کا پرتو ہے، ایسے ہی کسی میں قناعت اور صبر و شکر کی حالت طاری ہے تو خیال کیا جائے گا کہ اس سے خُلقِ ایوبی عیاں ہے۔

اسی طرح جس کسی عالم میں جذبۂ تبلیغ و دعوت غالب ہے تو باور کیا جائے گا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے وصفِ خاص اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ تبلیغ کا مُظہرہ ہے، ایسے ہی کسی میں علوم و فنون کی جامعیت ہے تو یقین کیا جائے گا کہ اس میں آقائے مدنی صلے اللہ علیہ وسلم کی جامعیتِ علم کی شان رونق افروز ہے، —— اور پھر جس عالم میں جو خاص وصف نمایاں ہوتا ہے اسی وصف سے قوم کو فائدہ پہنچتا ہے جس طرز پر کہ اس وصف کے حامل پیغمبر کی ذات ستودہ صفات سے پہنچا تھا۔

بعض علماء کی جامعیت :-

لیکن بعض ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں اور جو بہت کم ہی ہوتی ہیں کہ جن میں تمام اوصاف اس طرح یکجائیت کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں کونسا وصف غالب اور ممتاز ہے اور کونسا مغلوب ان میں جامعیت علوم بھی ہوتی ہے، مہارتِ تعلیم و تدریس بھی ہوتی ہے، جذبۂ تبلیغ و دعوت بھی قوت کے ساتھ ہوتا ہے، اور انابت الی اللہ بھی رگ و ریشہ میں رچی بسی نظر آتی ہے، مختلف عادتوں اور اطوار کے لوگوں کی کامیاب تربیت کا بصیرت مندانہ سلیقہ بھی دکھائی دیتا ہے اور افراد و

اقوام کے اخلاقی اور روحانی امراض پر ماہرانہ گرفت بھی اور ان کا معالجہ بھی کامیاب نظر آتا ہے۔ایسی نادر روزگار ہستیوں کے لیے یہی کہا جائے گا کہ وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہمہ جہتی جامعیت کا مظہر ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی وسیع اور ہمہ جہت خدمات

برصغیر کی گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ اس حقیقت کے اعتراف میں تردد نہ کریں گے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ایسی جامع شخصیت مردم خیز دوآبہ ہند کے ایک قصبہ تھانہ بھون میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے۔

جنہوں نے ایک طرف تعلیم وتدریس کے ساتھ ہر فن میں ایسی کتابیں تصنیف کیں کہ ان جیسی کتابیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔تفسیر قرآن پر کام کیا تو وہ عجیب، بیان القرآن کی حقیقت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی نظر تمام تفاسیر پر ہو ان پر ہی حقیقت منکشف ہو سکتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ مختصر ترین الفاظ میں تمام تفسیروں کا نچوڑ پیش کر دیا بلکہ اختلاف تفسیر کے مواقع پر نہایت محتاط اور مرجح تفسیر کو لیا گیا ہے، اسی کے ساتھ ربط آیات اور سورتوں کے ربط کے سلسلہ میں ایسی کاوش کی گئی کہ جس کی نظیر نہیں۔

تجوید پر توجہ کی تو جمال القرآن جیسی سہل ترین کتاب اور قرأت سبعہ پر نظر

کی تو تنشیط الطبع فی اجراء ات السبع تصنیف فرمائی، کہ جس نے سبعہ قراءت پڑھنے والے طلباء کو وہ سہولت دے دی کہ جو اس سے پہلے میسّر نہ تھی۔

فقہ و حدیث کی طرف متوجہ ہوئے تو اعلاء السنن جیسی عظیم وجلیل تصنیف کا پروانہ ڈالا، تعلیم بنات کی طرف دھیان دیا تو بہشتی زیور جیسی بے مثال تصنیف لطیف دنیا کو دے دی، تصوف کی طرف رُخ فرمایا تو التکشف عن مہمات التصوّف جیسی مفصّل کتاب تصنیف فرما کر مہمات تصوّف سے پردے اٹھا دیتے، اس کے علاوہ مسائل السلوک مرتب فرما کر تصوف کی حقیقی اصطلاحات و اعمال کا آیات قرآنی میں ماخذ بتلا دیا، اور غیر واقعی باتوں کی تردید فرما دی جس سے تصوف کی اصل شکل جو بارگاہ نبوت میں مطلوب و محمود تھی نکھر کر سامنے آگئی۔

اخلاق و معاشرت کے موضوع کو لیا، تو اصلاح المسلمین، اصلاح معاشرت اور اصلاح الرسوم جیسی تیر بہدف نسخے عوام و خواص کو ہدیہ کر دیتے۔ تنظیم جماعات، اور تربیت اقوام کے اہم ترین شعبہ کو لیا تو صیانت المسلمین کا مکمل اور جامع نظام مرتب فرما کر امّت پر احسان فرما دیا۔

پھر پند و نصیحت اور دعوت و تبلیغ کے باب میں حصہ لیا تو ہزاروں وہ وعظ اور تقریریں فرمائیں کہ جو نہ صرف یہ کہ ہر موضوع سے متعلق ہیں، بلکہ اس میں ایسے علوم و معارف کے جواہر جمع کر دیتے کہ جو بے شمار کتابوں کا نچوڑ ہیں، اسی کے ساتھ قوم و ملّت کی ایسی نبّاضی کی گئی ہے، کہ اس سے زیادہ توقع نہیں ہو سکتی، اور پھر خصوصیت سے شریعت کو شرک سے اور سنت کو بدعت

سے اس طرح نکھار دیا کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہا، اور پھر ان مواعظ کی افادیت کو مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے ان کو قلمبند کرا کر ان کی طباعت کا نظم فرمایا، یہ نظم فرمانا بھی ان کی زبردست خصوصیت ہے۔

پھر افراد و اشخاص کی تربیت اور راہِ سلوک و معرفت کی رہنمائی کا کام کیا تو ایسی کامیاب تربیت فرمائی کہ جو ان کی خانقاہ سے وابستہ ہوگیا وہ کندن ہو کر نکلا، اور جس کو ان کی بارگاہ سے خلعت خلافت ملا وہ ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کے مربّی و مصلح ثابت ہوئے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے یہی وہ کارنامے تھے جنہوں نے ان کو حکیم الامت اور مجدد الملّت نیز شیخ طریقت کے گرانقدر خطابات سے یاد کرایا:

پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

یتلوا علیھم اٰیاتہ و	آیات ربانی کی تلاوت کرتا ہے،
یزکیھم و یعلمھم الکتٰب	لوگوں کی تربیت کرتا ہے، اور ان
والحکمۃ ۔ (الجمعۃ)	کو کتاب اللہ اور حکمت کا علم سکھلاتا ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کا صدقہ حضرت تھانوی کو ملا تو دیکھ لیجئے کہ کسی قدر جامعیت کے ساتھ یہ سب پیغمبرانہ کام انجام دیئے۔

حضرت تھانوی کی جامعیت :

اس طرح جو کمالات امت کے خواص میں منتشر ہیں، اور دین وملت کی جو خدمات الگ الگ مختلف شخصیتوں نے انجام دی ہیں وہ تنہا حضرت حکیم الامت ؒ نے انجام دیں، اس طرح آپ کی ذات سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے وصف خاص ان ابراھیم کان امة قانتا لله حنیفًا کی مظہر ہوئی۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی گوناگوں خدمات کی عند اللہ مقبولیت اور ہر کام میں ان کے اخلاص کا ہی یہ اثر ہے کہ ان کے بعد ان کاموں کو اُن کے خلفاءِ کرام نے سنبھالا، کسی نے تصنیف و تالیف کو لیا تو کسی نے پند و نصائح اور مواعظ و خطبات کو، کسی نے تربیت و اصلاح کا بیڑا اٹھایا، تو کسی نے تنظیم و تعلیم کی خدمت انجام دی۔

مجلس صیانت المسلمینؒ :

چنانچہ حضرت ہی کے تجویز کردہ اور اختیار فرمودہ ایک اہم کام کی نہج مجلس صیانت المسلمین کی صورت میں سامنے آئی جس کا مرکز حضرت ہی کے لگائے ہوئے سرسبز باغ کے شجر طوبیٰ یعنی جامعہ اشرفیہ لاہور کے اندر قائم ہے، اور زبانِ قلم کے ذریعہ حسب استطاعت دین کی خدمت انجام دے رہا ہے، اگرچہ مجلس کے تجویز کردہ کئی شعبوں میں ابھی کام کرنا باقی ہے، اگر مزید دلچسپی اور حوصلہ سے کام لیا گیا تو توقع ہے کہ وہ خاموش شعبے بھی

متحرک ہو جائیں گے ۔

جہاں تک مساجد میں مکاتب و مدارس کے قیام کے منصوبے کا تعلق ہے اس پر اگر عمل نہیں ہوا تو فی زمانہ یہ بڑا نقصان نہیں ہے، اس لیے کہ بحمد اللہ برصغیر میں مدارس کی کثرت ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر مسجد میں مکتب و مدرسہ بن جانے کی بات ہی اور ہے ۔

مجلس کا قابل توجہ شعبہ :

لیکن شعبۂ تبلیغ و تذکیر کی اہمیت ہر زمانہ میں اور ہر جگہ قابل لحاظ ہے، اس میں کوتاہی معاشرے کے بگاڑ کا سبب بنی ہوئی ہے ۔ اس سلسلہ میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس وقت پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کی جدوجہد جاری ہے، اور اس کے لیے قانون سازی کے چرچے ہو رہے ہیں، امید کرنی چاہیئے کہ اگر شیطان اور نفس امّارہ کے فتنوں سے کچھ دن محفوظ رہ گئے تو انشاء اللہ قانون سازی مکمل ہو جائے گی ۔ لیکن کیا محض قانون سازی کافی ہوگی، اور اتنا کام سب کو بری الذمہ کر سکے گا، زندہ قانون وہی ہے جو نافذ ہو سکے، مگر بگڑے ہوئے معاشرے نے نفاذ قانون کی راہ میں جس قدر کھائیاں کھود رکھی ہیں، ان سے سب ہی واقف ہیں ——— جب تک معاشرے کی اصلاح کا بیڑہ نہ اٹھایا جائے گا، محض قانون سازی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، قانون تو اصولی طور پر پہلے سے مدوّن ہے جس کا نام قرآن حکیم ہے ۔

پاکستان کے موجودہ حالات میں مجلس کی ذمہ داری :

واقعہ یہ ہے کہ قانون سازی اگر ارباب حکومت کا فریضہ ہے تو فی زمانہ اس کے نفاذ کے لیے زمین کا ہموار کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے جذبات معاشرے میں پیدا کرنا یہ علمائے دین کا کام ہے، یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر اس سلسلہ میں ہم نے اپنی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں کوئی کوتاہی کی تو تاریخ کا بہت بڑا سانحہ ہوگا، اور پھر طویل مدت تک کوئی قانون اسلامی کا نام نہ لے سکے گا، اس وقت ملک اور اس کے اسلامی منصوبے ہر طرف سے معرض خطر میں ہیں، اس نازک صورت میں مجلس "صیانت المسلمین" کی بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کام کو تیز سے تیز تر کرے، اور پوری تندہی کے ساتھ اپنے کام کو اس انداز پر آگے بڑھاتے کہ قانون اسلامی پر نفاذ کا کام پاکستان میں کامیاب ہو جاتے۔ یاد رکھیے اگر یہ کام یہاں خدا کے فضل سے کامیاب ہو گیا، تو توقع کی جا سکتی ہے کہ دوسرے ممالک اسلامیہ بھی اس طرف رُخ کریں گے

اس سلسلہ میں بطور اشارہ یہ بات اور عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجلس "صیانۃ المسلمین" کو حضرت تھانوی قدس سرہٗ یا ان کے ہم مشرب لوگوں کا کام نہ سمجھا جاتے بلکہ اس کو اسلام کا کام سمجھا جاتے جو ہم سب کا مذہب ہے، اور جس نے ہم سب پر اس طرح کے کاموں کی ذمہ داری سونپی ہے، میرے دئے ہوئے اس اشارے سے غفلت کام کو کمزور ہی کرے گی۔

تیسری بات یہ ہے کہ مجلس کے تیار کردہ لٹریچر کو حضرت تھانوی قدس سرہٗ

کے مواعظ کے اضافہ کے ساتھ اردو اور انگلش و عربی میں بڑی تعداد میں طباعت کا کام شروع کر کے ممالک عربیہ اور یورپ و امریکہ میں پھیلا دیا جائے۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ ان ممالک میں زمین پیاسی ہے، جس کا فائدہ مصنوعی بارش برسانے والا اٹھانا چاہتے ہیں اور اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ حقیقی رحمت کے چشموں سے انہیں فیض یاب کیا جائے، اس سلسلہ میں حکیم الامت کے مواعظ کی خاص اہمیت وافادیت ہے۔ میں نے اپنے دورۂ امریکہ میں دیکھا ہے کہ ہندوستانی پاکستانی مسلمانوں کے یہاں اور اوران کی مساجد میں تازہ مصنفین کی کتابیں اور تفسیریں تو ہیں لیکن حضرت تھانوی کی کتابیں قطعاً نہیں ہیں، ہمیں اس سلسلہ میں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہیئے۔

تشکر:-

میں نہایت تنگ وقت میں ہی چند باتیں پیش کر سکتا تھا، آخر میں مجلس کے ذمہ داروں اور کارپردازوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ جو حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے اہم ورثہ کو مجلس صیانت المسلمین کے عنوان پر سنبھالے ہوئے ہیں، اور اس طرح حضرت کی روح پر فتوح کی خوشی و فرحت کا سامان کر رہے ہیں۔

اسی کے ساتھ مجھے امید ہے کہ مجلس کا یہ سالانہ اجتماع ملک کے بدلے ہوئے حالات میں اربابِ کار کے دلوں میں وسیع تر اور مفید تر

خدمات کا عزم و حوصلہ پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

میں محترم و مکرم مولانا وکیل احمد صاحب شیروانی کا بھی شکر گزار ہوں کہ موصوف نے ازراہِ شفقت مجھ ناکارۂ خلائق کو اس اجتماع کے لیے اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے تعلق سے مضمون تحریر کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماتے آمین۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

العبد

(محمد عبداللہ سلیم) مدرّس دارالعلوم دیوبند

واردحال جامعہ اشرفیہ لاہور

مقالہ نمبر ۱۵
حکیم عظیم
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
حیاتِ پاکیزہ
اور اصلاحی و تجدیدی کارہائے گرامی مایہ ناز کا ایک
دل آویز تذکرہ
(جناب مقبول جہانگیری صاحب مرحوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کرم عظیم
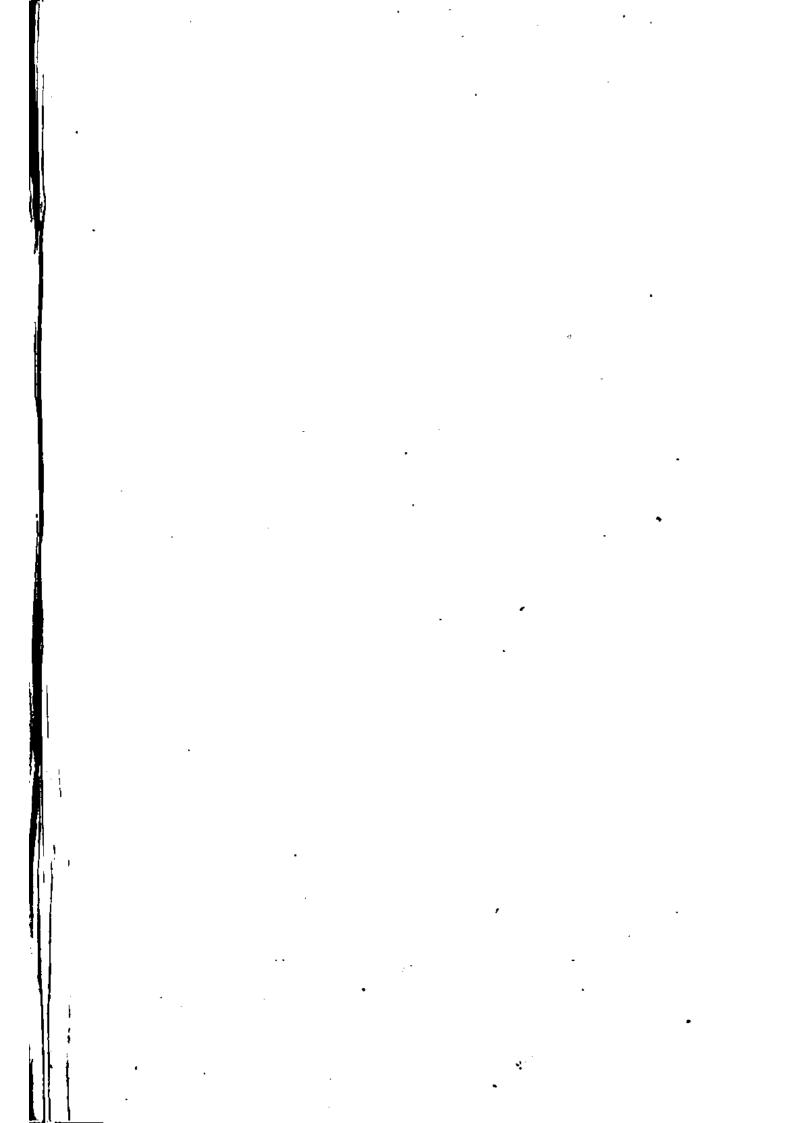
تھانہ بھون ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا ایک مشہور و معروف مردم خیز تاریخی قصبہ جو ضلع مظفر نگر میں واقع ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے پہلے اسے ہندو راجہ بھیم نے اپنے نام پر بسایا تھا اور قدیم تاریخوں میں اس کا نام تھانہ بھیم درج ہے کثرتِ استعمال سے تھانہ بھون ہو گیا۔ جب یہاں مسلمان آن کر آباد ہوئے، تو شرفائے قصبہ کے بعض اجداد نے اپنے ایک فرزند فتح محمد کے نام پر اس کا نام محمد پور رکھا۔ یہ نام شاہی دَور کے کاغذات میں بھی ملتا ہے، لیکن عام طور پر پُرانا نام تھانہ بھون ہی مشہور رہا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے اس قصبے کی آبادی اڑتالیس ہزار کی تھی، پھر گھٹ کر چھتیس ہزار رہ گئی۔ محرم ۱۲۷۴ھ میں یہاں بھی جنگ آزادی (غدر) کا اثر پہنچا تھا اور قصبے کو خاصا نقصان ہوا۔ اس حادثے کی تاریخ مولانا اشرف علی تھانوی رح نے کیا خوب نکالی تھی یعنی "خرابیٔ تھانہ" گھٹتے گھٹتے آخر اس کی آبادی تقسیم ہند سے بھی کئی برس پہلے تک چھ سات ہزار رہ گئی تھی

تھانہ بھون میں ہمیشہ مسلمان شرفا بالخصوص شیوخ فاروقی النسل صاحبِ اقتدار اور صاحبِ جائداد رہے ہیں اور اگرچہ گردش لیل و نہار کے باعث تموّل رخصت ہو کر افلاس غالب آ گیا، تاہم ذی اقتدار ہستیاں اب بھی موجود ہیں۔ مختلف علوم و فنون کے اہل کمال بھی بے شمار گذرے ہیں۔ زمانۂ شاہی میں بڑے بڑے منصب دار اور جاگیر دار بھی تھے۔ تھانہ بھون کے عقلا رخاص طور سے

مشہور رہے ہیں۔ چنانچہ ایک انگریز افسر بندوبست نے اپنی رپورٹ میں
مختلف قصبات کے باشندوں کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے
تھانہ بھون کے باشندوں کو "عاقلانِ تھانہ" لکھا تھا۔ گرد و نواح میں مسلمان
شرفاء کے بڑے بڑے قصبے ہیں مثلاً دیوبند، گنگوہ، کیرانہ، جھنجھانہ،
پانی پت وغیرہ۔ جتنی دینداری اور جتنا علمِ دین کا چرچا ان اطراف میں رہے،
اتنا اور کہیں نہیں دیکھا گیا اور جس کثرت سے بڑے بڑے علماء، فضلاء
اور مشائخ اس حصے میں گذرے ہیں، اتنے اور کہیں نہیں گذرے۔ قنوج کے
ایک دیندار بزرگ شیخ معشوق علی صاحب نے کیا خوب فرمایا تھا کہ ان اطراف
کے لوگ ہماری طرف کے لوگوں سے ہر بات میں بڑھے ہوئے ہیں، چنانچہ
یہاں کا عالم وہاں کے عالم سے اچھا، یہاں کا جاہل وہاں کے جاہل سے اچھا۔
حتیٰ کہ یہاں کا کافر وہاں کے کافر سے اچھا۔

شیوخِ تھانہ بھون حضرت شیخ مجدّد الف ثانیؒ، حضرت شیخ
جلال الدین تھانیسریؒ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ، یہ سب سلطان
شہاب الدین الملقب بہ فرخ شاہ کابلی کی اولاد میں سے ہیں جو اولیائے کاملین
میں شمار ہوتے ہیں اور سلوکِ صوفیہ سے پہلے والیٔ کابل رہے ہیں۔ سلطنتِ
غزنویہ کے زوال کے بعد آپ کابل سے خروج کر کے کئی بار بڑی فوج کے
ساتھ اسلام کی اشاعت اور کفار کے ساتھ جہاد کے لئے ہندوستان
تشریف لائے۔ آخر عنایتِ الٰہی سے ان کی توجہ سلوکِ طریقۂ عالیہ چشتیہ
کی طرف ہوئی اور بزرگوں سے مستفید ہو کر درجۂ کمال کو پہنچے۔ ایک عالم

آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا۔ ترکِ سلطنت اور قبولِ فقر کے بعد آپ نے کوہستانِ کابل میں سکونت اختیار کی اور مدتوں وہیں رہ کر اللہ کی مخلوق کو فیض پہنچاتے رہے۔ وصال کے بعد وہیں دفن ہوئے۔ آج تک وہ موضع درہ فرخ شاہ کے نام سے مشہور ہے اور آپ کی قبر زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

اسی تھانہ بھون میں ایک شریف اور ذی حیثیت خاندان کے ایک فرد عبدالحق کے گھر ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء ایک ستارہ طلوع ہوا جس کا نام اشرف علی رکھا گیا۔ کسی نے نومولود کا مادہ تاریخ "کرمِ عظیم" خوب نکالا کہ آگے چل کر یہی بچہ حکیم الامت مجدد الملت قطب الارشاد شیخ المشائخ، مرشد العالم مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی کہلایا اور اس کی ذات بابرکات امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے لئے اللہ تعالیٰ کا کرمِ عظیم ہونا ثابت ہوئی۔ مولانا کی ولادتِ باسعادت ننہال کے اُس مکان میں ہوئی جو محلہ خیل میں ہے۔ ان کی پیدائش کا واقعہ بھی عجیب ہے جو خاندان میں اُسی وقت سے مشہور چلا آتا ہے۔ مولانا کے والد عبدالحق مرض خارشت میں ایسے مبتلا ہو گئے کہ کسی دوا سے فائدہ نہ ہوتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا کہ اس مرض کی ایک دوا اکسیر ہے، مگر وہ قاطع النسل ہے۔ عبدالحق صاحب چونکہ بیماری سے بہت تنگ آگئے تھے اس لئے انہوں نے دوا یہ کہہ کر استعمال کر لی کہ بلا سے اولاد نہ ہو، بقائے نوعی سے بقائے شخصی مقدم ہے۔ عبدالحق صاحب کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو بہت پریشان ہوئیں کہ اس وقت تک کوئی اولادِ نرینہ زندہ نہیں رہتی تھی۔ شدہ شدہ یہ خبر عبدالحق صاحب

کی خوش دامن تک پہنچ گئی۔ انہوں نے اس زمانے کے مشہور مجذوب اور بزرگ حضرت حافظ غلام مرتضیٰ پانی پتی سے عرض کیا کہ حضرت میری اِس لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے۔ حافظ صاحبؒ نے فرمایا۔ عمرؓ اور علیؓ کی کشاکشی میں مرجاتے ہیں۔ اب کی بار علیؓ کے سپرد کر دینا، زندہ رہے گا، اس مجذوبانہ معمے کو کوئی نہ سمجھا، آخر عبدالحق صاحب کی بیوی نے اپنی فہم خداداد سے اسے حل کیا اور فرمایا، حافظ صاحبؒ کا مطلب یہ ہے کہ لڑکوں کے باپ فاروقی ہیں اور ماں علوی۔ اب تک جو نام رکھے گئے وہ باپ کے نام پر رکھے گئے۔ اب کی بار جو لڑکا ہو، اس کا نام نانہال کے ناموں کے مطابق رکھا جائے جس کے آخر میں علیؓ ہو۔ حافظ صاحب یہ سن کر ہنسے اور فرمایا: واقعی میرا مطلب یہی تھا۔ یہ لڑکی بڑی عقلمند معلوم ہوتی ہے انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی رکھنا، دوسرے کا اکبر علی۔ دونوں صاحبِ نصیب ہوں گے۔ ایک میرا ہوگا، وہ مولوی اور حافظِ قرآن ہوگا اور دوسرا دنیا دار ہوگا۔ چنانچہ یہ سب پیش گوئیاں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں۔ کبھی کبھی مولانا کہا کرتے تھے کہ یہ جو میں اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں، انہی مجذوب صاحب کی روحانی توجّہ کا اثر ہے جن کی دُعا سے میں پیدا ہوا ہوں۔ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے، اُلجھی ہوئی باتوں کی متحمل نہیں۔

اشرف علی کی پیدائش کے تقریباً چودہ ماہ بعد ہی ان کے چھوٹے بھائی اکبر علی پیدا ہوئے اور چونکہ ماں کا دودھ دونوں بچوں کے لئے کافی نہ تھا،

اس لئے اشرف علی کے لئے ایک انا رکھی گئی۔ وہ قوم کی قصائی تھی۔ چنانچہ مولانا مزاح میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے قصائی کا دودھ پیا ہے، اس لئے بھی میرے مزاج میں حدّت ہے، مگر الحمد للہ شدّت نہیں۔ ابھی آپ کی عمر پانچ سال کی تھی کہ والدہ کا سایۂ عاطفت سر سے اُٹھ گیا، لیکن والد نے بڑی محبت اور شفقت سے دونوں بھائیوں کی خود پرورش کی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور اخلاق کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ تراویح میں ختم قرآن کی جو مٹھائی مسجدوں میں تقسیم ہوتی، اُس میں کبھی شریک نہ ہونے دیتے، بلکہ اُس روز خود بازار سے مٹھائی منگوا کر اس سے زیادہ کھلا دیتے اور کہتے کہ مسجدوں میں مٹھائی لینے کے لئے جانا بے غیرتی کی بات ہے۔

مولانا اشرف علی کی ذہانت بچپن کی شوخیوں میں بھی نمایاں تھی۔ نئی سے نئی سوجھتی تھی۔ خود فرماتے تھے: ایک دفعہ مجھے کیا شرارت سوجھی، برسات کا زمانہ تھا، مگر ایسا کہ کبھی برس گیا کبھی کھُل گیا مگر چارپائیاں باہر ہی بچھتی تھیں۔ جب برسنے لگا چارپائیاں اندر کر لیں، جب کھُل گیا، باہر بچھا لیں۔ ہم دونوں بھائیوں اور والد کی چارپائیاں ملی ہوئی بچھتی تھیں۔ ایک دن میں نے چپکے سے تینوں چارپائیوں کے پائے رسّی سے آپس میں خوب کس کر باندھ دیئے۔ اب رات کو جو مینہ برسنا شروع ہوا، تو والد صاحب جدھر بھی گھسیٹتے ہیں تینوں کی تینوں چارپائیاں ایک ساتھ گھسٹتی چلی آتی ہیں۔ غرض والد صاحب بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا نامعقول حرکت کی۔

مولانا کہتے تھے کہ میں بچپن میں بہت شوخیاں کیا کرتا تھا، مگر گندی شرارتیں

نہ ہوتی تھیں۔ دیوالی کے زمانے میں میرٹھ چھاؤنی کے بازار میں سڑک پر دورویہ چراغ جلائے جاتے تھے۔ دونوں طرف ہم دونوں بھائی چلنا شروع کرتے اور رومال کو حرکت دے کر چراغوں کو ایک طرف سے بجھاتے چلے جاتے، مگر کوئی بُرا نہ مانتا، ہندوؤں کو بھی ناگوار نہ ہوتا۔ ایک کھیل یہ تھا کہ سب ساتھیوں کے جوتے جمع کئے، اُن کی صفیں بنائیں اور ایک جوتا صفوں کے آگے رکھ دیا اور خوش ہوئے کہ جوتے بھی نماز پڑھ رہے ہیں، وعظ کا بھی بچپن سے شوق تھا، اس کی بھی نقل اتارا کرتے۔ جب کبھی بازار کی طرف کسی چھوٹے موٹے سودے کے لئے بھیجے جاتے تو مسجد راستے میں پڑتی، سیدھے منبر پر جا چڑھتے اور کھڑے ہو کر کچھ خطبے کی طرح پڑھ پڑھا کر وہاں سے چلے آتے۔

بہت چھوٹی عمر میں کہ ابھی عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے، پچھلی رات تہجد کو اُٹھنے اور نوافل اور وظائف پڑھتے۔ تائی صاحبہ محبت سے کہتیں کہ بیٹے، ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ خاص طور سے سردی کے زمانے میں جب پچھلی رات کو اُٹھ کر وضو کرتے اور تہجد پڑھتے، تو اُن کا جی بہت کُڑھتا اور برابر بیٹھی جاگا کرتیں۔ بچپن میں یہ عجیب عادت تھی کہ کسی کا ننگا پیٹ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دیکھتے ہی فوراً قے ہو جاتی۔ دوسرے بچوں کو اس عادت کا علم تھا، اس لئے تنگ کرتے اور بار بار پیٹ کھول کر دکھاتے اور اشرف علی قے کرتے کرتے پریشان ہو جاتے۔ مزاج کی یہ لطافت آخری دَور تک یوں ہی رہی۔ بچپن میں ایک نرالا خواب دیکھا۔ والد ماجد اُن دنوں میرٹھ میں تھے۔ مولانا کے الفاظ میں وہ خواب یوں تھا۔ میرٹھ کے جس مکان میں ہم لوگ رہتے تھے، اُس میں

دو درجے کی دہلیز ہے۔ بڑے درجے میں ایک پنجرہ رکھا ہوا دیکھا اس
میں دو خوبصورت کبوتر ہیں۔ پھر دیکھا کہ شام ہو گئی اور وہاں اندھیرا ہو گیا
اُن کبوتروں نے مجھ سے کہا کہ اندھیرا ہو گیا ہے ہمارے پنجرے میں روشنی
کر دو۔ میں نے کہا تم خود ہی کر لو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی چونچیں رگڑیں اور
رگڑتے ہی خوب تیز روشنی ہو گئی، تمام پنجرہ روشن ہو گیا۔ جب ایک مدت کے
بعد میں نے ماموں واجد علی مرحوم سے یہ خواب بیان کیا تو انہوں نے تعبیر
دی کہ وہ دو کبوتر روح اور نفس تھے، کیونکہ صوفیہ کرام اپنی اصطلاح میں
روح کو نَر اور نفس کو مادہ کہتے ہیں۔ روح اور نفس نے تم سے یہ درخواست
کی کہ تم مجاہدہ کر کے ہم کو نورانی کر دو۔ تم نے جواب دیا کہ تم خود ہی روشنی کر
لو اور انہوں نے اپنی اپنی چونچ رگڑ کر روشنی کر لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم
ریاضت و مجاہدہ نہ کرو گے، بلا ریاضت و مجاہدہ ہی حق تعالیٰ تمہاری روح
اور تمہارے نفس کو نورِ عرفاں سے منوّر فرمائیں گے

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدّث تھانوی رحؒ جو حضرت میاںجی
نور محمد صاحب جھنجھانوی رحؒ کے خاص خلیفہ تھے اشرف علی اُن سے مکتب
میں پڑھتے تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا۔ مولانا
خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی رحؒ بھی کہا کرتے تھے کہ مجھے اشرف علی سے
اُس وقت سے محبت ہے جب وہ مجھے جانتے بھی نہ تھے۔ غرض اشرف علی بچپن
ہی سے بزرگانِ دین کے محبوب اور منظورِ نظر تھے اور ابتدائے عمر ہی سے
سعادت اور مقبولیت کے آثار کا ظہور ہونے لگا تھا۔

اشرف علی نے قرآن مجید زیادہ تر حافظ حسین علی صاحب مرحوم سے حفظ کیا جو دہلی کے رہنے والے تھے۔ شروع کے چند پارے اخون جی سے پڑھے۔ بالکل ابتدائی فارسی میرٹھ میں مختلف استادوں سے پڑھی، پھر تھانہ بھون میں فارسی کی متوسط کتابیں مولانا فتح محمد صاحب سے پڑھیں اور انتہائی کتب ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو ادبِ فارسی کے کامل استاد تھے، پھر تحصیلِ عربی کے لئے دیوبند چلے گئے وہاں فارسی کی باقی کتابیں مولانا منفعت علی صاحب سے پڑھیں۔ یعنی پنج رقعہ، قصائدِ عرفی اور سکندرنامہ۔ مولانا اشرف علی کو فارسی میں دستِ گاہ کامل تھی۔ تحریر، تقریر، نظم ونثر سب پر ماہرانہ قدرت تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں جب کسی تکلیف کی وجہ سے چھٹی لے کر وطن آئے، تو بطورِ مشغلہ فارسی زبان میں مثنوی "زیر و بم" تصنیف کی، اسوقت اٹھارہ برس کا سن تھا۔ عربی کی پوری تکمیل دیوبند میں کی اور صرف انیس یا بیس برس کی عمر ہی میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ پانچ سال وہاں رہے۔ آخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں داخل ہوئے تھے اور شروع ۱۳۰۱ھ میں فارغ ہوئے۔ عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے وطن تھانہ بھون میں مولانا فتح محمد سے پڑھیں اور دیوبند پہنچ کر مشکوٰۃ شریف، مختصر معانی، نورالانوار اور ملا حسن شروع کی تھیں۔ اشرف علی کی ذہانت، ذکاوت اور حافظہ سب طالب علموں میں مشہور تھا۔ تحصیلِ علم کا اس قدر شوق تھا کہ بعض اساتذہ سے خاص کتابیں جن کے لئے مدرسے میں وقت نہ تھا، اس طرح پڑھیں کہ استاد تو نماز کے لئے وضو

کر رہے ہیں اور اشرف علی اُن سے سبق پڑھ رہے ہیں۔ استاد بھی اُن کا خاص لحاظ کرتے تھے۔ چنانچہ جب مولانا رشید احمد گنگوہیؒ طلبہ کا امتحان لینے اور دستار بندی کرنے تشریف لائے، تو مولانا محمود حسنؒ نے اشرف علی کی ذہانت اور ذکاوت کی خاص طور سے تعریف کی۔ تعریف سُن کر حضرت گنگوہیؒ نے اشرف علی سے بہت مشکل سوالات کیے اور اُن کے جوابوں سے بے حد خوش ہوئے۔

دستار بندی کا جلسہ ۱۳۰۰ھ میں ہوا تھا۔ جب اشرف علی نے سُنا کہ دستار بندی ہونے والی ہے، تو ہم سبقوں کو لے کر اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ ہم نے سُنا ہے ہمیں سندِ فراغ دی جانے والی ہے، حالانکہ ہم ہرگز اس قابل نہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو مدرسے کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی۔ یہ سُن کر مولانا محمد یعقوبؒ کو جوش آگیا، فرمایا تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اُن کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی، باہر جاؤ گے، تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے، باقی سارا میدان صاف ہے۔ مولانا کی یہ پیش گوئی بعد میں حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

اشرف علی کو اللہ تعالیٰ نے اساتذہ بھی ایسے دیے تھے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ غزالیؒ اور رازیؒ وقت تھا۔ مولانا محمد یعقوبؒ ابن مولانا مملوک علیؒ نانوتوی کی ہستی سب سے زیادہ مقتدر تھی مولانا بہت بڑے صاحبِ باطن اور شیخ کامل بھی تھے۔ اشرف علی نے مولانا ممدوح سے نہایت فیوض و برکات

حاصل کئے اور زیادہ تر علوم عجیبہ و غریبہ اُنہی سے حاصل کیے۔ کہتے تھے کہ اُن کا حلقۂ درس کیا ہوتا تھا، حلقۂ توجہ ہوتا تھا۔ یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے۔ آیات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا اور حاجی صاحبؒ کے خلفائے عظام میں گنے جاتے تھے۔ اشرف علی کے دیگر استادوں میں مولانا سید احمدؒ، ملّا محمودؒ، مولانا عبدالعلیؒ اور مولانا محمود حسنؒ شیخ الہند کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ قرأت کی مشق شہرۂ آفاق قاری محمد عبداللہ مہاجر مکیؒ سے بمقام مکہ معظمہ فرمائی تھی جو قرّائے عرب کے نزدیک بھی نہایت جیّد اور ماہرِ فن قاری تھے۔ اُس زمانے میں قرأت کی مشق کرتے کرتے لہجے میں اپنے یگانۂ فن استاد سے اس قدر مشابہت پیدا ہو گئی تھی کہ جب قاری عبداللہؒ اشرف علی کو مدرسۂ صولتیہ کی بالائی منزل پر قرأت کی مشق کراتے، تو نیچے سننے والے تمیز نہ کر پاتے کہ اس وقت استاد قرأت کر رہے ہیں یا شاگرد۔ غرض ہر ہر استاد اپنے فن میں یگانۂ روزگار ہوتے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا صاحبِ باطن اور کامل و مکمل شیخ بھی تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشرف علی کی تربیت ظاہری و باطنی کا بہتر سے بہتر سامان شروع ہی میں جمع کر دیا تھا۔ آخر میں وہ نعمت عطا ہوئی جو گویا ان تمام نعمتوں کی میزانِ کُل ہے یعنی شیخ العرب والعجم حضرت حاجی شاہ شاہ امداد اللہؒ مہاجر مکی سے شرفِ بیعت زمانۂ طالب علمی ہی میں حاصل ہو گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ کی ذاتِ والا صفات شہرۂ آفاق ہے اور ہرگز محتاجِ تعارف

نہیں۔ ان کے بارے میں مولانا مظفر حسین کاندھلوی کا ارشاد ہے کہ حاجی صاحب کی شان بالکل اکابر سلف کی سی تھی اگرچہ پیدا اس زمانے میں ہوئے تھے۔ سینکڑوں بڑے بڑے علماء اور دوسرے سلسلوں کے مشائخ نے حضرت حاجی صاحبؒ سے شرف بیعت حاصل کرنے کو اپنا فخر سمجھا۔ لہذا بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایسا محقق اور جامع شریعت و طریقت شیخ اس زمانے میں کوئی نہیں۔ عرب و عجم کے بالخصوص اور برصغیر کے جتنے چیدہ چیدہ اور مشہور زمانہ علماء تھے، سب قریب قریب حاجی صاحب کے حلقۂ غلامی میں داخل تھے۔

اشرف علی ابھی کم سن تھے اور دارالعلوم دیوبند میں طالب علم تھے حضرت حاجی صاحب نے مکہ معظمہ سے اشرف علی کے والد ماجد عبدالحق کو پیغام بھیجا کہ جب تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ اصل یہ بات تھی کہ حاجی صاحبؒ اشرف علی کی ولادت سے بہت پہلے تھانہ بھون سے ہجرت فرما کر مکہ معظمہ جا بسے تھے اور انہیں اشرف علی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ظاہر ہے کم عمری اور طالب علمی کے زمانے کے حالات ہی ایسے کیا ہوں گے جنہیں حاجی صاحبؒ کے کانوں تک پہنچایا جاتا اور انہیں اتنا شدید غائبانہ تعلق پیدا ہوتا کہ خود مکہ معظمہ بلانے کی دعوت دیتے۔ یقیناً یاد فرمائی کسی اشارۂ غیبی یا کشش معنوی کی بنا پر تھی۔

۱۳۰۱ھ میں اشرف علی فارغ التحصیل ہوئے اور فوراً بعد مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس ہو گئے۔ اسی سال حج کا مبارک سفر ہوا اور اپنے والد کے ساتھ اس سفر پر گئے۔ مکہ معظمہ میں حاجی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کا شرف

حاصل ہوا۔ انہیں دیکھ کر حاجی صاحبؒ بے حد مسرور ہوئے۔ حج اور زیارت مدینہ منورہ کے بعد انہوں نے خود مولانا اشرف علی سے فرمایا، تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ۔ مولانا نے اپنے والد سے اجازت چاہی لیکن اُن کی شفقت پدری نے مفارقت گوارا نہ کی اور مولانا نے حاجی صاحب سے بعد افسوس عرض کیا کہ والد اجازت نہیں دیتے۔ حضرتؒ نے فرمایا، والد کی اطاعت مقدم ہے، اس وقت چلے جاؤ، پھر دیکھا جائے گا، چنانچہ واپس ہندوستان آکر علومِ ظاہری اور تبلیغ احکامِ خداوندی میں بذریعہ درس و وعظ نہایت تندہی سے مشغول ہو گئے اور ۱۳۰۷ھ تک یہی علمی شغل رہا۔ اس دوران حضرت حاجی صاحب سے خط کتابت بھی جاری رہی۔ اسی زمانے میں ذکر و شغل کا خاص اہتمام رہا اور یہاں تک متاثر ہوئے کہ حاجی صاحب سے ملازمت ترک کر دینے کا مشورہ لیا، لیکن مصالحِ دینیہ کی وجہ سے اجازت نہ ملی۔ غرض صدہا طالب علم فارغ التحصیل ہوئے اور بہت سے سندِ حدیث لے کر چلے گئے ہزارہا بندگانِ خدا مواعظ حسنہ سے مستفید ہوئے۔ درس دینے میں بڑے بڑے لاینحل مقامات کی اس خوبی سے توضیح اور اس قدر تسہیل کر کے تقریر فرماتے کہ اَدق سے اَدق مضامین بالکل پانی ہو جاتے تھے۔ مواعظ کا یہ عالم کہ پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے کھڑے ہو کر مسلسل تقریر فرماتے پھر بھی سامعین کا جی نہ بھرتا اور تمام مسلمانانِ کانپور جہاں ہر مشرب کے لوگ موجود تھے، مولانا اشرف علی کے حُسنِ بیان کے اس قدر گرویدہ ہو گئے تھے کہ محلّے محلّے طلبی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بار مسلسل دو ماہ تک صرف نماز ہی کی ترغیب میں مختلف

محلّوں میں وعظ ہوتے رہے۔ ان کا اثر یہ ہوا کہ مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت سے جگہ باقی نہ رہی اور نماز کے شوق کی یہ حالت تھی کہ تانگے والے مسلمان سواریوں سے پوچھ پوچھ کر نماز یاد کرتے تھے۔

اِس فیض ظاہری کے بعد اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ امت محمدیہ کو مولانا اشرف علی کے ذریعے فیض باطنی سے بہرہ اندوز فرمائے جس کے بغیر دین کی حقیقی تکمیل نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ یک بیک قلب میں ایک پُرزور کشش غیبی نہایت شدّومد کے ساتھ محسوس ہوئی اور ذکروشغل کا ذوق وشوق، جوش و خروش سے موجزن ہونے لگا اور وہ آتشِ محبتِ الٰہی جو قلب میں دبی ہوئی تھی، اس قوّت کے ساتھ اُبھری کہ نہ صرف مولانا کو بلکہ ایک عالم کو سوختہ کر دیا۔ اب اِدھر آتشِ عشقِ الٰہی نہایت تیزی سے دل میں شعلہ زن اور اُدھر اپنے اور حضرت پیرومرشد کے درمیان اتنا فاصلہ کہ سمندر حائل۔ سخت خلجان کہ کیونکر مقصود تک رسائی ہو۔ مولانا کا رنگ ہی بدل گیا اور گویا بالکل کایا پلٹ ہوگئی۔ شغلِ باطن سے یہاں تک دلچسپی بڑھی کہ تعلقاتِ دنیا سے نفرت ہوگئی اور حضرت حاجی صاحبؒ سے بذریعہ عریضہ ترک ملازمت کا مشورہ لیا جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا۔ لیکن حاجی صاحبؒ نے اجازت نہ دی کہ تمکین کے درجہ کا انتظار تھا۔ چنانچہ مولانا اشرف علی نے حسبِ ارشاد سلسلۂ درس وتدریس جاری رکھا۔ آخرکار ۱۳۱۰ھ میں اس اشتیاق نے اس درجہ بے چین و مضطرب کر دیا کہ کسی طرح سکون ہی نہ ہوتا تھا۔ اس کیفیت کو صوفیہ کی اصطلاح میں شوق سے تعبیر کرتے ہیں لہٰذا آپ نے چھ ماہ تک مکہ معظمہ میں حاجی صاحبؒ کے پاس قیام کرنے کا پختہ

ارادہ کر کے درس و تدریس کے مشاغل سے خود کو فارغ کر لینے کا اہتمام کیا اور جلد ہی اس میں کامیاب ہو گئے اور پھر کچھ عرصے بعد پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

مرکز پر پہنچنا تھا کہ سارا اضطراب سکون میں بدل گیا اور اب وہ کیفیت رو نما ہوئی جسے صوفیہ کی اصطلاح میں اُنس کہتے ہیں۔ حاجی صاحبؒ مولانا اشرف علی کے مکہ پہنچنے سے ایسے مسرور ہوئے اور اس درجہ محبت اور شفقت سے پیش آئے کہ دوسروں کو حسد ہونے لگا۔ چند ہی دنوں میں باہم ایسی مناسبت ہوئی کہ حاجی صاحبؒ بے ساختہ فرمانے لگے: "میاں اشرف علی" بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔" مولانا کی کوئی تقریر سُنتے یا تحریر دیکھتے تو خوش ہو کر فرماتے "تم نے تو بس میرے سینے کی شرح کر دی۔" اگر دورانِ علوم و معارف کوئی سائل حاجی صاحبؒ سے کچھ دریافت کرتا، تو خود جواب دینے کے بجائے مولانا اشرف علی کی طرف اشارہ فرما دیتے کہ ان سے پوچھ لو، یہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔

غرض اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر سبھی باطنی دولتوں سے مالامال ہوئے، اور توحید کا انکشاف بدرجہ کمال ہوا جو شریعت اور طریقت کی گویا بنیاد اور مغز درویشی اور جس کا ثمرہ لازمی عبدیت ہے اور یہی سلوک کا سب سے اعلیٰ مقام ہے اور یہی دولتیں ہیں جن کے حضرت حاجی امداد اللہؒ خاص طور سے حامل تھے۔

مولانا پر حاجی صاحبؒ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی پوچھتا یہ کون ہیں؟ تو فرماتے، میرے پوتے ہیں۔ مولانا کا بیان ہے کہ کوئی دُور کا رشتہ بھی

حاجی صاحبؒ نے فرمایا تھا جس کی بنا پر مجھے اپنا پوتا کہتے تھے اسی محبت اور شفقت کا باعث تھا کہ مولانا کے لئے کوئی تعظیمی لفظ مولوی وغیرہ کا استعمال نہ کرتے، بلکہ نام سے پہلے میاں کا اضافہ فرما کر خطاب کرتے۔ ایک مرتبہ ٹھنڈا پانی پی کر فرمایا، میاں اشرف علی، پانی جب پینا ٹھنڈا پینا تاکہ ہر بُن مو سے الحمدللہ نکلے، ورنہ زبان تو الحمدللہ کہے گی، دل الحمدللہ کہنے میں شریک نہ ہوگا۔ یہ بھی بشارت دی کہ تم کو تفسیر اور تصوف سے خاص مناسبت ہوگی۔

غایت خصوصیت کی بنا پر رخصت کے وقت حاجی صاحبؒ نے اپنا کتب خانہ مولانا کے سپرد کرنا چاہا، لیکن مولانا اشرف علیؒ نے عرض کیا کہ حضرت کتابوں میں کیا رکھا ہے، اپنے سینۂ مبارک سے کچھ دولت عطا فرما دیجئے۔ یہ سُن کر حاجی صاحبؒ کو جوش آگیا اور فرمایا: ہاں میاں ہاں۔ سچ تو ہے۔ کتابوں میں کیا رکھا ہے ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کُن

سینہ را از نورِ حق گلزار کُن

تقریباً چھ ماہ مکہ معظمہ میں حاجی صاحب کے پاس قیام کے بعد مولانا نے اپنے شیخ عالی مرتبت سے رخصت چاہی۔ عارف باللہ حاجی صاحب نے بطور خاص دو وصیتیں فرمائیں۔

(ا) دیکھو میاں اشرف علی، ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی۔ جلدی نہ کرنا۔

(ب) کبھی مدرسہ کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو جاؤ، تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا، توکل علی اللہ تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔

گویا ۱۳۰۸ھ میں جس ترکِ تعلق کو منع فرمایا تھا، اب حصولِ تمکین کے بعد خود اس کے ترک کا مشورہ دے رہے ہیں جب مولانا واپس تشریف لے آئے تو حاجی صاحب گاہ گاہ حاجیوں کی زبانی مولانا کو اس عنوان سے سلام کہلوا کر بھیجا کرتے کہ ہمارے مہین مولوی سے سلام کہہ دینا۔ مہین سے مراد دقیقہ رس، نکتہ شناس اور لطیف المزاج۔ اس سے حاجی صاحب کی اعلیٰ درجے کی بصیرت باطنی ظاہر ہوتی ہے۔ اس چھ ماہ کے قیام میں حاجی صاحب نے نہ صرف باطنی دولتیں مولانا کو ودیعت فرمائیں بلکہ بیعت کی اجازت بھی عطا ہوئی اور اپنا جانشین وخلیفۂ خاص بنا کر منصبِ ارشاد و تلقین پر متمکن فرمادیا۔

اللہ اللہ وہ کیسی مسعود و مبارک ساعت تھی جس میں ایک قطب الارشاد حکیم الامت، مجدّدِ دین و ملّت ایک شیخ العرب والعجم کے دستِ مبارک سے دنیا سے اسلام سے رسوم و بدعات کو مٹانے، اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دکھانے، مسلمانوں کو افراط وتفریط سے ہٹانے، جادۂ مستقیم پر لانے، علوم ومعارف کے دریا بہانے، عوام وخواص سب کو مستفید فرمانے، فیوض وبرکاتِ ظاہری و باطنی مشرق ومغرب میں پھیلانے، بڑے بڑے عقدہائے لاینحل اور پیچیدہ پیچیدہ مسائل علمیہ وعملیہ کی گتھیاں سلجھانے، بندگانِ خدا کو صحیح آدابِ عبدیت اور اصولِ معاشرت سکھانے، مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان اور انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانے، اہلِ دنیا کے قلوب میں اہلِ دین کا سکّہ بٹھانے، تہذیبِ اسلامی کی خوبی ومتانت کو

عالم آشکارا کرنے اور تہذیبِ نو کی نظر فریب چادر زنگار کو پارہ پارہ کرکے اُس کی دھجیاں اُڑانے، نئی روشنی کی مخفی ظلمات کھُلی آنکھوں دکھلانے، بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھکانے، شبہات جدیدہ کو اصولِ منطق و فلسفہ ہی کی بنا پر باطل ٹھہراتے۔ بڑے بڑے مدعیان منطق و فلسفہ سے کتاب و سنّت کے احکام و عقائدِ حقہ منوانے، ہزاروں بے نمازیوں سے نماز پڑھواتے، سود خوروں سے سود اور ناجائز آمدنی والوں سے ناجائز آمدنیاں ترک کرانے، اہلِ حق کے حقوق دلوانے، صدہا اہلِ معاصی سے ظاہرہ و باطنہ معاصی چھڑاتے، انتہائی مہلک امراضِ روحانی کے سہل سہل اور تیرِ بہدف معالجات اور نادر طریق اصلاح بتانے، باریک باریک مکائدِ نفس سُلجھانے، تصوّف کے تن پر صدیوں سے جمی ہوئی مصنوعی عبا و قبا اُتروانے اور اصلی خرقۂ دیرینہ پہنانے، سالکین کو سلفِ صالحین کے برگزیدہ اور کتاب و سنت کے مطابق پھر چلانے، ہزارہا مایوسین کی ڈھارس بندھانے اور صدہا طالبین کو محبوبِ حقیقی تک پہنچاتے اور ہر شعبۂ دینی سے متعلق ہر ضروری خدمت بر احسن وجوہ بجالانے کے لئے سر پر آرائے منصبِ ارشاد ہوا۔

مولانا اشرف علی مکہ معظمہ گئے تھے اس حالت میں کہ نوجوانی تھی خداداد جمال و جلال ایساکہ طالب علمانہ سادگی کے باوجود ہر نظر میں سماتے اور ہر دل میں اُتر جاتے تھے، مگر شش ماہا قیام کے بعد جب لوٹے ہیں، تو عشق کے ہاتھوں عجب حال ہوچکا تھا، دیکھنے والے دیکھتے تھے اور حیرت کرتے تھے

کہ یا اللہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ رنگ ہی کچھ اور تھا۔ خواجہ مجذوبؒ نے اپنے والد کا ایک قول "اشرف السوانح" میں یوں نقل کیا ہے:۔

فرماتے تھے۔ ہم نے مولانا کا ایک تو وہ زمانہ دیکھا تھا کہ نہایت سرخ وسفید ہشاش بشاش، خوبصورت اور چمکتے ہوئے پٹے دار بال، خوش لباس ایسے کہ گویا ہر وقت دُولہا بنے رہتے تھے اور جوانی کا وہ عالم تھا کہ گویا شباب پھٹا پڑتا ہے، پھر وہ زمانہ بھی دیکھا کہ جب حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں قیام کرنے کے بعد تشریف لائے کہ چہرہ بالکل زرد اور اُداس، پژمردہ، ژولیدہ حال، نہ بالوں میں تیل کا اہتمام نہ کنگھی کا التزام نہ اچکن نہ انگرکھا نہ چمک نہ بیل بوٹے۔ صرف سادہ کُرتا اور پاجامہ۔

غرض واپسی کے کچھ عرصے بعد پھر شوقِ الٰہیہ کی کیفیت نہایت جوش وخروش سے وارد ہوئی مگر اب کی بار کچھ اور نقشہ تھا۔ پہلے اضطراب تھا، اب اشتیاق، جب پریشانی تھی، اب فرحت، اُس وقت کلفت تھی، اب لذّت..... وہ سیر الی اللہ تھی۔ وہ زمانِ ہجر تھا، یہ زمانِ وصال، وُہ دورِ حسرت تھا، یہ دورِ شوق، وہ تلوین تھی یہ تمکین، وہ حالت مشاہدے سے پہلے کی تھی، یہ بعد کی۔ وہ اثرِ عشق تھا، یہ اثرِ حُسن۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے کا رنگ ہی بدل گیا، درسی کتابوں کا سبق ہو رہا ہے اور تصوّف کے مضامین عالیہ ارشاد ہو رہے ہیں، طالب علموں پر وجد طاری ہے یہاں تک کہ بہت سے مدرّسین اور طلبہ نے ذکر وشغل شروع کر دیا۔ مدرسہ خانقاہ ہو گیا۔ اس زمانے میں جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ خود مولانا فرماتے تھے، بس یہ جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو ذاکر وشاغل اور

ولیٔ کامل بنا دوں"۔ یہ وہی کیفیت تھی جس کی پیش گوئی حاجی صاحبؒ نے مولانا کو رخصت کرتے وقت فرمائی تھی۔

غرض سارے مشاغل سے دل سرد ہو گیا۔ کہاں کا درس اور کیسا وعظ؟ اہلِ کانپور جو آپ کے مواعظ کے دلدادہ تھے، بے تاب ہو گئے۔ ایک مرتبہ بڑا جلسہ تھا، بیرونی علماء بھی آئے ہوئے تھے، لوگوں نے وعظ کے لئے مولانا سے اصرار کیا۔ اکابر علماء کو دیکھ کر نہ انکار ہوتا تھا نہ اپنی حالت کے پیش نظر اقرار ممکن تھا جب کچھ بن نہ آیا، تو گردن جھکا کر بے اختیار رونے لگے۔ اس طرح ایک اور موقع پر شاہ سلیمان صاحب پھلواریؒ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے کانپور والوں نے عرض کی کہ وہ مولانا کو لب کشائی پر آمادہ کریں، تو شاہ صاحب نے عجیب جواب دیا۔ فرمایا: "اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا، تو بس منبر پر بیٹھتے ہی اُس کے مُنہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا، وہ انا الحق ہو گا۔ ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں"۔ شاہ صاحبؒ کی اس رائے کی تصدیق بعد میں خود مولانا نے بھی یوں فرمائی کہ اُس زمانے میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا اس لئے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے اور عوام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچے۔

اتفاقاً انہی دنوں کوئی صاحب مکۂ معظمہ جا رہے تھے۔ مولانا نے اُن کے ذریعے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پورا حال لکھ بھیجا جب یہ عریضہ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا، تو اُن کا یہ عالم تھا کہ کبھی گھر میں تشریف لے جاتے اور کبھی باہر نکل آتے اور بار بار فرماتے، جوان آدمی ہیں۔ غلبہ ہو گیا

ہے، تحمل نہیں ہو سکا، مگر میں تو اتنی دُور ہوں کیا کروں؟ عریضہ لے جانے والے صاحب نے عرض کیا کہ حضرت، میں جلد ہی واپس جانے والا ہوں۔ یہ سُن کر حاجی صاحبؒ بہت خوش ہوئے اور جواب لکھ کر ان کے حوالے کیا اور فرمایا: میاں اشرف علی سے کہنا کہ جب تک تمہارا خادم زندہ ہے، کیوں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہو۔

جب یہ پیغام لے کر وہ صاحب ہندوستان آئے اور مولانا اشرف علی کو ان کے آنے کی اطلاع ملی، تو عین دوپہر کے وقت مشتاقانہ اُن کے گھر پہنچے۔ انہوں نے حاجی صاحبؒ کا والا نامہ حوالے کیا اور زبانی پیغام بھی دیا۔ اِس کا جو اثر ہوا، وہ خود مولانا کی زبانی سُنیئے:

حضرتؒ کا پیغام سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دہکتے ہوئے تنور پر کسی نے بھری ہوئی مشک چھوڑ دی اور جلتے ہوئے سینے پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا۔ عصر تک نصف سے بھی کم پریشانی رہ گئی اور مغرب تک تو بس مطلع بالکل صاف تھا۔

سنہ ۱۳۱۵ھ کے اختتام تک مولانا نے ٹھان لیا کہ بس اب خانقاہ تھانہ بھون ہی کو اپنا گوشۂ عافیت بنایا جائے۔ کانپور میں درس و تدریس کا شغل اختیار کئے چودہ برس بیت چکے تھے اور تعلقات سے وحشت ہوتی تھی۔ اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ کی وصیت یاد آئی کہ اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ ہو جاؤ، تو پھر توکل بخدا تھانہ بھون ہی میں جا کر بیٹھ جانا۔ خانقاہ تھانہ بھون حضرت حاجی امداد اللہؒ، حضرت حافظ ضامن شہیدؒ اور حضرت شیخ محمد محدث تھانویؒ کی برکات سے "دُکانِ معرفتؒ" کہلاتی تھی اور مولانا اشرف علی کو اب اپنی طرف

پوری قوت سے کھینچ رہی تھی۔ آخر نہایت خوش اسلوبی سے اہل کانپور کو ناراض کیے بغیر مولانا ۱۳۱۵ھ میں وہاں سے نکلے اور تھانہ بھون پہنچ کر حاجی صاحبؒ نے اس کی اطلاع دی۔ وہاں سے جواب آیا "بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے آئے۔ امید ہے آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔ آپ ہمارے مدرسے کو از سر نو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے"۔ چنانچہ پیر و مرشد کے ارشاد کی تعمیل میں ۱۳۱۵ھ سے مولانا اشرف علی کا وہ دَور شروع ہوتا ہے جو زندگی کے آخری سانس تک باقی رہا یعنی مستقل قیام تھانہ بھون۔ اس "دکانِ معرفت" کی رونق شیخ محمد محدث تھانویؒ کی رحلت، حافظ ضامنؒ کی شہادت اور حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی ہجرت کے سبب ماند پڑ چکی تھی مولانا کی وجہ سے پھر رونق پر آگئی۔ اس دور میں مولانا خود سراپا سوز و گداز تھے، اس لئے جو آتا سوختہ و گداختہ ہو جاتا۔ آپ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے اصلاحِ باطن کے کام میں مشغول رہے اور سلوک کی منزلیں طے کرتے گئے۔ کتنی ہی گھاٹیوں سے اُتارے گئے اور چڑھائے گئے۔ اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آپ کو ایک اعلیٰ ترین مقام پر فائز کرے اور اس راہ کی دشوار ترین گھاٹی سے بھی گذار دے تاکہ پھر دوسروں کی رہبری میں آپ کو حیرانی و پریشانی نہ ہو اور یہ مقام خوف و رجا تھا جسے "ہیبتِ انس" بھی کہتے ہیں۔ اس میں کبھی "ہیبت"، اور کبھی "انس"، کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ کیفیت ایک برس تک رہی، الحاصل وہ مرتبہ ملا جسے "عبدیت" کہتے ہیں اور جس کی لازمی صفت بندگی و سرافگندگی ہے۔ اس مرحلے سے گذرنے کے بعد "مسندِ ارشاد" پر مستقلاً جلوہ فرما ہوئے اور ہمہ تن تزکیۂ

تصفیۂ خلق کے کام میں مشغول ہو گئے۔

مشہور نعت گو شاعر حضرت محسن کاکوروی ؒ کے فرزند مولانا نور الحسن کا ایک خواب درج ہے۔ اس سے مولانا اشرف علی کے منجانب اللہ مقامِ ارشاد پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے مجدّد ہونے کی بشارت ملتی ہے۔ میں نے سفرِ حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ کے متعلق ایک خواب دیکھا، حالانکہ اس زمانے میں مجھ کو حضرت مولانا سے کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی، البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا۔ غرض مجھ کو مدینہ طیبہ میں مولانا کا کوئی بعید سے بعید خیال بھی نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھانوی تیمارداری فرما رہے ہیں اور ایک بزرگ دُور بیٹھے ہوئے دکھائی دیے جن کے متعلق خواب ہی میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں۔ آنکھ کھلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو کیا بیمار ہیں، حضورؐ کی امت بیمار ہے اور مولانا تھانوی اس کی تیمارداری اور اصلاح فرما رہے ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ دُور بیٹھے ہوئے وہ بزرگ طبیب کون تھے۔ ہندوستان واپس آن کر میں نے مولانا تھانوی کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی تھی، وہ بھی لکھ دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ سمجھ میں نہیں آیا وہ بزرگ طبیب کون تھے جو دُور بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں اور چونکہ ابھی زماناً بعید ہیں، اس لئے خواب میں مکاناً بعید دکھائی دیے۔

اسی طرح کا ایک اور واضح خواب مولانا تھانوی کے ایک خلیفۂ مجاز حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری ؒ نے دیکھا تھا۔ وہ خواب یوں ہے۔

"کچھ عرصہ ہوا۔ تقریباً ۱۳۵۰ھ کا ذکر ہے۔ خانقاہ (امدادیہ تھانہ بھون) کی مسجد کے وسط میں بیت اللہ شریف اور حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ پاک دیکھا کہ دونوں بالکل قریب قریب ہیں اور بیت اللہ شریف غالباً حضرتِ والا (مولانا تھانوی) کی سہ دری کی طرف ہے۔ لیکن روضۂ پاک بھی بیت اللہ شریف ہی کی شکل کا ہے، یعنی اس پر گنبد نہیں ہے۔ بیت اللہ شریف اور روضۂ پاک دونوں پر اس قدر سبز اور خوبصورت غلاف ہیں کہ دنیا میں ان کی نظیر نہ ہو گی اور دونوں پر شعاعیں اور انوار معلوم ہوتے ہیں حضرتِ والا بیت اللہ شریف کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور اس قدر خوش ہیں کہ ایسا ہشاش بشاش میں نے حضرت والا کو کبھی نہیں دیکھا۔ نیز ایک کھجور کی ٹہنی بطور جھاڑو کے دستِ مبارک میں لیے ہوئے ہیں جس کی ڈنڈی میں دستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر شاخیں نکلی ہوئی ہیں اور یہ ارادہ فرما رہے ہیں کہ بیت اللہ شریف اور روضۂ پاک کے اردگرد جو غبار ہے، اُسے دُور فرمائیں۔

چنانچہ مولانا نے تھانہ بھون کے گوشے میں بیٹھ کر اور دنیائے دُوں کو ٹھکرا کر مسلمانوں کی جو حقیقی خدمت انجام دی اور اس ذریعے سے ان کے قلوب کی جو پادشاہی حاصل کی وہ کم کسی کے نصیب میں آتی ہے۔ صرف ہندوستان کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب ہی سے نہیں، ایران کے سبزہ زاروں، افریقہ کے ریگستانی ساحلوں اور برطانیہ کی تاریکیوں سے بھی روشنی کے طالب

آئے اور اس شمع ضیا پاش سے اپنی اپنی بساط بھر روشنی لے گئے۔ وہ بھی آئے جن کی پیاس اور چشموں سے نہ بجھتی تھی اور اس دریائے پر آب نے انہیں سیراب کر دیا۔

مریدین اور معتقدین کی آمد سال کے بارہ مہینوں میں ایسی متواتر اور مسلسل رہتی تھی کہ حکومت نے اس کی وجہ سے قصبہ تھانہ بھون کو ایک مستقل ریلوے اسٹیشن قرار دیا اور اس "دکانِ معرفت" پر خریدارانِ علم و عرفان کا وہ ہجوم ہوا جو حضرت سلطان الاولیاء قدس سرہٗ اور حضرت مجدد الفِ ثانی قدس سرہٗ کے بعد تاریخِ ہند میں شاید اپنی نظیر آپ تھا۔

مولانا کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اُن کے اوصاف و محامد میں جس صفت پر سب سے پہلے مبصر کی نگاہ جاتی ہے، وہ کمال درجہ کو پہنچی ہوئی جامعیت ہے۔ مولانا ہی کے خلیفہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ ہیں۔" وہ قرآن پاک کے حافظ ہیں، مترجم ہیں، مجوّد ہیں، مفسّر ہیں، اس کے علوم و حکم کے شارح ہیں، محدث ہیں، فقیہ ہیں، مفتی ہیں، خطیب ہیں، واعظ ہیں، صوفی ہیں۔ انہوں نے تصوف کے اسرار و غوامض کو فاش کیا ہے۔ ان کی مجلسوں میں علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے اور یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں، وہ ملفوظات ہیں۔ وہ ایک مرشدِ کامل ہیں، وہ مصلحِ امت ہیں، غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی کم ایسی مذہبی ضرورت ہوگی جس کا مدار اس حکیم الامت نے اپنی زبان و قلم سے تعیین فرمایا اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعے کے

بعد ہی نظر میں آسکتا ہے۔ ان کی تصنیفات ملک کے پورے طول و عرض میں پھیلیں اور ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کا باعث ہوئیں۔ اُردو عربی کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے ذوق سے ان کی متعدد تصانیف کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی کیا، چنانچہ متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی، بنگالی، گجراتی اور سندھی میں شائع ہوئے۔

ان تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں، آٹھ نو سو کے قریب ہے۔ ۱۳۵۴ھ میں ایک صاحب نے مولانا کی تصانیف کی فہرست شائع کی تھی جو بڑی تقطیع کے پورے ۸۶ صفحوں میں آئی ہے۔ اس کے بعد کے نو برسوں میں جو تصانیف ترتیب پائیں، وہ اس تعداد کے علاوہ ہیں۔ علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیے جائیں، تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے۔ امام جریر طبریؒ، حافظ خطیب بغدادی، امام رازیؒ، حافظ ابن جوزی، حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام اس سلسلے میں لئے جاسکتے ہیں۔ برِصغیر میں مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نام بھی اسی سلسلے میں داخل ہیں اور آخری نام مولانا اشرف علی تھانوی کا ہے۔ مولانا کی تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فقہی ہے۔ مذہبی تصانیف میں علوم القرآن، علوم الحدیث، الکلام و عقائد، فقہ و فتاویٰ اور سلوک و تصوف اور مواعظ اکثر ہیں۔ فنِ تجوید اور قرأت پر مولانا نے دس کتابیں لکھی ہیں۔

تفسیر بیان القرآن بارہ جلدوں میں ہے اور پورے قرآن پاک کی تفسیر ہے جسے ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا۔ اس کی بیشمار خصوصیتیں ہیں جن میں سے چند یہ ہیں، سلیس و بامحاورہ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ نیچے "ف" کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر، تفسیری روایاتِ صحیحہ اور اقوالِ سلفِ صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی ہے، شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کُتبِ تفاسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہلِ علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں اور حاشیے پر عربی میں اعتبارات وحقائق ومعارف الگ لکھے گئے ہیں۔ ماخذوں میں سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر روح المعانی پر اعتبار فرمایا گیا ہے یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقۃً مفید ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے، اس لئے قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف ومنتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں۔

علوم الحدیث میں مولانا کی تالیفات "حقیقۃ الطریقۃ" "التشرف (چار جلدیں) جامع الآثار، خطبات الاحکام، مناجاتِ مقبول وغیرہ مشہور ہیں علوم الفقہ میں حوادث الفتاویٰ، بہشتی زیور (دس جلدیں) فتاویٰ اشرفیہ، بہشتی گوہر (مردوں کے لئے) تصنیف فرمائیں۔ علومِ سلوک وتصوف میں قصد السبیل، نہایت عمدہ رسالہ ہے۔ مولانا نے کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔ دوسری

تالیف التکشف پانچ جلدوں میں ہے، مثنوی مولانا روم کی شرح کلید مثنوی، دیوان حافظ کی شرح عرفانِ حافظ، طالبین و سالکین کی تربیت کے لئے تربیۃ السالک جس کی ضخامت بارہ سو بہتر صفحات ہے۔

مولانا اشرف علی کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ جلدوں اور رسائل میں مدوّن ہوا ہے اور ہر ایک ملفوظ خود مولانا کی نظر سے گزار کر چھاپا گیا ہے۔ ان گرانقدر ملفوظات میں بزرگوں کے قصے، سنجیدہ لطیفے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائل فقیہ کے بیانات، سلوک کے نکتے، اکابر کے حالات، طالب علموں کی ہدایات و تنبیہات، آداب و اخلاق کے نکات، اصلاحِ نفس و تزکیہ کے مجربات اس خوبی سے درج ہیں کہ اہلِ شوق کے دل اور دماغ دونوں اس آبِ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔

اصلاحیات میں مولانا کی سب سے اہم چیز "مواعظ" ہیں جو شہر بشہر ہوئے اور انہیں ضبطِ تحریر میں لفظ لفظ لایا گیا، پھر حضرت مولانا کی نظر سے گزار کر دوسرے مسلمانوں کے عام فائدے کی غرض سے شائع کیا گیا۔ تقریباً چار سو مواعظ ہیں جو احکامِ اسلامی، ردِّ بدعات، نصائح دلپذیر اور مسلمانوں کے لئے مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں۔ مواعظ کے علاوہ اسی سلسلے کی اہم کڑی مولانا کی کتاب "حیوٰۃ المسلمین" ہے جس میں قرآن مجید اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی و دنیاوی ترقی اور فلاح کا مکمل پروگرام مرتب فرمایا ہے۔ حضرت نے بارہا ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اپنی ساری کتابوں میں اس کتاب کو اپنے

لئے ذریعۂ نجات گمان کرتا ہوں۔

غرض خانقاہِ امدادیہ میں بوریے پر بیٹھ کر کامل نصف صدی تک مولانا نے مسلمانوں کی تربیتِ اخلاق، اصلاح اور علمی تحقیق کا جو کام کیا، وہ کسی اور سے نہ ہو سکا۔ ممکن ہے خانقاہ کے لفظ سے بعض حضرات کا تصور کسی اور جانب چلا گیا ہو، لیکن یہ خانقاہ نہ تھی جس میں جوگیانہ رسوم ورواج کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور دین واخلاق اور معاشرت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں چند خانقاہیں ایسی ضرور رہیں جہاں تربیتِ اخلاق کا عظیم الشان فرض ہمیشہ انجام پاتا رہا ہے اور یہاں آکر بڑے بڑے اہلِ علم نے اپنے غرورِ علمی کو، بڑے بڑے امراء نے اپنی نخوتِ دولت وجاہ کو اور کثّر دنیا داروں نے اپنی حبِ دنیا کو دُور کیا ہے اور اس روح پرور ماحول میں رہ کر صبر و شکر، ایثار و تواضع، توکل و قناعت اور اخلاص و ہمت کے اعلیٰ انسانی صفات سے اپنے اندر پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ کون کہہ سکتا ہے کہ گذشتہ نصف صدی تک گنج مرادآباد میں شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے واسطے سے بھوپال میں شاہ ابواحمد صاحبؒ کے قیام سے اور حیدرآباد، دیوبند اور سہارنپور میں حضرت حاجی امداد اللہؒ، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے قیام سے اور حیدرآباد دکن میں شاہ سعداللہ صاحب مجددی کے وجود سے یہی دینی ماحول نہ تھا، اور حقیقی خانقاہیت موجود نہ تھی، دورِ حاضر کی آخری کڑی خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون تھی جہاں

حکیم الامّت مولانا اشرف علیؒ کے ذریعے تعلیمِ اخلاق و تزکیۂ نفس کا ایک عظیم الشان اور وسیع ترین کام انجام پایا جو موجودہ حالات میں کہیں انجام نہیں پا رہا تھا۔

تھانہ بھون کی فضا اللہ والوں کے اجتماع اور اُن کی پرخلوص طاعتوں کے باعث ایسی پُرنور اور روح پرور ہوگئی تھی کہ جو شخص بھی چند روز یہاں قیام کرتا، اس کی کایا پلٹ جاتی۔ کتنے جنٹلمین یہاں آکر ایسے ہوگئے کہ مولوی بھی اُن کے تقویٰ و طہارت سے شرمانے لگے اور کتنے علماء یہاں پہنچ کر عقلی کاوشوں سے نجات پاگئے اور یقینِ کامل کے سرمایہ سے مالامال ہوگئے اور دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی سدھار لی۔ کتنے اخلاق کے کچے معاملات کے کھوٹے یہاں تربیت پاکر معلّمِ اخلاق و معاملات بن گئے، کتنے ناآشنائے حقیقت محض کشف و کرامات اور الوان و لطائف کے حصول میں جان کھپانے والے آئے اور یہاں آن کر اُن پر دین کی اصل حقیقت کھُل گئی اور محض رضائے الٰہی کا حصول اُن کا مدّعا بن گیا۔ اِس خانقاہ پر انوارِ الٰہی کی جو بارش ہوتی تھی، اس کو لوگوں نے محسوس ہی نہیں کیا، بلکہ بعض نے کھُلی آنکھوں اس کا مشاہدہ بھی کیا۔ حضرت مولانا حافظ جلیل احمد صاحب علی گڑھی مولانا تھانوی کے خلیفہ تھے، ایک مرتبہ رات کو ٹرین سے تھانہ بھون آئے۔ جب ٹرین خانقاہ کے محاذ سے گزر رہی تھی تو انہوں نے صاف دیکھا کہ خانقاہ کی مسجد کے گنبد سے آسمان تک نور کا تار بندھا ہوا ہے۔

حضرت مولانا کی مجدّدانہ شان کا یہ وصف بہت ممتاز ہے کہ آپ نے

اپنی خارجی و داخلی زندگی کا ایسا اصولی نمونہ پیش کیا کہ دنیا جان گئی کہ اہلِ حق
ایسے بھی ہوتے ہیں۔ خانقاہِ امدادیہ میں وہ سارے اصول برتے جاتے تھے
اور ان پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا جن پر ایک استاد و شاگرد اور پیر و مرید کے
زیادہ سے زیادہ افادے کا مدار ہے۔ یہ اسی اصول پسندی کا اعجاز تھا کہ
تنہا حضرت تھانوی نے علمی و عملی وہ وہ نقوش چھوڑے اور اس کثرت سے
چھوڑے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور اہلِ علم یہ جانتے ہیں کہ یہ سب اصول
معلمِ اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ماخوذ و مستنبط تھے۔

(۲) چراغِ محفل

تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ میں حکیم الامتؒ کے شب و روز جس عالم میں گزرتے تھے، اگر اُس کا ہلکا سا نقشہ یہاں پیش کر دیا جائے، تو مضائقہ نہ ہوگا کہ اس مضمون کی اصل غرض و غایت یہی ہے۔ قارئین دیکھ لیں اور جان جائیں کہ ایک مصلح، ایک شیخ، ایک مصنّف، ایک معلّم، ایک مفسّر ایک واعظ اور ان سب سے بڑھ کر ایک انسان، ایک مسلمان اور ایک مردِ مومن کے شب و روز کیسے ہوتے ہیں بقول مولانا عبدالماجد دریاآبادی حضرتِ شیخ کے کمائل و فضائل اپنی جگہ پر، بہر حال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان تو اسی صدی میں ہوئے ہیں۔ اُن کی عُمر کے آخری پندرہ سولہ سال کے زمانے میں اس نامۂ سیاہ کو اُن سے نیاز اور اپنی بساط کی حد تک گہرا نیاز حاصل رہا اور اس نے اپنے لمبے تجربے اور سابقے میں انہیں ایک بہترین انسان پایا اور چونکہ اُن کی انسانیت ان کے مفسر و فقیہہ و درویش ہونے سے الگ بھی نہیں کی جاسکتی اس لئے ضمناً ذکر ان کے علم و فضل اور تفقّہ و سلوک کا بھی ناگزیر ہوگیا ؏ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

اِن پندرہ سولہ برسوں میں عبدالماجد دریاآبادی مرحوم نے مولانا اشرف علی کو کیسا پایا، اس کی تفصیل انہوں نے اپنی ضخیم تالیف "حکیم الامت" میں بیان فرمائی ہے۔ مولانا تھانوی کی زندگی کے آخری پندرہ برسوں کا ایک نرالا مرقع ہے اور اس میں فقہ، تفسیر، حدیث، سلوک و کلام اور ادب و حکمت

کے صدہا مضامین سمٹ آئے ہیں۔ مولانا عبدالماجد کی، حکیم الامتؒ سے پہلی ملاقات کا احوال بڑا دلچسپ ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اِن دنوں خانقاہ میں مولانا تھانوی کی آمد و رفت، نشست و برخاست، مہمانوں، طالبینِ اصلاح اور اپنے ہمعصروں سے ملاقاتوں کے کیا طور طریق اور ضابطے قائم تھے۔ مولانا عبدالماجد کچھ عرصہ قبل ہی کفر و الحاد کی وادیوں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد نئے سرے سے اسلام پر ایمان لائے تھے اور اب زور شور سے اسلام کی تبلیغ اور اپنی اصلاح کے کام میں مشغول تھے۔ اس زمانے میں اُن کا اخبار ہفتہ وار "سچ" باقاعدگی سے نکلتا تھا اور اسی اخبار کی ایک اشاعت میں "مرشد کی تلاش" کے عنوان سے ایک مضمون بھی اُن کے قلم سے نکلا تھا اس کے بعد ہی اُن کی رسائی آستانۂ اشرفیہ تک ہوئی۔ مولانا تھانوی سے اوّلیں ملاقات کیسے ہوئی۔ یہ مولانا دریابادی سے سنیے :۔

"مہینہ یہی جولائی کا تھا۔... ہائے یہی مہینہ جس نے پندرہ سال بعد دل و جگر خون کر ڈالا..... تیس جون ۲۸ء کی شب تھی کہ سہارنپور شاہدرہ لائن کے قدیم اسٹیشن تھانہ بھون پر تین مسافروں کا ایک مختصر سا قافلہ کوئی دس ساڑھے دس بجے اترا۔ سالارِ قافلہ دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحبؒ اور باقی دو میں سے ایک مولانا عبدالباری ندوی (استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) اور دوسرا یہ نامۂ سیاہ "سچ" کا ایڈیٹر "ہمدرد" دہلی کا ڈائریکٹر اور صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کا صدر ..... اُس وقت تک ٹاؤن کا اسٹیشن کھلا نہ تھا وہی پُرانا اسٹیشن تھا جو اب عوام کی زبان پر جلال آباد کے نام سے مشہور ہے

یہاں سے قصبہ تھانہ بھون کا فاصلہ کوئی تین میل کا ہوگا۔ تانگا کرایے پر کیا اور سنسان راستوں سے گزرتے کوئی آدھ گھنٹے میں قصبے کے اندر پہنچ گئے.... جذبات میں جب بجائے جزر کے مد ہو اور خیالات میں تلاطم ہو، تو یہی آدھ گھنٹہ کئی گھنٹوں کا معلوم ہوتے لگتا ہے۔ عقیدت تازہ بھی تھی اور تیز بھی۔ تخیل خوب خوب نقشے پیش کرتا رہا۔

تانگا خانقاہِ امدادیہ کے دروازے پر رُکا۔ امدادیہ کو یہاں کوئی صاحب انگریزی لفظ (CO-OPERATIVE) کا ترجمہ نہ سمجھ لیں جیسا کہ آگرے کے ایک مشہور شاعر چند سال ہوئے یہی سمجھے تھے، مولانا اشرف علی کے مرشد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا وطن بھی یہی قصبہ تھا۔ یہیں ان کا حجرہ اور مسکن تھا۔ حجرہ اب تک اُسی حالت پر قائم ہے اور صحن، مسجد، عمارت اور خانقاہ میں بہت زیادہ اضافہ کر کے مجموعے کا نام انہی کے اسم مبارک پر خانقاہ امدادیہ رکھ دیا گیا ہے۔ رات زیادہ جا چکی تھی۔ خانقاہ کا پھاٹک قدرۃً بند ملا۔ مولانا حسین احمد صاحب کی رفاقت پھر کام آئی۔ حکیم الامت کے ایک خادم کو ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے پڑوس کے ایک چھوٹے سے مکان میں تین چار پائیوں کا انتظام کر دیا۔ اب بقیہ رات کسی طرح گزارنا تھی۔ یکم جولائی کی مختصر سی رات، اُس کے گھنٹے بھی اب کے باقی رہ گئے تھے۔ عقیدت کا وفورِ جوش اتنے گھنٹے بھی کب سونے دیتا ہے۔ کچھ سوتے، کچھ جاگتے باقی رات بھی کٹ گئی اور نمازِ فجر کا ابھی بالکل اوّل وقت تھا کہ ہم لوگ "دیدارِ اشرف" کے لئے تیار ہو گئے۔

جس مکان میں مولانا تھانوی اُس وقت قیام فرماتے تھے، اس سے خانقاہ اور مسجد کوئی سو گز کے فاصلے پر ہوگی اور جہاں ہم لوگ رات کو ٹھہرائے گئے تھے، وہ حضرت کے کاشانے سے کوئی دس ہی گز کے فاصلے پر تھی اور حضرت کا راستہ اسی طرف سے تھا۔ میں اشتیاق کا مارا بہت تڑکے گھر سے نکل عین راستے پر ذرا کنارے ہٹ کر کھڑا ہو گیا کہ زیارتِ جمال پہلے یہیں ہو جائے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ آرزو پوری ہوئی۔ ایک بزرگ ادھر سے گُزرے۔ مسن، لیکن خوش رُو، نظریں نیچی، چال متین، نورانی چہرہ، نورانی داڑھی، زیادہ سفید کچھ سیاہ اور شاید اسی نورانیت کی مناسبت سے لباس بھی خوب سفید بُرّاق، سر پر نازک سی گول ابھری ٹوپی، جسم پر لمبا کُرتا نازک ونفیس غالباً تن زیب کا۔ تاریکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی تھا۔ نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقع نہ تھا اور کہنا چاہیئے کہ صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی تھی، اس پر بھی دل کشی، رعنائی، زیبائی بہ حیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی، دِل تو بے اختیار آواز دے ہی اُٹھا۔ ع

قربان یک نگاہِ تو عمرِ دراز ما

نماز ہوئی حضرت ہی نے پڑھائی۔ خود ہی پڑھانے کا معمول تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ بار بار امام بدلتے رہنے سے جماعت کے نظم میں فرق آجاتا ہے اکثر عادت فجر کے وقت کسی قدر طویل قراءت کی تھی مثلاً: سورۃ الدھر، یا المنافقون۔ صورت کی دلکشی کا تجربہ ابھی ہو چکا تھا، صوت کی دلکشی کا اندازہ اب ہوا اور غالبؔ کے دیوان سے ندا آئی ع:

وہ جنّتِ نگاہ، یہ فردوسِ گوش ہے

تجوید خود ایک مستقل فن ہے۔ اس کے معیار سے اظہارِ رائے صرف ماہرینِ فن کا کام ہے، یہاں ذکر آواز کی صرف دلکشی اور تاثیر کا ہے۔ اس عامیٔ محض کو اپنی عمر میں ہندوستان کے علاوہ عرب و مصر سے بھی آئے ہوئے اچھے اچھے قاریوں کو سننے کا اتفاق ہوا ہے، مشہور و غیر مشہور دونوں قسم کے بعض باکمالوں کی داد بھی دل کھول کر دی ہے، بعض سے طبیعت متاثر بھی بہت ہوئی ہے، لیکن اس درجہ مؤثر لہجہ یا اتنے خوبصورت بول شاید ہی کبھی کسی کے سننے میں آئے ہوں، ہر لفظ پہ معلوم ہوتا تھا کہ سانچے میں ڈھلا ہوا نکل رہا ہے اور پھر بالکل ہی سادہ اور بے تکلف۔ کہیں سے شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شخص فن کے قواعد کے لحاظ سے ادا کر رہا ہے۔ صاف یہی معلوم ہوتا تھا کہ قدرتی لہجہ اور طبعی لحن ہے۔ نماز کے طویل قیام میں میں بڑا کچا اور بودا ہوں، یہ قرأت اشرفی کا اعجاز تھا کہ طویل قرأت سے بھی جی اُکتانا کیسا، جی یہی چاہے گیا ابھی اور سنتے جائیے۔ اِدھر قرأت ختم ہوتی جاتی تھی اور اِدھر حسرت باقی رہی جاتی تھی۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی اور شاخ میں شاخ کیسی نکل آئی۔ ذکر اُس خاص نماز اور پہلی نماز کا تھا اور چھڑ گئی مولانا کی عام خوشنوائی کی داستان۔ نماز ختم ہوئی، سلام پھیرا، دعا مانگ کر جونہی حضرت اٹھے ہیں، نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی۔ ان کی طرف خود ہی بڑ تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات سے ملے۔ لوگ تو کہتے تھے بڑے خشک مزاج ہیں۔

خشک مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں؟ یہ نرم بشاش چہرہ، یہ ہنستا مسکراتا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو سکتا ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے اور ان کے درمیان بے لطفی ہے، ناچاقی ہے۔ کانوں نے بے شک یہی سنا تھا، لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں، دو دوست گلے مل رہے ہیں۔

مولانا حسین احمد نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ ہم سے بھی شگفتہ اخلاق و التفات سے پیش آئے۔ میں اتفاق سے چند ہفتے قبل ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوا تھا، حضرت نے کمال شفقت سے اس کا حوالہ دے کر خیریت دریافت فرمائی۔ میں دنگ کہ اس کی انہیں کیونکر خبر ہوئی۔ مجھے تو ہرگز توقع نہ تھی کہ میرا نام بھی کبھی حضرت کے کان میں پڑا ہوگا، رہی وہ ایک بار کی خط و کتابت، تو ایسے خط خدا معلوم کتنے روز ہی آتے رہتے ہوں گے۔ کس کس کے نام ذہن میں رہ سکتے ہیں، لیکن نہیں، نا واقفیت کیسی، یہاں تو میری تازہ علالت تک سے واقفیت و باخبری نکلی۔

خانقاہ میں آپ داخل ہو چکے ہیں اور نماز سے بھی اب فراغت ہو چکی ہے، تو ایک نظر اس عمارت پر بھی کرتے چلیے۔ خانقاہ کی عمارت قصبے کی بالکل مغربی سرحد پر ہے۔ کوئی دو فرلانگ پر ٹاؤن کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ قصبے کی اکثر پرانی شاندار عمارتوں کی طرح سڑک بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھرنجے کی ہے، عین خانقاہ کے دروازے تک آئی ہے، پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن، کنارے کنارے چاروں طرف پختہ برآمدہ اور ٹین کا سائبان اس سلیقہ مندی کے ساتھ کہ آدمی برسات میں ٹین کے نیچے نیچے

پورا چکر لگا لے، نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض زیادہ حصّہ پٹا ہوا، ایک لمبا حصّہ کھلا ہوا۔ لیکن بُرا معلوم نہیں ہوتا۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی آپ کو دونوں طرف غسل خانے ملیں گے۔ چھوٹے، لیکن ضرورت کے لئے کافی۔ جاڑوں میں پانی گرم کرنے کا انتظام موجود اور سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں۔ بروٹھا طے کر کے آپ اندرونی دروازے میں داخل ہوتے ہوئے، جوتے اُتار دیئے کہ صحنِ مسجد شروع ہو گیا، جوتا رکھنے کے لئے ایک چیڑ کا بڑا بکس کھُلا رکھا ہوا۔ اب آپ مشرق سے بائیں طرف یعنی شمال کی جانب مُڑے۔ یہیں کنواں، اُس کے آگے بیت الخلاء جانے کا راستہ، اس کے بعد مہمان خانے کا زینہ، مہمانوں کے لئے کمرہ کوٹھے پر، سادہ مگر ہوادار، گنجائش اتنی کہ چار مہمان بیک وقت میں چار پائیوں پر آسانی سے لیٹ سکیں۔ زینے سے چند ہی قدم اور چلے کہ اپنے دائیں ہاتھ کو یعنی مغرب کی جانب رُخ کرنا پڑا۔ ایک لمبا برآمدہ ملا۔ اس برآمدے میں دو سہ دریاں ہیں۔ پہلی سہ دری کے عقب میں کتب خانے کا کمرہ، دوسری سہ دری خاص حضرت کی نشست گاہ۔ ایک حجرہ اس کے عقب میں، دوسرا حجرہ اس کے مغربی کونے پر۔ یہی حجرہ حضرت حاجی صاحبؒ کا تھا۔ ایک کوٹھڑی اس کے جواب میں برآمدے کے مشرقی کونے پر۔ اب دوسری سہ دری سے نکل کر مسجد میں آ گئے۔ مسجد کچھ ایسی بڑی نہیں، لیکن بڑی پُر رونق اور پُر انوار۔ شکمِ مسجد کے بعد اُسی مغربی لائن میں دالان اور اس کے عقب میں طالبین و سالکین کے لئے حجرے۔ دالان میں ابتدائی تعلیم کے لئے لڑکوں کا مدرسۂ قرآنی۔ اس کے ختم پر زینہ اور کچھ اور حجرے۔ یہ سب

طالب علموں کے لئے ہیں۔ لیجئے مکان کی ناپ جوکھ میں ہم آپ کچھ ایسے محو ہوئے کہ مکین ہی کی طرف سے غافل ہو گئے۔

حضرت ہم تینوں کو لئے ہوئے صحنِ مسجد سے چار قدم چل کر بیٹھے۔ اب اخلاق و التفات ہم تینوں سے فرداً فرداً شروع ہوا۔ بار بار فرماتے تھے۔ اچھی طرح بیٹھیے، کھُل کر بیٹھیے۔ یہاں ہیبت شروع ہی سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ لطف و کرم کا ہر فقرہ اس کیفیت کی افراط میں اعتدال پیدا کرتا جا رہا تھا۔ خانقاہ میں طالبین و سالکین کا ایک گروہ ذکر و شغل میں مشغول ہمیشہ موجود رہا کرتا۔ مولانا کا معمول تھا کہ بعد نماز فجر سب سے پہلے انہی کے کام کی طرف متوجہ ہوتے۔ یہ لوگ اپنے حالات باطنی لکھ لکھ کر سہ دری میں لگے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال دیتے۔ حضرت خود اسے اپنے ہاتھ سے کھولتے، ایک ایک پرچہ پڑھ کر، ہر ایک کے مناسبِ حال اسی پہ جواب اور ہدایتیں لکھ، پرچوں کو مسجد کے منبر پہ رکھا دیتے، اس سے فارغ ہو کر کلام مجید کی تلاوت کرتے، حافظ قرآن ہونے کے باوجود اکثر چھوٹی حمائل ہاتھ میں لئے ہوا خوری کے لئے آبادی سے باہر نکل جاتے۔ آج یہ معمول کچھ دیر کے لئے ملتوی رہا۔ حضرت ہم لوگوں کی خاطر میں لگے رہے، چائے منگوائی، حالانکہ خود چائے نہیں پیتے تھے، پر شفقت مکالمت کا سلسلہ کوئی پون گھنٹے جاری رہا۔ اس کے بعد حضرت نے اپنے دوسرے معمولات پورے کرنے کے لئے ہم لوگوں سے رخصت چاہی، اس التجا اور لجاجت کے لہجے میں کہ گویا وہ چھوٹے ہیں اور ہم لوگ بڑے۔

دوسری نشست چاشت کے وقت شروع ہوئی۔ اس میں حضرت نے خوب کھُل کر باتیں کیں۔ مختلف بزرگوں کے واقعات، عام دینی ہدایات اخلاقی وروحانی مذاکرات، سب بڑے دلکش، دلچسپ، موثر انداز میں۔ واعظانہ خشکی کا نام ونشان نہیں۔ یہ نشست حضرت کی خاص سہ دری میں ہوئی۔ درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل ڈسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر حضرت تشریف فرما، ہاتھ میں تسبیح، ایک چھوٹی گھڑی سامنے ڈسک پر قلمدان وغیرہ کے ساتھ رکھی ہوئی۔ دوسری بڑی گھڑی، دھوپ گھڑی کے حساب سے دیوار میں لگی ہوئی۔ داخلہ والے در پر حضرت کا نظام نامۂ اوقات لگا ہوا۔ غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا۔ بیٹھنے بٹھانے، سب کے آداب قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے، ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ، ہر بات میں نظم اور آہنگ۔ یہ تو مجلس خاص اور خصوصی تھی، بعد ظہر مجلسِ عام میں بھی قاعدہ تھا کہ ہر شخص جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے، کسی دوسرے کو نہ اٹھائے نہ کھسکائے۔

یاد کر لیجئے کہ ۱۹۲۸ء تھا۔ باتیں خوب ہوئیں صبح اور دوپہر کی ملا کر طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا، گفتگو آئی، حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں دُور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت "گورنمنٹی" آدمی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان بوجھ کر یا بے جانے، بہرحال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خاص مسلمان کی گفتگو تھی، مسلمان بھی ایسا جو جوشِ دینی اور غیرتِ ملی میں کسی "خلافتی"

سے کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں، پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔

حضرت کی مالی و معاشی حالت اگر کچھ زیادہ اچھی نہ تھی تو بُری بھی نہیں کہی جاسکتی۔ بہتوں سے بہتر تھی ..... اولاد کوئی نہ تھی، لیکن محل دو تھے۔ دونوں کے لیے الگ مکان ایکدوسرے سے فاصلے پر..... ملازم بھی دو تھے، دونوں ایک ڈیوڑھی پر ایک۔ دونوں کے ساتھ مولانا کا برتاؤ قابلِ دید تھا، بجائے خود ایک درسِ ہدایت۔ کلام کو جب فرماتے، تو خوب ٹھہر ٹھہر کر، سمجھاکر..... اکثر تکرار کے ساتھ فرماتے کہ غلط فہمی کا احتمال نہ رہے۔ ملازمین جب آتے، تو حکم تھا کہ زبان سے السلام علیکم کہہ کر بیٹھ جائیں، بات چیت بیٹھ کر کریں، بلاضرورت کھڑے نہ رہیں۔ کام کی مشقت کبھی بہت زائد نہ ڈالتے، کام بگاڑتے، تو حضرت غصّہ بھی فرماتے اور غصہ کرنا ایسے موقع پر تو امرِ طبعی ہے، لیکن اس میں بھی حدود کے اندر رہتے۔ مسجد سے، چھوٹے زنانہ مکان کا فاصلہ اچھا خاصا تھا، لیکن شب میں عشا کے بعد جب گھر تشریف لے جاتے تو لالٹین اپنے ہاتھ میں لیے رہتے، کسی ملازم کو اس کے لیے نہ بُلاتے کبھی کوئی بات ہنسی کی بھی اُن سے کہہ دیتے جس سے اُن کا دل کھل جاتا، برتاؤ ہمیشہ خشک ہی نہ رکھتے۔ ان کے کپڑوں، ان کے بیوی بچوں سب کا لحاظ رکھتے۔

حضرتؒ کی شان ہی سب سے الگ، سب سے نرالی تھی، نہ فقر و فاقہ، نہ تجرد، نہ بیوی بچوں کا ترک اور نہ شدید قسم کے مجاہدے اور نہ رسمی

درویشی اور مشیخت کے کوئی بھی آداب و رسوم، بلکہ دیکھنے میں سارا سامان دنیاداری ہی کا موجود.... اچھے خاصے پختہ اور بلند مکان، نوکر چاکر، کھانے دو دو تین تین قسم کے.... لباس خاصا اُجلا شفاف۔ بڑی زبردست ڈاک کی آمد، غرض بظاہر ہر طرف دنیا ہی دنیا، لیکن وہ دنیا ایسی کہ اُس کے ہر جزو پر دین کی حکومت غالب، طبیعت و بشریت کی پوری پوری آزادیاں لیکن وہ بھی شریعت کی پابندی میں۔ مولانا کی ذات خود دینی حیثیت سے عجیب ذات تھی۔ کوئی صرف فقیہ ہوتا ہے اور طریقت سے کورا، کوئی محض صوفی ہوتا ہے اور کلام کے مباحث سے ناآشنا، یہ حضرت ایک ہی وقت میں صوفی محقق بھی تھے اور متکلم بے بدل بھی، رومیٔ عصر بھی اور رازیٔ وقت بھی، فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر، حدیث و تصوف کے علاوہ کلامِ قدیم و جدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں، وعظوں میں برابر بیان ہوتے رہتے اور ہم جیسے کتنے بے مایہ اور کم مایہ یہیں سے خوشہ چینی کر کر کے اپنی بات بناتے، اپنی دکان چمکاتے.... گفتگو کا بیشتر حصہ مولانا خود فرماتے لیکن دوسروں کو بھی بے تکلف بولنے چالنے، پوچھنے اور سوال جواب کرنے کی اجازت تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی سائل کے سوال پر یا خود ہی، مولانا کسی فقہی، کلامی، تفسیری، سلوکی مسئلے پر کوئی مستقل و مسلسل تقریر ذرا لمبی شروع فرما دیتے جسے حاضرین بڑے انشراحِ قلب سے سنتے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا عموماً اور بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دوستوں کے درمیان جیسے گفتگو ہوا کرتی ہے ہوتی رہتی اور بغیر اس کے کہ سننے والے کوئی دماغی بار

محسوس کرنے پائیں کہ انہیں کوئی خاص تعلیم دی جارہی ہے خدا جانے کتنے مسائل، کتنے کام کی باتیں، باتوں باتوں میں اُن کے کان میں پڑ جاتیں۔

اِن طویل صحبتوں اور روزمرّہ کی گفتگوؤں نے رفتہ رفتہ بتایا اور دل میں اُتارا کہ اصل شئے تو احکامِ شریعت ہیں۔ مدارِ کار تو اتباعِ کتاب وسنّت پر ہے، البتہ پورے اخلاص وتزکیۂ قلب کے ساتھ .... اللہ کے حقوق بقدرِ امکان ادا کیجئے، فرائض وواجبات میں حتی الامکان غفلت نہ کیجئے، اللہ کے بندوں سے اچھی طرح ملیے جلیے، باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، شوہر، ماں، بہن لڑکی، استاد، شاگرد، ملازم، آقا، دوست، پڑوسی سب کے حق پہچانیے اور امکان بھر ادا کیجیے۔ بلا ضرورت دنیا کے قصّوں اور دوسروں کے قصے قضیے میں نہ پڑیے۔ بلا وجہ کسی ادنیٰ کی سی دل آزاری، دل شکنی نہ کیجئے۔ احتسابِ نفس کرتے رہیئے۔ اپنی اصلاح کی فکر میں لگے رہیئے، طاعتِ راوی کو جانے نہ دیجیے، غفلت غیر ارادی کی پروا نہ کیجئے، بس یہی عطرِ تصوّف اور جانِ طریقت ہے۔ جو علوم ومعارف روزمرّہ کی اِن بے تکلّف مجلسوں میں سننے میں آتے رہے، اُن کی بات ہی کچھ اور ہے۔ گہری سے گہری باتیں دلچسپ رنگ میں، ادبی لطیفے، مزاحی چٹکلے، لفظی مناسبتوں کے مظاہرے اس پر مستزاد۔ بڑا ہی ظالم، بلکہ مفتری تھا وہ جس نے ایسے پیارے سے مومن مولینا کو خشک مشہور کیا۔

عتاب کے منظر بھی اس مدت میں بارہا دیکھے۔ مولانا کے یہاں کوئی چیز راز کی پوشیدہ نہ تھی۔ یہ منظر اکثر دوپہر کی مجلس عام میں پیش آتے۔ مولانا

بڑے ہی لطیف المزاج اور ذکی الحس تھے۔ کسی بے ڈھنگی اور بے قاعدہ بات کی برداشت نہ تھی۔ لوگ آتے اور ذرا بھی بے قاعدہ باتیں کرتے کہ موردِ عتاب ہو جاتے۔ تکلف اور مصنوعی ادب و تعظیم تو گویا حضرت کی چڑ تھی اور لوگ عموماً اسی کے عادی۔ خیر، جس پر جو گزرنا ہوتی، گزر جاتی، لیکن اتنا فائدہ بہر حال ہوتا کہ خود اس کو بھی آئندہ کے لئے سبق مل جاتا اور دیکھنے والوں کو بھی ہدایت ہو جاتی۔ صحبت بابرکت کی ایک خاص برکت یہ تھی کہ اپنی کوتاہیاں، اپنے عیوب، اپنے گناہ مشاہدے میں آجاتے اور بغیر اس کے کہ مولانا خطابِ خاص سے خطاب فرمائیں یا صراحۃً کسی کو اس کے عیب پر توجہ دلائیں، معلوم ایسا ہوتا تھا کہ جیسے غفلت کے پردے نگاہوں سے از خود ہٹتے جاتے ہیں اور عمر بھر کی عادتیں بے نقاب نظر آنے لگتی ہیں۔ مولانا اپنے نیازمندوں سے رواداری برتتے تھے، تاہم اصلاحی شان سب پر غالب تھی اور اپنے مخلصوں کو ضرورت کے موقع پر ضررِ دینی سے بچانے کے لئے نہ ٹوکنا، تدیّن و آئینِ صداقت کے بجا طور پر خلاف سمجھتے تھے۔ طبیب کی دوستی اور خیر اندیشی یہی ہے کہ وہ مریض کی مرضی پر نہیں، مریض کے مرض پر نظر رکھے۔ اللہ نے کیا دل اور کیا دماغ اور پھر ساتھ ہی کیا قلم دیا تھا۔ پورے پورے علوم چھوٹے چھوٹے فقروں کے اندر سمائے ہوتے تھے اور تسکینِ قلب تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہر وقت بہہ رہا ہے۔ بدتر سے بدتر اپنی حالت پیش کیجئے اور جواب میں تسکین و تسلّی ہی حاصل کیجئے مایوس کرنا تو گویا حضرت جانتے ہی نہ تھے۔

حضرت کے خلیفہ اور عاشق زار خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب "اشرف السوانح" نے ایک بار نہایت حسرت سے عرض کیا کہ حضرت، جب مَیں خدمت میں حاضر ہوتا ہوں، تو قلب کی حالت بہت اچھی ہو جاتی ہے اور جب یہاں سے چلا جاتا ہوں تو رفتہ رفتہ پھر حالت خراب ہو جاتی ہے۔ فوراً نہایت لطف کے ساتھ تسلّی فرمائی۔ "پھر حرج ہی کیا ہے؟ آپ اپنے کپڑے میلے کر دیتے ہیں، دھوبی اُن کو دھو دیتا ہے، آپ پھر میلے کر دیتے ہیں، دھوبی ان کو پھر دھو دیتا ہے، چنانچہ مولانا کا یہ اثر عام تھا کہ جس کو تعلق ہو گیا، اُسے شریعت پر عمل کرنے کا بیحد اہتمام ہو جاتا اور جائز و ناجائز کا بہت خیال رہنے لگتا تھا۔ ایک اہل علم نے اپنے مدرسے کی مسجد میں کسی اجنبی طالب علم کو دیکھا کہ مسجد کے چراغ کی روشنی میں مطالعہ کرتے کرتے جب وہ وقت آیا جو وہاں کے معمول کے مطابق چراغ گُل کر دینے کا مقرر تھا۔ تو اُس طالب علم نے فوراً مسجد کا چراغ گُل کر کے اپنا ذاتی چراغ روشن کیا اور مطالعہ کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اُن اہل علم نے کسی سے کہا: معلوم ہوتا ہے یہ طالب علم، مولانا اشرف علی تھانوی سے تعلق رکھتا ہے، ورنہ ایسی احتیاط کون کرتا ہے بعد کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ واقعی حضرت مولانا سے بیعت تھا۔

ایک حجّام حضرت سے بیعت ہوئے، تو اپنا پیشہ محض اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ اس میں اکثر مسلمانوں کی داڑھیاں مونڈنی پڑتی تھیں۔ اُنھوں نے پکوان سیکھا اور اسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا، پھر اپنی دیانت داری کی وجہ سے اس درجے مقبول ہوئے کہ آمدنی پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ

گئی اور ہر وقت عمدہ عمدہ غذائیں نصیب میں آئیں ۔ یہ حال جب غیر تعلیم یافتہ افراد کا ہو گیا، تو جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اُن کا پوچھنا ہی کیا۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے بی اے اور ایل ایل بی کی سند "علی گڑھ یونیورسٹی" سے حاصل کی اور وکالت کو ذریعہ معاش قرار دیا، مگر حضرت تھانویؒ کے ساتھ جب تعلق استوار ہوا تو خود بخود وکالت ترک دی اور ہومیو پیتھی کی تعلیم حاصل کی اور اب کوئی پچاس برس سے ایک کامیاب معالج کی حیثیت سے مخلوقِ خدا کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ۔ اہلِ تعلق میں یہ اثر نہ صرف حضرتِ شیخ کی نگرانی و تربیت کا نتیجہ تھا، بلکہ خود آپ کے علم مستحکم کا باعث بھی تھا۔ ایک مرتبہ مولانا تھانویؒ، سہارنپور سے کانپور تشریف لے جا رہے تھے ۔ کچھ گنّے ساتھ تھے ۔ مولانا نے ضابطے کے تحت ان کو تُلوانا چاہا، اسٹیشن کے غیر مسلم ملازمین نے ازراہِ عقیدت عرض کیا، آپ یونہی لے جائیے، تُلوانے کی ضرورت نہیں ہم گارڈ سے کہہ دیں گے، مولانا نے فرمایا: یہ گارڈ کہاں تک جائے گا ۔ جواب ملا غازی آباد تک ۔ ارشاد ہوا غازی آباد سے آگے کیا ہو گا؟ جواب ملا: یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا ۔ مولانا نے پھر سوال کیا: آگے کیا ہو گا؟ انہوں نے بتایا: دوسرا گارڈ کانپور تک پہنچا دے گا اور وہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا: یہ سُن کر مولانا تھانویؒ نے فرمایا: جی نہیں، وہاں سفر ختم نہیں ہو گا بلکہ آگے ایک اور سفر آخرت کا بھی ہے، وہاں کا انتظام کیا ہو گا! یہ سن کر سب دنگ رہ گئے اور کہا کہ خدا کے ایسے محتاط بندے بھی ہوتے ہیں! غرض غیر اقوام پر مسلمانوں کی ساکھ اسی طرح قائم ہوتی ہے، مگر شب و روز نے

ہزاروں کروٹیں بدلی ہوں گی کہ نادانوں اور نفس پرستوں نے اسے یکسر محو کر دیا تھا۔ مولانا تھانوی ؒ نے اسے پھر زندہ کیا۔ یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ مولانا کے متعلقین میں حلال و حرام کی تمیز، ادائے حقوق کا پاس، صفائی معاملات کا لحاظ اور احتسابِ نفس کی گرمجوشی ملے گی، چنانچہ حضرت کی تمامتر روک ٹوک اور دارو گیر کا منشا اپنے متبعین میں بھی اسی فکر و اہتمام دین کا پیدا کر دینا ہے جو سارے اعمال حسنہ کی جڑ ہے اور جسے حضرت دُھن اور دھیان سے تعبیر فرمایا کرتے ہیں۔

حضرت کا ارشاد یہ بھی ہے کہ اگر اصول تو ہوں نرم، لیکن اُن کی پابندی کرائی جائے سختی سے، تو یہ سختی نہیں بلکہ مضبوطی ہے جیسے ریشم کا رسّہ نرم تو ایسا کہ چاہے اس میں گرہ لگا لو، لیکن ساتھ ہی مضبوط بھی اتنا کہ اگر اس سے ہاتھی کو باندھ دیا جائے تو وہ بھی اسے توڑ نہیں سکتا، لہذا ریشم کے رسّے کو سخت نہ کہا جائے گا، بلکہ مضبوط کہا جائے گا۔ اس کے برعکس لوہے کی زنجیر کو سخت کہا جائے گا کہ لوہا اپنی ذات ہی میں سخت ہے۔ اگر زنجیر کسی کے پیروں میں ڈال دی جائے، تو وہ پیروں ہی کو زخمی کر دے، بخلاف ریشم کے رسّے کے کہ پابند رکھنے کی صفت میں تو لوہے کی زنجیر سے بڑھ کر ہے، مگر اس سے پاؤں زخمی نہیں ہوتے، بلکہ بہت آرام میں رہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی میرے یہاں آکر اصولِ صحیحہ کا پابند رہے، تو اسے کبھی کسی ناگواری کا موقع عمر بھر بھی میری طرف سے پیش نہ آئے۔ لوگ خود اِن صحیح اصولوں کو توڑ مروڑ کر اور بے اصول باتیں کر کر کے اپنے ہاتھوں مصیبت میں پڑتے ہیں۔ الحمدللہ میرے اندر حدت

تو ہے، شدت نہیں۔

اس پر ایک عاقل کا قول یاد آتا ہے۔ انہوں نے جب حضرت کی داروگیر اور ڈانٹ ڈپٹ کے حالات سنے، تو نہایت گہرا اور پُرمغز سوال ایک صاحب سے کیا کہ مولانا کا بچوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہے؟ انہوں نے کہا: بچوں کے ساتھ تو بہت بے تکلف ہیں اور نہایت شفقت سے پیش آتے ہیں تو انہوں نے کہا جو سخت ہوتا ہے وہ بچوں کو بھی منہ نہیں لگاتا۔

حضرت کی اصلاح کا طریق نہایت عجیب، پُراثر اور نافع تھا۔ مختصر مختصر جملوں میں بڑی بڑی نفسانی بیماریوں کے علاج تجویز کر دیتے تھے۔ ایک طالب نے عبادت میں کسل اور سستی کا علاج دریافت کیا۔ حضرت نے تحریر فرمایا: سُستی کا علاج چُستی..... ایک طالب نے غلبہ خشیت میں لکھا کہ مجھے خطرہ ہے حضرت نے جواب دیا، یہ خطرہ تو بحرِ معرفت کا قطرہ ہے اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر دریا کر دے۔

خواجہ مجذوب نے اپنے ایک عریضے میں کوئی باطنی پریشانی بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سخت اُلجھن ہوتی ہے۔ مولانا نے تحریر فرمایا: یہ اُلجھن مقدمہ ہے سُلجھن کا۔ ان مع العسر یسرا ط مزید ارشاد ہوا، شیخ کے ساتھ طالب کو کیا معاملہ رکھنا چاہیئے۔ بس اِن ہم قافیہ الفاظ کو یاد رکھے۔ اطلاع اور اتباع، اعتقاد اور انقیاد..... یہ بھی فرمایا کہ اس طریق میں دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے دُھن اور دھیان۔ ایک طالب علم نے شکایت کی کہ میں تو بالکل کورا رہ گیا۔ فرمایا: کورا ہونا بُرا نہیں، کور ہونا بُرا ہے۔ بلا سے کورا ہو، مگر کور نہ ہو۔ ایک

بار فرمایا: اس طریق میں خود رائی نہ کرے، بلکہ خود کو رائی کر دے، یعنی اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھے۔ ایک صاحب کو خیال ہو گیا تھا کہ وہ ابدال ہو گئے ہیں۔ فرمایا: ہاں، پہلے گوشت تھے، اب دال ہو گئے ہیں۔ ارشاد ہوا: نئی تہذیب، تہذیب نہیں، تعذیب ہے اور آج کل کی قومی ہمدردی، ہمدردی نہیں، ہمہ دردی ہے۔ شملے کے سفر کے بعد وہاں جا کر جو برائیاں غالب ہیں، بیان کر کے فرمایا: ہم نے تو سنا تھا کہ شملہ بمقدارِ علم ہوگا، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شملہ بمقدارِ جہل ہے۔

ایک طالب کا خط فضول مضامین اور استفسارات سے لبریز تھا، اور آخر میں لکھا تھا کہ مضمون طویل ہونے سے تکلیف ضرور ہوئی ہوگی، معاف فرمائیں، حضرت نے اس آخر بات کا یہ جواب تحریر فرمایا: "خط طویل ہونے سے تو تکلیف نہیں ہوئی، البتہ لاطائل سے ہوئی۔ ایک صاحب سے تحریکِ خلافت کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ حضرت نے فرمایا کہ بلا امیر المومنین کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا: ہم آپ کو امیر المومنین بناتے ہیں۔ فرمایا: جب تک امیر المومنین میں قوتِ قہریہ نہ ہو، وہ امیر المومنین ہی نہیں.... میں ایسا امیر المومنین نہیں ہونا چاہتا کہ آج تو امیر المومنین بنوں اور کل کو اسیر الکافرین ہو جاؤں۔

فرمایا، آج کل لوگوں کی نظر مال پر ہے مآل پر نہیں۔

فرمایا: لوگ بعض اہلِ صنعت کافروں کو بڑا عاقل سمجھتے ہیں۔ کوئی کافر بھی کہیں عاقل ہو سکتا ہے؟ عاقل تو کیا ہوتے ناں.... آکل خوب ہیں۔ فرمایا: درستی تو درشتی ہی سے ہوتی ہے۔ ایک بار کسی سے کہا کہ آج کل کے اکثر مدعیانِ توکل تو

کیا ہوتے، اہل تأمّل ضرور ہیں۔ فرمایا: بعض طلبہ کی دستار بندی تو ہو جاتی ہے، لیکن ان میں "دس تار" تو کیا، ایک تار بھی علم وعقل کا نہیں ہوتا۔ غرض اس قسم کے لطیفے جو سراسر آئینۂ حقیقت ہیں، حضرت کی زبانِ فیض ترجمان اور قلمِ ہدایت رقم سے بکثرت صادر ہوتے رہتے تھے۔

حضرت مولانا کے ہاں ڈاک کثرت سے آتی اور روز کے روز اس کا جواب جاتا۔ ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے، خصوصًا پوسٹ کارڈ، انہیں اسی وقت پڑھ ڈالتے اور جوابِ ظہر کی مجلس کے لیے اٹھا رہتا۔ خطوط کی تعداد روزانہ تیس چالیس سے کیا کم ہوتی، بلکہ اس سے بھی زائد۔ پھر خط بھی مختصر اور چند سطری نہیں، بڑے لمبے چوڑے اور فقہ، سلوک، کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق۔ اب حضرت ہیں اور خطوط کا پشتارہ، اِرد گرد حاضرینِ بزم، حلقہ کیے ہوئے، خواص بھی، عوام بھی..... مسئلے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے چھڑے ہوئے۔ حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں حاجتمندوں کو تعویذ بھی لکھ کر دیتے جاتے ہیں اور خط کا جواب بھی اسی کے حاشیے پر یا بین السطور تحریر کرتے جا رہے ہیں۔ جواب کی جامعیت سبحان اللہ، کتنا حاضر دماغ پایا تھا۔ عمومًا یہ سارے جوابات اسی طرح قلم برداشتہ لکھ دیے جاتے اور اتنے جامع اور محققانہ ہوتے کہ دوسروں سے شاید پورے غور وفکر کے بعد بھی نہ بن پڑتے۔ اگر دن ختم ہو گیا اور ڈاک ختم نہ ہو پاتی، تو اب مولانا اس سن وسال میں بعد نمازِ مغرب و اورادِ مغرب، لالٹین سامنے رکھ اور قلم ہاتھ میں لے بیٹھ گئے ہیں اور رات گئے تک کام کر کے ڈاک اپنے ہاتھ سے

ختم کر کے ہی اُٹھے ہیں۔

حضرت کی داخلی اور خارجی زندگی اتنی متوازن تھی کہ دیکھنے والوں کو نہ صرف اس پر حیرت ہوتی، بلکہ اُسے صریحاً کرامات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سفر ہو یا حضر آپ نے نہ کبھی فرمائشی وعظ کہے نہ وعظ کا کوئی معاوضہ قبول کیا، بلکہ اس درجہ احتیاط تھی کہ جہاں جاتے، عام دعوتوں سے گریز کرتے کہ یہ بھی معاوضے ہی کی ایک صورت ہے۔ اپنے ساتھیوں کا بار کسی پر نہ ڈالتے۔ ہمراہیوں کو اس امر کی سختی سے تاکید تھی کہ جب تک میزبان ان سے بطور خاص درخواست نہ کرے اور وہ حضرت سے اس بارے میں اجازت حاصل نہ کرلیں، کوئی دعوت قبول نہ کریں۔ کبھی ایسے مقام پر قیام نہ کرتے جہاں عام مسلمانوں کو آنے اور ملاقات کرنے میں دشواری ہو۔ والیانِ ریاست اور امراء کی ملاقات سے عموماً گریز فرماتے، کیونکہ اس میں دینی نفع کی کوئی امید نہ پاتے تھے۔

جب سفر کا قصد کرتے، تو پہلے اس کی غرض و غایت متعین ہوتی، پھر اس کے مطابق سامان اور دوسری سہولتیں مہیا کی جاتیں۔ اتنے دنوں کے لئے ڈاک کا انتظام پہلے ہی کر لیا جاتا۔ دورانِ سفر ہر جگہ سے گھر کو خط لکھتے رہتے تاکہ اہلِ خانہ اور اہلِ خانقاہ مطمئن و بے فکر رہیں۔ سفر میں درجہ سوم کو ترجیح دیتے اس دوران بھی خطوط کے جوابات اور تصنیف کا کام برابر جاری رہتا تھا۔ سفر کرتے ہوئے جب غیر مسلموں سے گفتگو کی نوبت آتی، تو ایسی جامع اور دلنشین گفتگو کرتے کہ اہلِ باطل پر اسلام کی حقانیت کا سکّہ بیٹھ جاتا تھا۔ سفر کے دوران کسی کو بیعت نہ کرتے، بلکہ اُس سے کہتے کہ تھانہ بھون آکر کچھ عرصہ

دیکھ لے، صرف باتوں میں نہ آجائے کہ باتیں بنانا بہت آسان ہے، اصل شے عمل و اخلاص ہے جس کے بغیر بیعت کا مقصد حاصل ہونا محال ہے۔ اس اصول میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ لوگ بیعت کو محض رسم اور سستا سودا نہ سمجھ لیں بلکہ اس کی حقیقت اور وقعت بھی اُن کے ذہن نشین ہو جائے البتہ سفر میں خواتین کو بیعت فرمالیتے، بشرطیکہ ان کا محرم ساتھ ہو۔

اب آئیے داخلی زندگی کی طرف تاکہ یہ بھی کھل جائے کہ وعظ و پند، اصول و ضوابط صرف اغیار ہی کے لئے نہ تھے، بلکہ گھر کی نجی زندگی میں بھی اُن پر پوری پوری نگاہ رکھی جاتی تھی۔ اس کا مختصر حال خواجہ مجذوبؒ کی زبانی سُنیے: حضرت کی ازواج محترمات دو ہیں اور اُن میں عدل کا اس درجے اہتمام ہے کہ شاید و باید۔ چونکہ حضرت حقوق العباد کے متعلق بہت زیادہ محتاط ہیں، اس لئے عدل کی جزئیات میں بڑی دشواری پیش آئی، رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے سب دشواریاں آسان کردیں اور عدل کا طریقۂ عمل سمجھ میں آ گیا۔ بعض احباب کے اس کہنے پر کہ آپ نے تو عقدِ ثانی کا دروازہ کھول دیا، یہ جواب ارشاد فرمایا کہ نہیں، میں نے دروازہ کھولا نہیں ہے، بند کردیا ہے، کیونکہ جب لوگ دیکھیں گے کہ عدل کی اتنی رعایت کرنی پڑے گی، تو اُسے دشوار جان کر عقد ثانی کی ہمت ہی نہیں کرسکیں گے۔

حضرت نقد یا غیر نقد جو کچھ دیتے ہیں، دونوں بیویوں کو برابر دیتے ہیں اور اس کا یہاں تک اہتمام ہے کہ ایسی چیزوں کی تقسیم کے لیے جو وزن کی جاتی ہیں، ایک نہایت صحیح کانٹا اپنی نشست گاہ کے سامنے لٹکا رکھا

ہے جیسے مزاحاً میزانِ عدل کہا کرتے ہیں۔ کھانا ایک دن ایک گھر میں اور ایک دن دوسرے گھر میں تناول فرماتے ہیں۔ اگرچہ برادری میں ادائے مہر کا دستور نہیں ہے، مگر حضرت نے دونوں گھروں میں مہر ادا کر دیا ہے، بلکہ کہا کرتے ہیں کہ اگر عورت، مہر معاف بھی کر دے، تب بھی مرد کی غیرت کا تقاضا یہی ہونا چاہیئے کہ وہ مہر ادا کر دے۔ کرایہ مکان بھی ادا کرتے ہیں کہ اپنے دونوں مکان، دونوں بیویوں کی ملک میں دے چکے ہیں، حالانکہ شرعاً یہ رقم حضرت کے ذمے واجب الادا نہیں، مگر غیرت، طبیعت میں بے انتہا ہے اور کسی کا اتنا احسان لینا بھی گوارا نہیں۔ اسی طرح حضرت حتی الامکان گھروں پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے یہاں تک کہ کسی خاص کھانے کی بھی فرمائش نہیں کرتے۔ گھر میں نہایت نرم لہجے میں گفتگو کرتے ہیں اور اعزّہ کے یا مہمانوں کے بچوّں سے خوب مزاح فرماتے رہتے ہیں۔ ایک بار فرمایا، میں تو بعض اوقات چولہے ہی کے پاس بیٹھ کر کھانا کھا لیتا ہوں اور ضرورت کے وقت گھر کا کام کاج بھی کرتا ہوں، غرض حضرت گھر میں مخدومیت کی شان سے نہیں رہتے اور گھر والوں کی طرف ایسے ملتفت رہتے ہیں جیسے ان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہو، لیکن جب خانقاہ میں تشریف لاکر مشاغلِ دینیہ میں مصروف ہو جاتے ہیں، تو پھر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ حضرت والا کسی سے اُس وقت تک خدمت لینا گوارا نہیں فرماتے جب تک اُس سے دِل نہ کھُل جائے، بلکہ جن سے دل کھُلا ہوا ہے، اُن سے بھی بطور خود شاذ و نادر ہی کسی بہت خفیف کام کی فرمائش کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی خود سبقت کرے تو منع بھی نہیں کرتے۔ تاہم مسلّط ہو جانا اُن کا

بھی گوارا نہیں۔ فرماتے ہیں: میں چاہتا ہوں سب اپنے اپنے کام میں لگے رہیں۔ خواہ مخواہ میری خدمت کے لئے مجھ پر مسلط نہ ہوں تاکہ وہ بھی آزاد رہیں، میں بھی آزاد رہوں۔ آزادی بڑی دولت ہے۔ میں نے اپنی ضروریات اتنی مختصر کر رکھی ہیں کہ میں ان کو خود ہی پورا کر لیتا ہوں، کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے تمام کام انتظام کے ساتھ کرے، اس سے خود کو بھی راحت ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی۔ اگرچہ میں متقی پرہیزگار تو نہیں، تاہم خدا کا شکر ہے اپنی اصلاح سے غافل نہیں۔

حضرت، نفس کے دھوکوں سے خوب واقف ہیں اور اس کی تاویلیں اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ رات دن کام یہی ہے کہ طالبین کے مکائدِ نفس، بلکہ اپنے نفس کی بھی ہر وقت دیکھ بھال کرتے ہیں۔ حدودِ شریعت کے تحفظ کا یہ حال ہے کہ پورے دو سال کی تحقیق و تفتیش سے اپنے والد ماجد کی چاروں بیویوں کے وارثوں کا پتا لگایا اور والد کے ذمے جو مہر ان بیویوں کا رہ گیا تھا، وہ والد کے ترکے سے ادا کیا اور جب تک ایک ایک پائی ادا نہ ہوئی، چین نہ آیا۔ حضرت کی عادت ہے نہ آپ کو یہ پسند کہ مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیے جائیں۔ حق بات کا اظہار کر کے خاموش ہو رہتے اور فرمایا کرتے، کہ جب میں سنتا ہوں کسی مناظرے میں مخالفین کے مقابلے میں اپنی جماعت غالب آگئی، تب بھی صدمہ ہوتا ہے کہ عوام کیا کہتے ہوں گے کہ مولوی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایسے مناظروں سے عوام کو بیحد نقصان پہنچتا اور باطل کو فروغ ملتا ہے۔ پھر یہ بھی کمالِ توازن ہی کا نتیجہ ہے کہ مخالف سے اختلاف خواہ کتنا ہی شدید ہو،

مگر اس کی خوبیوں پر برابر نظر رہتی ہے اور جس طرح اختلاف کا اظہار بے باکانہ ہوتا، اُسی طرح خوبی کا اعتراف بھی پوری فراخی سے کرتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر سے حضرت کا سیاسی اختلاف عالم آشکارا تھا، لیکن دیکھیے کہ ان کے جوہر پر بھی کیسی نظر تھی اور اس کا کس بے نفسی سے اعتراف فرمایا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر عبدالماجد دریابادی کے نام ایک مکتوب کی چند سطریں :۔

"محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کرسکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دعا کرچکا ہوں اور کر رہا ہوں، مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، صرف ایک صفت، مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں، میں نے کبھی دیکھا نہیں، اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں"۔

دینی مسائل ہوں یا دنیوی، ایک مصلح امت جب انہیں پر لکھے گا تو اس کی کسوٹی صرف کتاب وسنت ہی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ایک پرانے قصبے کی کہنہ مسجد کے گوشے میں ایک دُوربین، زندہ مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبے پر نظر ڈال کر حق وباطل، نیک وبد اور صحیح وغلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اسے دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں غلطیاں تھیں، وہ ان کے درست کرنے میں مشغول تھا۔ اُس نے پوری زندگی اس کام میں صرف کی کہ مسلمان کی تصویرِ حیات کو اس شبیہہ کے مطابق بنادے

جو دین کے مرقع میں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس وقت بھی جبکہ تحریکِ خلافت نے نہ صرف عام مسلمانوں کو، بلکہ بڑے بڑے علماء کو کانگریسی مسلک سے متعلق کر دیا تھا، اس مردِ آخر بین کی نظریں اس ہنگامہ آرائی کے ہولناک مناظر دیکھ رہی تھیں۔ عین اِس طوفانی دور میں حضرت نے اپنی جان اور عزت کی پروا کیے بغیر، جو کچھ حق سمجھا، اس کا برملا اظہار کیا۔ اس کے صلے میں جن الزامات اور اعتراضات سے نوازا گیا، وہ یہ تھے کہ انگریز کا پٹھو ہے، انگریز اُسے تنخواہ دیتا ہے، سی آئی ڈی کا آدمی ہے، مسلمانوں کا جذبۂ جہاد ختم کرنا چاہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ دشمنوں نے اس زبانِ حق ہی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ ہتھیاروں سے لیس بدمعاشوں کا ایک گروہ تھانہ بھون بھیجا گیا اور یہ لوگ اُس راستے میں چھپ گئے جدھر سے مولانا تھانوی گزرا کرتے تھے ارادہ تھا کہ جب صبح کی نماز کے لیے مسجد جا رہے ہوں، تو کام تمام کر دیا جائے۔ حضرت کو بھی ان شرپسندوں کے آنے کی خبر ہو گئی، مراقب ہوئے، میلانِ قلبی یہی رہا کہ معمول کے مطابق مسجد میں جایا جائے، چنانچہ ایک ہاتھ میں لالٹین اور ایک ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے صبح صادق سے پہلے ہی گھر سے نکلے۔ جب اس مقام پر پہنچے جہاں غنڈے چھپے ہوئے تھے، تو حضرت کو دیکھ کر ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ سب کے سب بے تحاشا وہاں سے بھاگ نکلے اور پہلی ٹرین پر سوار ہو کر تھانہ بھون سے چلے گئے۔ اس کے بعد پھر کسی نے ایسی جراءت نہ کی۔

حضرت مولانا کا طبعی میلان یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف،

تعلیم و تربیت اور اصلاحِ امّت و ہدایتِ خلق کی طرف تھا، اس لیے عملی طور پر سیاسی اور ملکی تحریکوں میں براہِ راست حصّہ لینے کی نوبت نہ آئی اور نہ آپ کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہوئے، البتہ جب کبھی ملک میں کوئی سیاسی تحریک شروع ہوئی، اس کے بارے میں ایک ماہرِ شریعت عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے اس کی شرعی حیثیت پر فقیہانہ نظرِ بصیرت ڈال کر نتائج و عواقب واضح کرنے اور ملّت کی علمی اور دینی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ فرمایا۔

آل انڈیا نیشنل کانگریس شروع میں ایک اعتدال پسند جماعت تھی لیکن بعد میں ظاہر ہو گیا کہ اس کی کارروائیوں سے مسلمانوں کے مفادات کو زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم پہلے آدمی تھے جنہوں نے اعلانیہ کانگریس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس سے الگ رہیں اور اپنے آپ کو تعلیم کے لئے وقف کردیں۔ مولانا تھانوی کا مشورہ بھی رہا اور ان کی دلیل یہ تھی کہ کانگریس میں چونکہ اکثریت غیر مسلموں کی ہے، اس لئے اس جماعت کی اصلاح ناممکن ہے۔ حضرت کے خیال میں کانگریس کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمان اس میں شریک تھے۔ فرمایا: "ہندوؤں کی پچاس سالہ مُردہ کانگریس کو مسلمانوں نے زندہ کیا۔ جب تک مسلمانوں نے شرکت نہ کی تھی، کسی نے کانگریس کا نام بھی نہ سُنا تھا۔ اگر خدانخواستہ یہ جماعت ہندوستان میں برسرِ اقتدار آگئی، تو یہ بھی ہندوستان میں وہی کرے گی جو بالشویک کر رہے ہیں۔

اُس زمانے میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ مولانا تھانویؒ کو بھی شرکت کی دعوت ملی جواب میں تحریر فرمایا: "واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت پختہ کر دیا ہے کہ مسلمانوں خصوصًا علماؒ کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہبًا مہلک ہے بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا بہت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہیئے اور مسلمانوں کا کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی اپنی موت کے مترادف ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ ہم کانگریس میں شرکت اس وجہ سے کرتے ہیں کہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے اور ہمارا غلبہ ہو۔ اگر مقصود واقعی یہ ہے، تو اس کا حصول مسلم لیگ میں زیادہ آسان ہے، کیونکہ مسلم لیگ والے اتباع کے لیے آمادہ ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے ارکان نے مجھے لکھا ہے کہ ہم حضرات علما کی رائے کے اتباع کے لیے تیار رہیں اور کانگریسی تو خود اپنا تابع بناتے ہیں۔ ان پر غلبہ پانا مشکل ہے۔"

ہندوؤں کے ایک بڑے گروہ کو اردو زبان سے ہمیشہ نفرت رہی ہے اور وہ اسے مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی زبان سمجھ کر نیست ونابود کرنے کے درپے رہے ہیں۔ کانگریس نے قوت پکڑنے کے بعد اردو زبان کے بجائے ایک مُردہ زبان سنسکرت کی جب سرپرستی شروع کی تو زبردست لسانی مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ چنانچہ مولانا تھانوی نے اردو زبان کی حمایت میں فورًا فتویٰ جاری کیا۔ "اگر خدانخواستہ یہ زبان (اردو) ضائع ہوگئی تو مسلمان کا تمام اسلامی ذخیرہ ضائع ہو جائے گا اور عام مسلمانوں کے لئے تو علم دین سے واقفیت کا

کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہے گا، کیا کوئی مسلمان اسے برداشت کرسکتا ہے کہ یہ ذخیرہ ضائع ہو جائے؟ اردو زبان کی حفاظت اِس وقت دین کی حفاظت ہے اس لئے یہ حفاظت حسبِ استطاعت واجب ہوگی اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سستی کرنا موجب مواخذۂ آخرت ہوگا۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی راوی ہیں کہ "حضرت تھانوی کو بعض معاصر علماء کی طرح جنگِ آزادی، جنگ حقوق آزادی وطن وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں تمام تر دینی تھا، وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی، تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالسّلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی کہ جی یوں چاہتا ہے ایک خطّے پر خالص اسلامی حکومت ہو، سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکامِ شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظامِ زکوٰۃ رائج ہو شرعی عدالتیں قائم ہوں وغیرہ..... دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں؟ اس مقصد کے لیے صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے اور اُسی کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔"

گویا خانقاہ امدادیہ میں بوریہ نشین اس مردِ درویش نے حصول وبقاء پاکستان کا لائحہ عمل اور نظام پاکستان کا نقشہ اُس وقت پیش کیا جب پاکستان چاہنے والوں کو اس کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ اس زمانے میں صدر جمعیۃ علمائے ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، حضرتِ تھانوی سے مسائل حاضرہ پر گفتگو کرنے تشریف لائے۔ حضرت نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے

سے کراہت کا اظہار کیا۔ مفتی صاحب نے کہا :۔ " احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو اپنے ساتھ جہاد میں لیا ہے " حضرت تھانویؒ نے اس کا جو جواب دیا وہ مولانا ظفر احمد صاحب مرحوم کے الفاظ میں کچھ یوں تھا : " کفار اور مشرکین کو آپ جہاد میں اسوقت لے سکتے ہیں کہ جھنڈا مسلمانوں کا ہے اور کفار ہمارے حکم کے تحت ہوں۔ اس وقت حالت برعکس ہے ۔ کانگریس میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اور اوراہنی کا حکم غالب ہے " غرض حضرت تھانوی ہمیشہ سے مسلمانوں کی الگ تنظیم کے حامل رہے ، حتیٰ کہ جب تک مسلم لیگ نے کانگریس کا ساتھ دیا ، اُس وقت تک حضرت نے مسلم لیگ کا ساتھ بھی نہیں دیا اور جب مسلم لیگ کانگریس سے علیحدہ ہوئی ، تب حضرت نے علانیہ مسلم لیگ کی حمایت فرمائی۔ مسلم لیگ نے کانگریس سے الگ ہونے کے بعد پہلا الیکشن جھانسی کے علاقے میں لڑا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں نے تار کے ذریعے حضرت تھانوی سے پوچھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں میں سے کس کو ووٹ دیا جائے؟ اُس وقت تک حضرت کا ذہن مسلم لیگ کی حمایت کے بارے میں واضح نہ تھا ، بلکہ یہ خدشہ محسوس کرتے تھے کہ یہ لوگ کہیں مصطفیٰ کمال پاشا کی طرح دین کو مسخ نہ کریں ، اس لئے تار کا جواب دینے میں تامل تھا ، آخر آپ کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانی نے مشورہ دیا : " آپ کانگریس کی حمایت کے خلاف تو ہیں ، تامل صرف مسلم لیگ کی حمایت کرنے میں ہے ، اس لئے آپ یہ جواب دیدیں کہ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے " یہ جواب حضرت نے پسند

فرمایا اور اسی مضمون کا جوابی تار روانہ کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ مسلم لیگ کامیاب ہو گئی۔

الیکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی کی خوشخبری دینے کے لئے مولانا شوکت علی مرحوم اپنے چند ساتھیوں کو لے کر تھانہ بھون آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے حضرتِ تھانوی کے جوابی تار کو فتوے کی صورت میں چھپوا کر بڑی تعداد میں تقسیم کرایا اور جگہ جگہ چسپاں کیا۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ کانگریس کو ووٹ دینے آتے تھے، وہ بھی یہ فتویٰ دیکھ کر مسلم لیگ کو ووٹ دیتے تھے۔

جب کانگریس میں مسلمانوں کے بلاشرط داخلے سے خطرناک نتائج و عواقب تقریباً سامنے آگئے، تو حضرت تھانوی نے مسلم لیگ کی حمایت اور شرکت کی رائے دی۔ آپ کا فتویٰ بنام تنظیم المسلمین شائع ہوا۔ یہ فتویٰ ۹ ر ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ بمطابق ۱۰ ر فروری ۱۹۳۸ء کا تحریر شدہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی دینی حالت درست کرنے کو حضرت تھانوی مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں مسلم لیگ کے زعماء کے پاس اپنی طرف سے وفود بھیجتے رہے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ منعقدہ ۲۶ ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو حضرت نے ایک تبلیغی وفد روانہ کیا۔ اس وفد نے قائدِ اعظمؒ کو نماز کی تلقین کی۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ مسلم لیگ کا اجلاس دو بجے یہ کہہ کر ملتوی کر دیا گیا کہ سب صاحب نماز پڑھیں۔ قاضی شہر کی امامت میں قائدِ اعظم سمیت کوئی ایک لاکھ افراد نے نماز ادا کی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی اس وفد کے امیر تھے اور حضرت تھانوی کی ہدایت کے مطابق انہوں نے قائدِ اعظم سے ملاقات میں کہا کہ مسلمان ایک

دینی قوم ہے جب تک سیاست کو دین سے نہ ملایا جائے گا، کامیابی نہ ہو گی۔ آپ بھی مسلم لیگ میں دین کو شامل کریں۔ قائداعظم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سیاست کو دین سے علیحدہ ہی رکھنا چاہیئے۔ مولانا ظفر احمد نے جواب دیا: یہ تو یورپ کی سیاست ہے۔ اسلامی سیاست یہ ہے کہ خلیفۂ اسلام قائد حرب بھی تھا اور نماز کا امام بھی ..... جب تک مسلمان، مسلمان رہے، یہی صورت رہی اور جب سے سیاست نے دین کو چھوڑا، مسلمانوں کا تنزل شروع ہو گیا۔ ترکی کے مصطفٰے کمال نے دین کو چھوڑا، تو سلطنت مختصر ہو کر رہ گئی۔ افغانستان کے امان اللہ خاں نے دین کو خیرباد کہا، تو اسے قوم نے الگ کر دیا۔ قائداعظم پر ان کلمات کا یہ اثر ہوا کہ اگلے دن کھلے اجلاس میں اعلان کر دیا: "اسلام عقائد وعبادات کا، معاملات، اخلاق اور سیاست کا مجموعہ ہے۔ قرآن مجید نے سب کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے، اس لئے سیاست کے ساتھ دین کو بھی لینا چاہیئے۔" قائداعظم کی یہ تقریر دہلی کے اخبار "الامان" نے اس شہ سرخی کے ساتھ شائع کی تھی:۔

"مولانا حکیم الامت تھانوی کی روحانیت کی تاثیر اور قائداعظم کی تقریر"

کرامات بزرگی کا لازمہ بن گئی ہیں، حالانکہ اگر یہ حقیقی بھی ہوں، تو بھی کسی کے اختیار میں نہیں، محض عطائی ہیں۔ بندہ اختیاری امور کا پابند ہے اور انہی امور کی پابندی اس کے لئے وجہ بزرگی ہے۔ ولایت شعبہ ہے نبوّت کا اور جو جتنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گا اتنا ہی بڑا ولی ہو گا خواہ اس سے ایک بھی خرقِ عادت سرزد نہ ہو، اسی لیے صوفیائے ربانی میں سے کسی کا قول

مشہور ہے کہ شریعت پر استقامت ساری کرامات سے افضل ہے، چنانچہ بزرگانِ دین نے اپنے کشف اور کرامات کو چھپایا ہے اور ان سے بچنے کی دعا مانگی ہے۔ مولانا تھانویؒ کو "فراستِ مومن" سے حصہ وافر ملا تھا جو آپ کی بزرگی پر شاہد ہے اور آپ کی کرامات وہ آثار علمیہ اور نقوش عملیہ ہیں جن سے تجدیدِ دین کا مہتم بالشان کام ظہور میں آیا لیکن ساتھ ہی آپ کی ذات بابرکت سے بیسیوں نہیں سینکڑوں واقعات ایسے بھی ظاہر ہوئے جنہیں "کرامات" کہا جا سکتا ہے اور جس کی صحیح اصطلاح انعامات الٰہیہ ہے۔

پہلی کرامت جو ہر شخص کو نظر آتی تھی، وہ حضرت کے وقت میں حیرت خیز برکت تھی۔ اسی کی بنا پر آپ تنِ تنہا وہ خاص علمی وفنّی کام کر گئے جو اتنی مدّت میں ایک متحدہ جماعت سے بھی بمشکل انجام پا سکتا ہے، آپ بہت کم بیمار پڑتے تھے اور اگر ہوتے بھی تو جلد شفایاب ہو جاتے تھے۔ جس مضمون یا مسئلے کی تلاش ہوتی، غیب سے اس کے سامان مہیا ہو جاتے تھے: مثلاً شرح مثنوی مولانا روم لکھتے وقت کبوتر بازی کی ایک اصطلاح کا مفہوم جاننے کی ضرورت پیش آئی ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ایک کبوتر باز تعویذ لینے آیا اور اس سے وہ بات معلوم ہو گئی۔

ایک شخص کا نام کلیم اللہ تھا۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بیمار رہتا۔ ایک مرتبہ آپ کے پاس آیا، تو آپ نے نام بدل کر سلیم اللہ رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ اس تبدیلیٔ نام کی وجہ آپ نے خود بیان فرمائی کہ "کلیم" کے معنیٰ "جراحت" کے بھی ہیں اس لئے نام بدل دیا۔ ایک صاحب کا لڑکا کوئی

نو دس برس کا نہایت غبی اور کُند ذہن تھا، آپ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپ نے مزاحاً و تفریحاً اس کا سر اپنے سر سے ٹکرایا، بس اس کے بعد لڑکے کا ذہن تیز ہو گیا۔ اور یہ تو روزانہ ہی کا معاملہ تھا کہ جو کوئی اپنے ذہن میں اشکال یا غلط خیالات لے کر آتا، اس کے اظہار سے قبل ہی وہ جواب پا کر مطمئن ہو جاتا۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری علیہ الرحمۃ بیان کرتے تھے "ایک دفعہ مجھ پر دو سو روپے قرض ہو گیا اور اس کے ادا کرنے کی فکر لاحق تھی۔ ایک موقع ایسا آیا کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا، تو قرض ادا ہو جاتا، لیکن عین انہی دنوں میں تھانہ بھون جانے کا قصد تھا، اس لئے ہمت کر کے حضرت کی خدمت میں حاضری ہی کو ترجیح دی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ احقر کو حضرت کی مجلس میں کلام کی اجازت نہ تھی۔ جب میں تھانہ بھون حاضر ہوا اور حضرت کو سلام عرض کرنے کے بعد مصافحہ کیا، تو آپ نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے تین مرتبہ جوش سے فرمایا، "دو سو روپیہ بھی کوئی چیز ہے، علماء کی جوتیوں کی گرد ہے"۔ بس اس جملے سے میری ساری تشویش دُور ہو گئی اور جب امرتسر واپس گیا، تو بہت جلد غیب سے امداد ہوئی اور وہ قرض خدا کے فضل سے ادا ہو گیا۔"

علی گڑھ کی نمائش میں حضرت کے ایک معتقد نے دکان لگائی تھی۔ ایک روز عین اس وقت جبکہ گاہکوں کا ہجوم تھا، ان کے قلب میں وحشت سی شروع ہوئی اور وہ نقصان کا خیال کیے بغیر سامان قبل از وقت سمیٹنے اور صندوقوں میں بھرنے لگے۔ صندوق بھر چکے تھے کہ اچانک نمائش میں آگ لگ گئی۔ انہیں پریشانی ہوئی کہ اکیلے ایسے وزنی صندوق کیونکر اٹھائے جائیں۔ کیا دیکھتے ہیں

کہ سامنے سے حضرت تھانویؒ چلے آتے ہیں اور آتے ہی فرمایا: "جلدی کرو!"
چنانچہ ایک طرف سے انہوں نے اور دوسری طرف سے حضرتِ شیخ نے ایک
ایک صندوق اٹھایا اور محفوظ مقام پہ پہنچا دیا۔ جب سارا سامان اٹھ چکا، تو
حضرت وہاں سے غائب تھے اور در حقیقت آپ اُس وقت تھانہ بھون میں
تھے۔ جب آپ سے یہ واقعہ بیان کیا گیا، تو فرمایا: "مجھ کو اس کی خبر نہیں، البتہ
بعض اوقات حق تعالیٰ کسی کی دستگیری اور اعانت اس صورت سے فرماتے ہیں
کہ لطیفۂ غیبیہ کو مانوس شکل میں ظاہر فرمادیا اور اس کے ذریعے کام بنوادیا اور
خود اس شکل والے کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔"

۱۳۳۷ھ تک ملک کے اکثر مقامات اور شہروں میں پیغام حق کی منادی
کر کے وقت آیا کہ آپ ہمیشہ کے لیے خانقاہِ امدادیہ ہی میں عزلت نشین ہو
ہو جائیں۔ فتق (HERNIA) کا عارضہ لاحق ہوا۔ طبیبوں نے سفر کی قطعاً ممانعت
کر دی۔ حضرت نے اعلان فرمادیا کہ اب کوئی سفر کی دعوت نہ دے۔ ویسے دمِ آخر
تک زائرین خانقاہ کو ملفوظات کے اور طالبین کو مکتوبات کی راہ سے برابر مستفیض
فرماتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے چلنے پھرنے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی
تھی؟ ساٹھ برس کی جدّ وجہد اور ہمت سے ہزاروں کی سیرتیں بن چکی تھیں
سینکڑوں "سیرت گر" تیار ہو چکے تھے جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے
اپنی اپنی جگہ تبلیغ و رشد میں مصروف تھے، چنانچہ آخری زمانۂ حیات میں جب
علامہ سید سلیمان ندوی کا تعلق خانقاہِ اشرفیہ سے قائم ہوا۔ تو خود حضرت تھانوی
نے کئی بار فرمایا:۔ اب میرا کیا کام ہے۔ بحمد اللہ مجھے اطمینان ہے کہ میرے مذاق

کو سمجھنے والے موجود ہیں

پانچ سال کی طویل مدت علالت میں حضرت برابر تحریری، تقریری افاضات بدستور فرماتے رہے۔ لکھنؤ، سہارنپور، تھانہ بھون غرض جہاں رہے ایسے ایسے نافع، مؤثر اور پرجوش ملفوظات سننے میں آتے رہے اور ارشاد و تلقین کی اتنی اتنی طویل مجلسیں منعقد ہوتی رہیں کہ عقل دنگ تھی کہ ایسے سخت مرض میں اتنی مشقت برداشت کرنا حیرت انگیز امر ہے۔ بعض طبیبوں نے اس سے روکنا چاہا، تو حضرت نے فرمایا: "جب میں کوئی خدمت ہی نہ کر سکا، تو پھر میرے زندہ رہنے کی ضرورت کیا ہے"؟ پیروں پر اکثر ورم رہتا تھا، لیکن اس کی طرف کبھی التفات نہ فرماتے۔ کوئی توجہ دلاتا، تو فرما دیتے کہ علاج ماہر اور خیر خواہ طبیب کے سپرد ہے۔ حالات کا پہنچانا سمجھ دار تیمار داروں کے سپرد ہے پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ فکر میں پڑوں؟ حضرت کے اس طرز سے یہ محسوس ہوتا کہ علاج صرف عالم اسباب میں ہونے کی حیثیت سے کرا رہے ہیں، ورنہ نتیجے کے لحاظ سے نظر مسبب الاسباب پر ہے۔

اگرچہ دوا اور پرہیز سے تنگی کا اظہار فرماتے رہتے، لیکن طبیبوں کا بے حد لحاظ رکھتے اور حتی الامکان ہدایات پر سختی سے عمل کرتے۔ جب کسی چیز کو جی چاہتا، تو طبیبوں کو دکھا کر بلکہ چکھا کر اجازت نہ لے لیتے، نوش نہ فرماتے اور جب کسی طبیب کو بدلتے، تو ایسی لطیف تحریر اس کے پاس بھیجتے کہ اُسے ذرا ناگواری نہ ہو اور دوبارہ رجوع کی ضرورت میں شرمندگی نہ ہو۔ فرماتے تھے: "طبیب کا بدلنا تو بُرا نہیں، لیکن علاج کے دوران میں دخل دینا فن کی توہین کرنا ہے۔ آہستہ

آہستہ حضرت پر اکثر غنودگی کا عالم طاری رہنے لگا اور حاضرین گھنٹوں خاموش حسرت سے دیکھتے ہوئے بیٹھے رہتے تھے، جب اتفاق سے حضرت چونکتے، تو اظہارِ شرمندگی فرماتے کہ میں تو کبھی خاموش پڑا رہنے والا نہ تھا، لیکن کیا کروں، آنکھیں بند ہوئی ہی جاتی ہیں۔ غنودگی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس میں مرض کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اور یہ تو حضرت کا دائمی حال تھا کہ ہر حال میں حق تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے رہتے تھے۔ تکلیف میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو ایسا نکال لیتے جو قابلِ شکریہ ہو۔

شدید علالت کی خبر اِدھر اُدھر پہنچانے کی خدام کو ہمیشہ ممانعت تھی۔ کسی کی اعانت کسی کام میں حتی الامکان نہ لیتے۔ اگر کوئی سبقت کرتا، تو ناگواری کے ساتھ منع کر دیتے۔ صاحبِ فراش ہونے سے پہلے اگرچہ چلنے میں نہایت دشواری ہوتی اور قدم لڑکھڑاتے، لیکن کسی کا سہارا نہ لیتے بلکہ ملازم کو ساتھ رہنے کی ہدایت فرماتے تاکہ گرنے لگیں، تو ہاتھ پکڑ کر سہارا لے لیں۔ جب بالکل مجبور ہو گئے اور نقل و حرکت کے قابل بھی نہ رہے، اُس وقت بیٹھنے کے لئے دوسرے کا سہارا لیتے۔ بعض اوقات خدام اور ملازم مرضی کے مطابق کام کو نہ کر پاتے، تو اس عنوان سے اظہارِ ناراضی کرتے کہ میں تو سب کام ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کرتا تھا، مگر اب اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کا محتاج کر دیا ہے۔ اس لیے مجبور ہوں۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب سے فرمایا: "دیکھیے خواجہ صاحب! طبیعت کے ضعف کی تو یہ حالت اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ سخت مزاج ہے۔ میں کیا کروں، اللہ تعالیٰ نے طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ذرا سی بے ڈھنگی بات کا مجھ پر اتنا

اثر ہوتا ہے کہ دوسرے کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے حضرت کی خدمت میں کچھ عرصے احقر کارات کو بھی رہنا ہوتا تھا۔ اُس وقت اندازہ ہوا کہ واقعی حضرت کو ذراسی اذیت کا اثر بھی بے حد ہوتا ہے یہاں تک کہ بستر میں ذراسی شکن بھی پڑ جاتی، تو فوراً پیروں سے محسوس فرمالیتے اور اسطرح سِسکیاں بھرنے لگتے جیسے کوئی کانٹا چُبھ رہا ہو۔ ایک بار فرمایا: "مجھے شکن ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے کسی نے لکڑی اُڑا کر رکھ دی ہو۔ ایک مرتبہ مزاحًا فرمایا: نانا شاہ تو نازک مزاج تھا ہی، میں بھی بابا شاہ ہوں اور با نانا سے افضل ہوتا ہے (کیونکہ کپڑا، کپڑا اسی سے ہوتا ہے۔ کاغذ اُلٹنے میں جو خفیف سی آواز ہوتی ہے وہ بھی کانوں پر اتنی ثقیل ہوتی تھی کہ پریشان ہوکر رہ جاتے اور فوراً منع فرماتے۔ غرض دوائیں حضرت کے لئے بیحد تکلیف دہ تھیں اور فرماتے تھے جب دوا سامنے آتی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پھانسی پر چڑھنا ہے۔ اسی طرح پرہیز کا بھی تحمّل نہ تھا۔ اکثر طبیب پرہیز سختی کے ساتھ کراتے کہ مرض ہی سخت تھا اور حضرت کی یہ حالت کہ نامرغوب غذا کسی طرح کھا ہی نہ سکتے تھے۔ حلق سے نہ اُترتی چاہے جتنے فاقے ہو جاتے۔ آخری روز بھی اسی قسم کی شکایت کی اور دوا پینے سے گریز فرمایا، تو خواجہ صاحب نے عرض کیا حکیم صاحب کو خود اس کا بہت اہتمام ہے کہ جہاں تک ہوسکے لطافت کی رعایت رکھی جائے، لیکن وہ دوا کو غیر دوا تو بنا سکتے نہیں۔ یہ سُن کر فرمایا: اس سب کا جواب یہ ہے۔ ؏ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

۲۰ر جولائی ۴۳ء کی صبح کھُل کر اجابت ہوئی، ورم بھی بالکل اُتر گیا۔ اُس

وقت یہ معلوم ہوا کہ سارا بدن صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہے اور کچھ نہیں۔ حضرت نے فرمایا آج تو ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔ ایک روز پہلے بائیں پاؤں کے پنجے پر ورم تحلیل ہو جانے کے بعد سخت ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں، پھر ظہر کے بعد تنفّس کی شکایت پیدا ہوئی۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا بیان ہے: احقر سمجھا کہ ویسے ہی شکایت ہے جو جاتی رہے گی۔ یہ خبر نہ تھی کہ دَم اُکھڑ گیا ہے اور یہ پیش خیمہ ہے سفرِ آخرت کا... حضرت نے بھی فرمایا کہ اتنی شدید تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی اور بجائے کراہنے کے اللہ اس انداز سے کہا کہ مجھے تشویش ہو گئی کہ بہت تکلیف ہے۔ بظاہر گھبراہٹ کے آثار نہیں پائے جاتے تھے اور اُسی وقت کیا تمام بیماری میں آخر تک سراسیمگی یا بےتابی کسی وقت طاری نہیں ہوئی ہر حال میں کوہِ استقلال بنے رہے۔ کبھی آرام کا پہلو اختیار نہ فرمایا۔ عُمر بھر طالب علمانہ انداز میں، سارا سامانِ راحت ہوتے ہوئے بھی مشقّت کی زندگی بسر فرمائی۔ خود کہتے تھے کہ میں نازک مزاج تو ہوں لیکن خدا کا شکر کرنا نازک بدن نہیں۔ بجز قیلولے کے وقت کے، دن پر تخت پر نشست رکھتے اور تخت پر بھی طولاً نہیں، عرضاً جس کی وجہ سے پاؤں بھی نہ پھیلا سکتے تھے۔ کہتے تھے کہ چارپائی پہ بیٹھنے میں آرام نہیں ملتا اور یہ بات بھی طبیبوں اور خادموں کے عرض کرنے پر فرماتے۔ زندگی کے آخری دنوں میں اکثر پاؤں سُکیڑے ہوئے رہتے اور بار بار نیند کے جھونکوں میں گر پڑتے۔ شب کو بھی گاؤ تکیہ لگا کر سوتے جس میں سر اونچا رہتا اور غنودگی میں پیچھے کو گر گر پڑتا۔

بائیں ہاتھ کی کہنی میں بہت بڑا داغ پڑ گیا تھا اور کھال سخت ہو گئی تھی

کیونکہ طالب علمی کے زمانے میں کہنی زمین پر ٹیک کر لکھنے کی عادت رہی۔ جب گھر کے برآمدے میں دھوپ بالکل پلنگ کے قریب آجاتی، تو عرض کیا جاتا کہ پلنگ سرکا لیا جائے۔ اس پر فرماتے کہ دھوپ جارہی ہے۔ گرمی کی شدّت میں عرض کیا گیا بجائے برآمدے کے اندر کمرے میں رہا جائے۔ فرمایا: اب تو برسات آرہی ہے۔ غرض برآمدے میں گرمی جاڑا، برسات سب موسم کاٹ دیئے، حالانکہ طبیعت ایسی حسّاس تھی کہ موسم کا ذرا سا تغیّر بھی اثر کرنے لگتا تھا۔ آخر میں حرارت عزیزیہ بہت کم ہوگئی تھی۔ سخت گرمی میں بھی گرمی محسوس نہ ہوتی تھی اور چادر اوڑھے رہتے تھے۔ سامان سب بالکل سادہ رکھتے۔ لوگ عمدہ سے عمدہ چیز پیش کرتے، مگر اکثر و بیشتر خود استعمال نہ فرماتے۔ گاڑھے کی جو چادر بستر پر تھی، وہی آخر دم تک رہی۔ ہنسی اور مزاح آخر میں بالکل موقوف ہوکر رہ گیا تھا، لیکن طبیعت میں جودت ویسی ہی۔ سب سے اعلیٰ اور سب سے ارفع عملِ باطنی تو کیفیت فنا و عبدیت تھی جو ہر وقت حضرت پر نہایت شدت کے ساتھ طاری رہتی تھی اور جس کے اثر سے متاثر ہوکر بارہا یہاں تک فرمادیا کرتے تھے کہ میں تو اپنے کو کتوں اور سوروں سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ ایک بار فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایسا مراقبہ دل میں ڈال دیا ہے کہ ظاہری یا باطنی کیسی ہی پریشانی لاحق ہو، میں بے چین نہیں ہوتا۔ وہ مراقبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی۔ حاکم ہونے کی حیثیت سے تو انہیں ہمارے ظاہر و باطن میں ہر طرح کے تصرف کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ دَم مارنے کی مجال نہیں اور حکیم ہونے کی حیثیت سے اطمینان ہے کہ وہ تصرّف حاکم جابر کا سا نہ ہوگا، بلکہ حکمت

حکمت پر مبنی ہوگا، چاہے وہ حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

دنیا سے بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ کئی بار فرمایا۔ میں اپنے کو تمام عالم میں تنہا پاتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ بس دنیا میں اللہ میاں ہیں اور میں ہوں اور کوئی نہیں ہے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے محبّت تو اپنے سب احباب اور متعلقین سے ہے، لیکن ایسا تعلق کسی سے نہیں کہ دل اٹکا رہے۔ یہ تعلق تو بس اللہ تعالیٰ ہی سے رکھا جائے اگر توفیق ہو۔ فرمایا: جب کوئی متقی مرتا ہے، تو یہ خیال ہوتا ہے نہ معلوم کس بات پر گرفت ہو جائے اور جب کوئی غیر متقی مرتا ہے تو خیال آتا ہے نہ جانے کس بات پر مغفرت ہو جائے۔ بارہا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ ایسا ہے جیسے ہر موقع پر یہ فرماتے جاتے ہوں کہ دیکھ، ہم نے تیرے ساتھ یہ احسان کیا۔ دیکھ ہم نے تیرے اوپر یہ رحمت کی، دیکھ ہم نے تجھ کو یہ نعمت دی۔ بس آواز تو آتی نہیں، باقی ہوتے سب معاملات ایسے ہی ہیں جیسے ساتھ کے ساتھ جا بھی رہے ہوں..... اِن واقعات اور حالات سے معلوم ہوا کہ حضرت ہر وقت اپنے قلب اور اپنے جذبات کی کس قدر نگرانی فرماتے تھے اور انہیں کس اہتمام سے جادۂ اعتدال پر رکھتے تھے۔ فرماتے: الحمد للہ، میں کبھی اپنی طبیعت کو عقل پر اور عقل کو شریعت پر غالب نہیں آنے دیتا۔

بالکل آخر میں جب سر کنے کی بھی سکت نہ رہی، تو لیٹے لیٹے تیمّم سے اور اشاروں سے نماز ادا فرمانے لگے۔ نماز آخر دم تک کوئی قضا نہ ہونے دی نظافت کا یہ اہتمام تھا کہ اگر ذرا سی بھی نجاست لگ جاتی یا دوا وغیرہ کا

دھبّا پڑ جاتا، تو فوراً پانی منگوا کر اُسی وقت خود صفائی کر لیتے اور یہ ہمیشہ معمول رہا۔ وفات سے دو چار روز پہلے خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ سے فرمایا:
"مجھے دو چیزوں کا بہت خیال ہے نماز کا اور حقوق کا، چنانچہ نماز تو آخری وقت تک حضرت نے پڑھی اور حقوق کی ادائیگی تو حضرت کا آخری ہی عمل تھا۔ روزوں کا اتنا اہتمام تھا کہ ضعف اور مرض کے باوجود گذشتہ رمضان شریف کے پورے روزے رکھے اور اس سے پہلے کے رمضان کے وہ روزے جو علاج کے دوران میں قضا ہوئے تھے، ایک ایک کر کے سب رکھ ڈالے۔ انہی دنوں انتہائی کمزوری کے باوجود ایک روزہ پھر بھی امتحاناً روزہ رکھ کر دیکھا اور فرمایا: "اس تصوّر ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ سب تو روزے سے ہوں گے اور میں نہ ہوں گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے شریفوں میں چمار بیٹھا ہوا ہے۔

خدماتِ مالیہ کا یہ حال تھا کہ شروع ہی سے برابر زکوٰۃ کے علاوہ چوتھائی حصہ صدقات نافلہ میں صرف فرماتے۔ اس طرح ربع آمدنی کے حساب سے اپنی عمر میں ہزاروں لاکھوں روپے صدقات میں صرف کیے، بلکہ ترکے کا چوتھائی حصہ کار ہائے خیر میں خرچ کیے جانے کی وصیت فرما گئے۔ کوئی سائل خالی نہ جاتا۔ حسبِ گنجائش ضرور کچھ نہ کچھ خدمت کرتے۔ اہلِ خانقاہ، اہلِ قصبہ، متعلقین، غیر متعلقین، مقامی، بیرونی سب حاجتمندوں کی ضروریات پر جہاں تک علم ہو سکتا، نظر رکھتے اور حسبِ موقع مدد کرتے۔ بڑے بڑے چندے بھی کارِ خیر میں دیتے رہتے۔ اکثر دیکھا کہ کبھی کپڑے

مساکین میں تقسیم کیے جا رہے ہیں، کبھی نقد، کبھی کھانا، خیرات بھی بڑے انتظام اور اصول سے کرتے جیسا ہر چھوٹے بڑے کام میں معمول تھا قرض دینے کی بھی الگ مد تھی۔ محض اعتماد کے مواقع پر بڑی بڑی رقمیں بے تامّل بطور قرض عطا فرمادیتے۔ جو لوگ قرض واپس نہ دے سکتے اکثر و بیشتر معاف کر دیا کرتے تھے۔ مزاج میں استغنا حد درجہ تھا۔ کسی کا ہدیہ خواہ کتنا بڑا ہو، اگر اصول کے خلاف ہے، تو ادنیٰ تامّل کے بغیر واپس کر دیتے۔ صدقاتِ مالیہ جاریہ بھی حضرت نے بہت کیے۔

لیکن اب ... مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں "سورج ڈوبنے کو تھا۔ شفق پھول چلی تھی۔ عین اُسی زمانے اُردو کے مشہور شاعر جگؔر مرادآبادی نے ایک فارسی غزل پانچ شعروں کی "تشنہ لبی خوشم، بوالعجبی خوشم" کی زمین میں لکھ کر اور پانچوں شعر رنگین و پُر بہار حضرتؒ کی خدمت میں نذرانے کے طور پر بھیجی۔ حضرت باضابطہ شاعر تو پہلے بھی نہ تھے اور اب اس وقت تو ضعف و انحطاط نے جسم و دماغ پر بالکل ہی قابو پالیا تھا، اس پر بھی جو شعر جواب میں لکھ کر بھیجا، وہ اپنی نظیر آپ ہے ؎

نہ بہ نثرِ ناثرِ بے بدل، نہ بہ نظمِ شاعرِ خوش غزل
بہ غلامی شہِ عزّوجلّ و بہ عاشقی نبی خوشم

اس شعر کے ساتھ جو مختصر خط حضرت نے جگؔر صاحب کو لکھا تھا وہ بھی اپنی بلاغت اور رنگینیٔ عبارت میں کچھ کم دلآویز نہ تھا۔"

مئی اور جون کے مہینے تو خیر کٹ گئے۔ جولائی سے پھر بڑی تشویش کی خبریں

آنے لگیں، لیکن مسلسل نہیں، بلکہ افاقے کے درمیانی وقفوں کے ساتھ..... اور آہ.... انسان کی فریب خوردگی کہ طبیعت انہی عامی اور وقتی افاقوں کا سہارا ڈھونڈتی رہی.... جولائی کی غالباً ۱۳ ر تاریخ تھی تھانہ بھون سے اطلاع آئی کہ حضرت پر مسلسل غفلت اور غنودگی طاری ہے۔ طبیب اپنی مادی اصطلاحوں میں جسے غفلت اور غنودگی سے تعبیر کر رہے ہیں، یہ تو سب سامان، خلق سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ و یکسوئی کے حصول کے ہو رہے ہیں۔ ۱۶ ر جولائی کو دوپہر کو خواجہ صاحب مجذوب، حضرت کے عاشق زار اور خلیفۂ خاص کا کارڈ ملا۔ لکھا تھا: لقافے کی صورت معلوم ہو رہی ہے، ضعف بے انتہا ہے، خدا کرے روز بروز صحت اور قوت ہوتی چلی جائے۔

اس خط سے دِل کو ڈھارس آن کی آن ہوئی، ٹوٹی ہوئی امید ذرا کی ذرا بندھی شائد کہ امت محمدیہ کو وقت کی اس نعمت عظمٰی سے فائدہ اٹھانے کی کچھ اور مہلت مل گئی ہو۔ کسے خبر تھی کہ عین جس وقت یہ تسلی نامہ پڑھ رہا تھا، ساعتِ موعود اتنی قریب آگئی تھی۔ آفتاب علم و عرفان کی آخری کرنیں بھی روپوش ہونے کو تھیں۔ اللہ تعالٰی کی رحمت نا اہلوں اور ناقدرے لوگوں سے واپس لی جارہی تھی۔ رسولِ اسلام کا ایک سچا جانشین اپنے مالک و مولٰی کے دربار میں حضوری کے لئے بے قرار ہو رہا تھا، لشکرِ اسلام کا جری اور دلیر، اپنے وقت کا بڑا جرنیل، دین کے ہر ہر محاذ، ہر ہر معرکے، ہر ہر مورچے کا دلاور، اپنے جسم کا پور پور دین کی راہ میں چُور چُور کیے ہوئے، قلب خاشع اور نفسِ مطمئنہ کے ساتھ عالمِ ناسوت کی بالکل آخری منزلوں سے گزر رہا تھا۔

حضرت کی چھوٹی بیوی نے نزع کے وقت دیکھا کہ جب سانس زور سے اوپر کو آتا، تو داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی کے درمیان پُشت کی طرف ایک تیز چمک جگنو کی سی پیدا ہوتی تھی اور اس کے باوجود کہ بجلی کے دو قمقمے اُس وقت تک روشن تھے پھر بھی اس کی چمک غالب ہوجاتی تھی، پھر دوسرے سانس میں غائب ہوجاتی۔ جب دیر تک ایسا ہی ہوتا رہا، توانہوں نے دوسری مستورات کو جو اُن کے قریب تھیں، متوجہ کیا۔ سب نے دیکھ کر تصدیق کی۔ سانس بند ہوجانے کے بعد وہ چمک بھی بند ہوگئی۔ یہ عجیب واقعہ سُن کر ایک اہلِ علم اور صاحبِ ذوق نے نہایت لطیف توجیہہ بیان کی اور کہا کہ عجب نہیں یہ نور اس وجہ سے ظاہر ہوا ہو کہ انہی دو انگلیوں سے بڑے بڑے علوم اور دقائق اور معارف وحقائق طویل مدّت تک معرضِ تحریر میں آتے رہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی برابر یٰسین شریف پڑھتے رہے اور آبِ زمزم چمچے سے دہن مبارک میں ڈالتے رہے۔ عشاء سے بہت پہلے غشی طاری ہو گئی تھی، پھر آخر وقت تک ہوش نہ آیا۔ رات بھر بہت سے علماء کرام حاضرِ خدمت رہے۔ صبح متعدد صلحاء وعلما نے سنت کے مطابق اچھی طرح غسل دیا۔ یہ منظر دیکھ کر کوئی آنسوؤں سے، کوئی دل سے اور کوئی چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ پانچ سال کی اس طویل وشدید علالت نے سوائے استخواں کے کچھ چھوڑا ہی نہ تھا۔ تجہیز وتکفین کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ اس وقت ایک کہرام برپا تھا۔ اکثر افراد کلمۂ توحید پڑھ رہے تھے۔ یکایک ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ گھر سے

خانقاہ تک جنازے کو سنبھال کر لانا دشوار ہو گیا۔ مخلوقِ خدا بے تابانہ، مثلِ پروانہ ٹوٹی پڑتی تھی۔ نماز جنازہ حضرت کے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی اور "قبرستانِ عشق بازاں" میں اس خزینۂ اشرفی کو دفینۂ جواہرات علمیہ و عملیہ کی صورت میں منتقل کر دیا ہاتھ جھاڑے، سب فاتحہ پڑھنے کو کھڑے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ بے شمار حضرات نے برجستہ مادہ ہائے وصال کہے۔ ان میں مقربِ عظیم، لقد اُوْتِیَ خیرًا اور اشرف علی نوّر اللّٰہ مرقدہٗ، الہامی مادے ہیں۔ ان سب سے سالِ وفات ۱۳۶۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ خاکسار راقم الحروف نے بھی "چراغِ محفل" سے سنِ وصال برآمد کیا ہے۔

حضرت کی وفات سے چند ماہ بعد مولانا عبد الماجد دریا بادی مزار کی زیارت کے لئے آئے۔ گذشتہ پندرہ برسوں میں بارہا تھانہ بھون آئے تھے لیکن اب کی مرتبہ آنا اور طرح کا تھا، نظریں کسی کو ڈھونڈتی ہوئیں، دل کسی کو تلاش کرتا ہوا۔ آئیے ان کے ساتھ مزارِ اشرف پر چلیں "تھانہ بھون اسٹیشن پر اُترا اور سیدھا مزار پر حاضر ہو گیا۔ اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا، پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں، اور مزار..... آہ مزار؟ نہ کوئی بلند گنبد، کوئی کلس دار قبّہ، نہ چار دیواری نہ "آستانہ"، نہ جنگلہ نہ کٹہرا.... ایک اوسط درجے کی وسعت کا باغ، ایک سمت میں مختصر پُر فضا عمارت، وسطِ باغ میں چند گز مربّع کا ایک مسطح تختہ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ، نہ شامیانہ نہ چھت، صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت۔ سادگی کی تصویر، صاحبِ قبر کی بے نفسی کا آئینہ، نہ لوح نہ کتبہ نہ پھول

نہ چادر۔ چند قدم کے فاصلے پر دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے ہی سے پہنچے ہوئے۔ شیخ کی قبران سب قبروں سے بھی پست..... زندگی میں بھی تو اپنے کو اپنے متوسّلین سے پیچھے رکھتے تھے، تصوّر کی آنکھ نے کیا کیا دیکھا، تخیّل کے کان میں کیا آوازیں آئیں، کوئی کہے بھی تو کس زبان میں کہے۔

ع ایں حدیثے را بیان دیگر ست

(بشکریہ قومی ڈائجسٹ جولائی ۷۸ء)

مقالہ نمبر ۱۶
حکیم الامت
حضرت تھانوی
علیہ الرحمۃ
جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے
حضرت مولانا محمود اشرف صاحب عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان عظیم جامع صفات لوگوں میں سے ہیں جن کی علمی اور عملی زندگی کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔

وہ عظماء کی طرح اپنی زندگی کے ہر پہلو میں اتنے بھرپور نظر آتے ہیں کہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است۔

ان کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو ہم آسانی کے لئے مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کر رہے ہیں۔

ایک مفسر، ایک فقیہہ، ایک مرشد، ایک خطیب ایک سیاسی رہنما اور ایک عظیم مصنف۔

بحیثیت مفسر سے ان کا کیا مقام ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان کی مشہور تفسیر "بیان القرآن" اور ان کے ترجمہ قرآن سے لگایا جا سکتا ہے جو تقریباً ہر مکتب فکر کے نزدیک مسلم ہے اور ہر گھر میں پڑھا جاتا ہے۔ تفسیر "بیان القرآن" کہنے کو تو ایک مختصر تفسیر ہے مگر حضرت مفتی محمد شفیع "مفتی اعظم پاکستان اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی شیخ الحدیث کے بقول اس کی عظمت اور گہرائیوں کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے قدیم وجدید مشہور تفاسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد اس تفسیر سے

رجوع کیا ہو۔ حضرت تھانویؒ نے تفسیر میں اس بات کی کوشش فرمائی ہے کہ مشہور مفسرین کے اقوال میں جو قول سب سے راجح اور صحیح ہو۔ اس کو اپنی کتاب میں درج کریں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خلاصۂ تفسیر کے اندر ترجمہ کے مابین، بریکٹ میں، بسا اوقات حضرت تھانویؒ کا رکھا ہوا لفظ، تمام سابقہ تفاسیر میں سے سب سے صحیح قول کی جانب ایک حسین اشارہ ہوتا ہے۔ جس کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب قاری قدیم تفاسیر کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد ایک صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے، اور اس نتیجہ کی جانب حضرت تھانویؒ نے بریکٹ میں پہلے اشارہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ تفسیر بیان القرآن میں اس علمی گہرائی کے اہتمام کے باوجود تفسیر کی زبان اتنی سلیس اور مطلب اتنا واضح ہوتا ہے کہ ایک عام قاری بھی کسی قسم کی خلش محسوس کئے بغیر بآسانی قرآن کا مفہوم سمجھتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر "بیان القرآن" اب تک علما اور عوام دونوں طبقوں میں یکساں مقبول چلی آرہی ہے۔

تفسیر بیان القرآن سے بھی بڑھ کر حضرت تھانویؒ کے ترجمۂ قرآن کو مقبولیت عامہ نصیب ہوئی۔ بہت کم خاندان ایسے ہوں گے جہاں حضرت تھانویؒ کا ترجمۂ قرآن ایسے وقت لکھا گیا جب اس سے قبل قرآن حکیم کے کئی مستند تراجم مشہور علماء کے تحریر فرمودہ موجود تھے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمے عوام و خواص میں متعارف و مقبول تھے۔ مگر شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ خالص لفظی ترجمہ تھا۔ جبکہ شاہ عبدالقادرؒ اور شیخ الہندؒ کے ترجمے اگرچہ بامحاورہ اردو میں تھے۔ مگر زبان بدلنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ نامانوس ہوتے جارہے تھے۔ ان تین حضرات کے علاوہ بھی قرآن مجید کے کچھ اور ترجمے بھی ملتے تھے۔

مگر وہ یا تو کسی خاص مسلک کے لوگوں ہی میں متعارف تھے ، یا پھر علماء ان سے اس بناء پر مطمئن نہ تھے کہ ان ترجموں میں قرآن حکیم کے الفاظ سے کہیں زیادہ اردو زبان کی نوک پلک درست کرنے پر توجہ دی گئی تھی۔ جس سے کئی مقامات پر قرآن حکیم کا ترجمہ اس کے اصل مفہوم سے ہٹ گیا تھا۔ ان حالات میں حضرت تھانوی ؒ نے قرآن حکیم کا یہ ترجمہ کیا جو ایک طرف سلیس ، با محاورہ اور آسان زبان پر مشتمل تھا۔ اور دوسری جانب اس میں قرآن حکیم کے اصل مفہوم کو باقی رکھنے کی پوری نگہداشت کی گئی تھی۔ چنانچہ زندگی کے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے جن میں عوام سے لے کر علماء تک سبھی شامل تھے ، اس ترجمہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وسیع تر پیمانے پر اس کی اشاعت ہوئی جو آج تک مسلسل جاری ہے۔ یہ دو مختصر سی باتیں ہیں۔ جن سے حضرت تھانوی ؒ کے بحیثیت مفسر ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ جہاں تک قرآن حکیم کی خدمت کا تعلق ہے ، ان مذکورہ بالا دو چیزوں کے علاوہ قرآن اور علوم قرآن سے متعلق حضرت تھانوی ؒ نے اور بھی کتابیں تحریر فرمائیں ۔ یا اپنی نگرانی میں ان کو مرتب فرمایا۔ ان میں سے "احکام القرآن"، علمی دلائل ، مسائل النعمان" کے کے حصے (عربی) کی ضخیم کتاب۔ الفاظ القرآن ، جمال القرآن ، آداب القرآن اور اس جیسے کئی دیگر رسائل شامل ہیں۔

بحیثیت فقیہہ کے مولانا تھانوی ؒ کے مرتبہ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دور میں فتوٰی کے معاملہ میں مرجع عوام و خواص رہے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے کتنے قدیم و جدید مسائل تھے جن کے شرعی حل کے لئے مولانا سے رجوع کیا جاتا رہا۔ امداد الفتاوٰی جو چھ جلدوں میں اسلامی مسائل کا انسائیکلو پیڈیا ہے

اس کی روشن مثال ہے۔ اس موضوع پر حضرت تھانویؒ کا اہم کام یہ ہے کہ دورِ حاضر کی مشینی زندگی نے جن نئے مسائل کو پیدا کیا اور جن میں سابقہ قدیم فقہ کی کتابوں سے واضح اور صریح حکم نہیں ملتا تھا حضرت تھانویؒ نے ان مسائل میں اسلامی اصول کے مطابق اور اسلامی مآخذ سے دلائل دیتے ہوئے شریعت کا حکم واضح کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ نے ایک اہم احتیاط یہ ملحوظ نظر رکھی کہ ان مسائل کا حکم تحریر کرتے وقت اپنی انفرادی رائے کو کبھی حتمی اور آخری قرار نہیں دیا، بلکہ اولاً اپنے اساتذہ ہمعصر علماء بلکہ اصاغر تک سے ان مسائل کے حل کرنے میں ان کی رائے لیتے، اس پر مختلف مجالس اور مختلف انداز سے غور و فکر فرماتے۔ اور پھر اپنی کوئی رائے قائم فرماتے۔ پھر ثانیاً یہ کوئی رائے نافذ کرنے کے بعد بھی کبھی اس پر جمود نہ فرماتے۔ بلکہ ہر تنقید و بحث کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے اور اگر مخالف کی بات حق کے زیادہ قریب معلوم ہوتی تو بلا کسی جھجک کے اسے قبول فرما کر اس کا اعلان عام فرما دیتے۔ یہ وہ خاص للٰہی صفت ہے۔ جو آجکل کے محققین اور مصنفین میں عام طور سے نایاب ہے۔ اور حضرت تھانویؒ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ بلکہ اس سلسلہ میں آپ کا اہتمام یہاں تک پہنچا ہوا تھا کہ ایک مستند عالمِ دین کو اپنی جانب سے مشاہرہ کے ساتھ محض اس خدمت پر مامور کیا تھا کہ وہ حضرت تھانویؒ کی کتابوں میں ہر ایسی بات کو تلاش کرلے۔ جو ظاہراً جمہور علماء کے مسلک سے ہٹی ہوئی ہو۔ وہ "ترجیح الراجح" کے نام سے حضرت تھانویؒ کا مستقل مضمون تھا جس سے وہ مسائل طبع کئے جاتے۔ جن سے حضرت نے رجوع کر لیا ہوتا یا اس میں تشریح کی ہوتی یا کسی لفظ کو تبدیل کیا ہوتا۔

مولانا تھانویؒ کی یہی غایت احتیاط تھی جس نے آپ کو عوام اور علماء، دونوں

کے لئے مرجعِ علم بنا دیا تھا۔ آپ کی رائے ہر طبقہ میں سنی اور مانی جاتی تھی۔ اور آپ کی تحقیقات اس وقت سے لے کر اب تک ٹھوس، قابلِ اعتماد چلی آرہی ہیں جن سے دورِ حاضر کا کوئی مفتی اور فقیہہ مستغنی نہیں ہو سکتا۔ "امداد الفتاویٰ، الحیلۃ الناجزہ، بوادر النوادر، وغیرہ فقہ میں آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔

بحیثیت ایک مرشد اور مصلح کے، آپ نے تصوف کے میدان میں جو عظیم خدمات انجام دیں ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس شخص کو زیادہ بہتر ہو سکتا ہے جو اس دور کے دینی رجحانات سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ ۱۳۰۰ھ کے آغاز میں جب حضرت تھانویؒ نے اپنی مجددانہ تعلیم و تبلیغ کی ابتدا کی تو یہ وہ زمانہ تھا جب "تصوف" جس کو ہم آسان لفظوں میں "اسوۂ حسنہ" کی پیروی کا نام دے سکتے ہیں۔ افراط اور تفریط کا شکار تھا۔

ایک طرف دنیا پرست اور علم دین سے جاہل صوفیا کا گروہ تھا۔ جنہوں نے خانقاہوں کو جو کسی زمانے میں تطہیرِ قلوب اور تزکیۂ نفس کا مرکز تھے۔ غیر اسلامی رسوم جاہلانہ عادات اور مشرکانہ خیالات کا گڑھ بنا دیا تھا۔ جہاں سے غیر دینی طور طریقوں اور جاہلانہ رسوم کی دین اور تصوف کے نام پر کھلی تبلیغ کی جاتی تھی، اس گروہ نے دین حنیف کو چند رسوم کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ جن کو ادا کر کے آدمی دیندار کہلایا جا سکتا ہے۔ اور تصوف ان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا تھا۔ جس کی وہ جس طرح چاہتے تشریح کر لیتے اور ہندوانہ رسوم و رواج اور عجمی خیالات کی اس میں انہوں نے بھرمار کر دی تھی۔ اس گروہ کے ردِ عمل کے طور پر دوسری جانب اہل تجدد کا وہ گروہ تھا جس نے تصوف کے نام کو اپنے لیے ایک چڑ بنا لیا تھا، یہاں تک کہ تربیت، تطہیر قلوب،

اور تزکیۂ نفس جیسی دین کی اہم اور بنیادی چیزیں بھی ان کے نزدیک مذاق بن کر رہ گئی تھیں۔ افراط و تفریط کی ان دو راہوں کے درمیان علم اور اعتدال کے صحیح راستہ پر حضرت تھانویؒ وہ شمع ہدایت ثابت ہوئے جس نے افراط و تفریط دونوں کی ظلمتوں کو دور کر کے راہِ اعتدال نمایاں کی۔ اور تصوف کے صحیح اور حقیقی معنی سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ اور مدتوں کے بعد دوبارہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات تازہ کی کہ بزرگی کا اصل مدار سنتِ نبوی پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اور سب سے بڑا بزرگ اور ولی اللہ وہ شخص ہے جس کی ہر نقل و حرکت، اور ہر قول و فعل قرآن و حدیث کے میزان پر پورا اُترتا ہو۔ خواہ اس سے کرامات کا صدور ہو یا نہ ہو۔

دیندار حضرات عموماً اور صوفیاء خصوصاً حقوق العباد کے معاملہ میں جس تساہل کا شکار تھے حضرت نے اسے بھی واشگاف کیا اور اسلام میں حقوق العباد کی جو عظیم اہمیت ہے۔ اس سے لوگوں کو دوبارہ روشناس کرایا کہ حقوق اللہ تو صرف اس کا حق ہیں، اور قیامت کے روز خدا چاہے تو اپنے کسی بندے کو معاف کر دے۔ لیکن حقوق العباد تو خدا بھی اس وقت تک معاف نہیں فرماتا۔ جب تک کہ صاحب معاملہ انسان خود معاف نہ کر دے۔

تصوف پر آپ کی خدمت کا اندازہ جہاں حضرت تھانویؒ کی ان بیسیوں کتابوں سے کیا جا سکتا ہے جو آپ نے تصوف پر تحریر فرمائیں، وہاں کہیں بہتر اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جنہیں حضرت تھانویؒ کی صحبت و تربیت یافتہ حضرات کے قریب رہنے کا موقع ملا ہو۔ آپ کے تلامذہ، خلفاء اور فیض یافتہ افراد جو یقیناً ہزاروں کی تعداد میں تھے برصغیر کے کونہ کونہ میں پھیلے اور ایک جہان کو اپنے نور

سے منور کیا۔ آپ ایک سورج کی مانند تھے۔ جو آئینہ آپ کے سامنے آگیا خود سراپا سورج بن گیا۔ رَحمَۃُ اللّٰہِ رَحمَۃً وَّاسِعَۃً۔

بحیثیت خطیب کے دورِ حاضر کے نامور خطباء میں آپ کا شمار ہے۔ آپکی تقریریں جو دل سے نکلتیں، دل پر اثر کرتیں کتنے لوگ تھے جن کی زندگیاں آپ کے ایک وعظ سے بدل گئیں۔ اور اللہ کے رنگ میں رنگے گئے۔ آپ کی وہ تقاریر جو ضبط کی گئیں اور طبع ہوئیں۔ ان کی ہی تعداد تقریباً چار سو کے لگ بھگ ہے۔ ہر تقریر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے جس کا نام خود حضرت کا تجویز کردہ ہے۔ تقریر کا موضوع، تقریر کا سبب، اور تقریر کا کل وقت تک محفوظ ہے۔

بحیثیت ایک سیاسی رہنما کے اگرچہ آپ نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر سیاست میں آپ نے وہ راہِ اعتدال اختیار کی جو سلف صالحین کا اسوہ ہے۔ نہ تو آپ نے سیاست کو شجرِ ممنوع سمجھا کہ باہر دنیا میں کچھ ہو جائے۔ یہ اپنی دنیا سے نہ نکلیں، اور نہ سیاست کو اپنا مقصودِ نظر ہی بنایا کہ دینی تعلیم و تبلیغ، تصنیف و تدریس سب کو خیرباد کہہ کر صرف سیاست کا ہی ہو رہے۔ چنانچہ اسی اصول کے ماتحت آپ نے کبھی باقاعدہ سیاست میں حصہ نہ لیا۔ مگر سیاسی معاملات اور الجھنوں میں جب آپ سے رجوع کیا گیا۔ یا خود آپ نے جب ضرورت محسوس کی، بالکل واضح اور دو ٹوک انداز میں اس مسئلہ کو شریعت کی روشنی میں لوگوں پر واضح کر دیا۔ سیاسی مسائل میں رائے دیتے وقت، وقتی سیاسی مصالح سے زیادہ آپ مستقل شرعی مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھتے۔ اور اس بارے میں لوگوں کی رہنمائی کرتے۔

قیامِ پاکستان کی تحریک اور پھر یہ کہ اس کے قیام میں آپ کا اور آپ کے خلفاءُ

خصوصاً مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا جتنا حصہ ہے اور جو خدمات ہیں۔ ان کے لیے ایک مستقل مضمون درکار ہے اور بعض حضرات نے اس سلسلہ میں کام بھی کیا ہے۔ جب بھی پاکستان کے قیام کی تاریخ اور اس میں علماء کی عظیم خدمات کا ذکر کیا جائے گا۔ اس میں سرفہرست مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیع کا نام شامل ہو گا۔ حضرت تھانویؒ کی زندگی جو تدریس و تبلیغ، وعظ و ہدایت، تزکیہ و تربیت سے بھرپور نظر آتی ہے۔ گوناگوں مشاغل اور مسائل کے باوجود ایک عظیم مصنف کی حیثیت سے بھی جلوہ گر نظر آتی ہے۔ دورِ حاضر کے مصنفین میں تصانیف کی کثرت، تنوع اور مقبولیت میں کوئی مصنف آپ کے ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ ایک ہزار سے زائد تصانیف میں "بہشتی زیور" جیسی عام فہم اور مقبولِ عام کتاب سے لیکر "بوادر النوادر" جیسی تحقیقی کتاب تک سبھی شامل ہیں۔ تفسیر ہو یا حدیث، فقہ ہو یا تصوف، تاریخ ہو یا فلسفہ، ہر موضوع پہ آپ کی کئی کتابیں ہیں اور ہر کتاب علم کا مخزن ہے۔ حضرت تھانویؒ کی سیرت پر کئی حضرات نے کام کیا ہے اور آپکے کارناموں کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کی "اشرف السوانح" جو چار جلدوں پہ محیط ہے، خاص طور پہ قابلِ ذکر ہے، اس کے علاوہ کئی کتابیں، حیاتِ اشرف، سیرتِ اشرف، تحریکِ آزادی اور مولانا اشرف علی تھانویؒ، بزمِ اشرف کے چراغ، مجالس حکیم الامت بھی آپکی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جسطرح آپکی تنہا ذات نے ایک بڑی انجمن کا کام کیا ہے۔ آپکے کارناموں کو قلمبند کرنا اور ان سے لوگوں کو روشناس کرانا بھی ایک اکیلے آدمی کا کام نہیں۔ ایک پورے ادارے کا کام ہے۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

مقالہ نمبر ۱۷

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ

کے

بعض وہ خطوط

جو

ادبی چاشنی سے لبریز ہیں

از

جناب مولانا عبد الرحمٰن صاحب سیوہاروی

پیش لفظ

حکیم الامّت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی ؒ سے کون ناواقف ہے۔ اپنے زمانہ کے قطب الارشاد، مفسرِ قرآن، فقیہہ و محدث اور تصوّف کے امام صدہا تصانیف کے مصنف، ہزارہا علماء و فضلاء ان کے مرید و مسترشد، مولانا عبدالماجد دریابادی ؒ کہ جن کا شمار خود بھی ہند و پاک کے بلند پایہ مصنفوں اور صاحبِ طرز ادیبوں میں تھا، مولانا تھانوی ؒ سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے مختلف موضوعات پر صدہا خطوط کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا، ۱۹۴۸ء میں ان ہی مکتوبات کو "نقوش و تاثرات" کے نام سے مولانا دریابادی ؒ نے شائع کیا جو ایک بیش بہا علمی خزانہ ہے، مولانا تھانوی ؒ کا طرزِ تحریر خالص عالمانہ ہے مگر ہندوستان کے علماء کی خصوصیت ہے کہ ان کا تعلق ادب سے بھی برابر گہرا رہا، حضرت تھانوی ؒ نے مثنوی شریف جیسی فارسی کی بلند ادبی حیثیت رکھنے والی کتاب کی شرح بھی لکھی، اس لیے مواعظ و مکاتیب میں جابجا فارسی اشعار نظر آتے ہیں نیز حضرت کی بعض لطیف عبارتیں ایسی ہیں کہ طبیعت پڑھ کر اچھلنے لگتی ہے، حضرت تھانوی ؒ کا ادبی ذوق بلند تھا مگر ان کے ہاں ادب برائے اصلاح تھا اور بس۔

ان مکتوبات میں سے بعض وہ جن میں ادبی چاشنی پائی جاتی ہے بطور نمونہ پیش خدمت ہیں، کاش کہ حضرت تھانوی ؒ کے ان جملہ مکاتیب کو جو ہند و پاک کے بہت سے علماء و فضلاء کے پاس موجود ہیں، جمع کر لیا جاتا تو علم کا ایک نادر خزانہ ہاتھ آجاتا، اللہ تعالےٰ کسی بندہ کو جمع و ترتیب کی توفیق عطا فرمائے۔

(۱)

مولانا عبدالماجد القادری البدایوانی صاحب نے شارڈا ایکٹ کے خلاف کانپور میں ایک جلسہ طلب کیا تھا، حضرت اقدس تھانویؒ کو بھی اس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ مع ایک مکتوب ارسال کیا گیا۔ مولانا بدایوانی صاحب اور حضرت تھانویؒ میں عقائدی اختلاف تھا مگر حضرتؒ نے جس انداز میں جواب تحریر فرمایا وہ قابل داد ہے

از ناکارہ و آوارہ اشرف علی عفی لہ بہ گرامی خدمت عالی درجت مخدومنا معظمنا ادام اللہ تعالیٰ افاداتہم وافاضاتہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

باوجود میرے ناقابل خطاب ہونے کے مجھ کو خطاب سے سرفراز فرمانا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا اور کس طرح شکریہ ادا کروں بجز اسکے کہ،

از دست گدائے بینوا ناید ہیچ
جز آنکہ بصدق دل دعائے بکند

جس خدمت کے لیے مجھ کو ارشاد ہوا ہے اوّل تو اس کا دینی خدمت ہونا پھر مزید برآں جناب کا حکم ہونا، فی نفسہ کسی عذر کا متحمل نہیں، لیکن اگر کوئی عذر حد عذر سے متجاوز ہو کر حد عجز تک پہنچ گیا ہو، غالباً اس کا پیش کر دینا نقض امر نہ ہوگا، اسی غرض سے چھپا ہوا عذر نامہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں اور بجائے شرکت جسمانی کے شرکت روحانی پر جس کا ظہور بصورت دعا ہو رہا ہے' اکتفا کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور علاوہ دعا کے اور خدمات محتملہ کے متعلق شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کو' اپنے

کچے چھٹے کا کاشف اور شفیع بناتا ہوں ؎

آں راکہ عقل وہمّت وتدبیر ورائے نیست
خوش گفت پردہ در کسے درسرائے نیست

والسلام ازتھانہ بھون ۔ ۴ رجب ۱۳۴۸ھ

مولانا دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں : یہ ہے "خشک مزاج ودرشت مزاج" مولانا تھانویؒ کا جواب' اپنے سے ایک کہیں کم عمر' اور اعتقادی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے ایک مخالف کیمپ کے مولوی صاحب کے نام۔

خشک مزاج ودرشت مزاج
کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا

"نقوش وتاثرات" صہ ۹۸-۹۷

(۲)

اخبار سچ میں ایک مضمون ظہور مسیح دجال پر نکل رہا تھا، لکھنے والے خانقاہ جیلانیہ کے عبداللہ شاہ قادری صاحب تھے، مولانا دریابادیؒ نے اسی مضمون کے سلسلہ میں حضرت تھانویؒ کی رائے بھی معلوم فرمائی، مولانا کے جواب کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیں۔

"اصل سبب اس توسیع کا مذموم نہیں یعنی حسن ظن، لیکن ہر شیئی کے حدُود ہوتے ہیں حسن ظن کی بھی ایک حد ہے اس سے تجاوز ایسا ہے جیسے غذائے لطیف ومقوی کی مقدار معقول سے تجاوز کر کے تخمہ کا سبب بن جاتی ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی شیرازیؒ نے جہاں گلستاں میں حسن ظن کی تعلیم فرمائی ہے ؎

ہر کرا جامہ پارسا بینی
پارساداں و نیک مرد انگار

وہاں بوستاں میں اس کی حد بتلانے کو یہ بھی فرمایا ہے ؎

نگہدار آں شوخ در کیسہ در
کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر

یعنی قبل تجربہ و امتحان سب کے ساتھ معاملہ احتیاط کا کرے اسی طرح ہر صالح صورت عالم نام کا ادب و عظمت تو ضروری ہے مگر اس کی تحریر و تقریر کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کرنا جس کا اثر اپنے نفس پر یا دوسروں کے نفس پر ایسے رنگ میں ہوں جو بڑی خطرناک ہے، یہ حد سے تجاوز ہے میرا یہ معروضہ اگر موجب ثقل ہو، معافی کے بعد مطلع فرمادیا جائے تاکہ آئندہ صرف دوستی کا علاقہ رکھوں، اور حد مشورہ میں قدم نہ رکھوں"۔

والسلام: اشرف علی

مولانا دریابادی تحریر فرماتے ہیں: مولانا کی اصل تنقید تو آگے چل کر آئے گی سر دست داد مکتوب کی جامعیت و بلاغت کی دے لینے دیجئے، تبلیغ کی تبلیغ اور پھر اتنی نرم و شیریں زبان میں ۔حق، کون کہتا ہے کہ ہمیشہ کڑوا ہی ہوتا ہے" تنقید مضمون نگار کے اصل مضمون پر جو ہوئی وہ تو ہوئی، باقی خود ایڈیٹر کی تنبیہہ بھی بہت برمحل رہی

"نقوش و تاثرات" ص ۱۰۴-۱۰۳

(۴)

کانگریس میں شرکت و عدم شرکت کے مسئلہ میں حضرت تھانویؒ اور حضرت مدنیؒ

ہیں رائے کا اختلاف تھا، مولانا دریابادیؒ کا تعلق دونوں بزرگوں سے برابر تھا چونکہ مولانا دریابادیؒ حضرت مدنیؒ سے بیعت بھی تھے لہٰذا حضرت تھانویؒ نے اس خیال سے کہ اس سیاسی اختلاف کی وجہ سے کہ انکے شیخ کی طبیعت پر اثر نہ ہو، مولانا دریابادیؒ کو تھانہ بھون کی آمد و رفت موقوف کرنے کا مشورہ دیا، مولانا دریابادیؒ نے حضرت تھانویؒ کو جو خط ارسال فرمایا وہ بھی قابل مطالعہ ہے یہاں حضرت تھانویؒ کے جواب کا مطالعہ فرمائیے

"مشفقی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

۱۔ یہ مصلحت مضائقہ نہ تھا لیکن آپ کی طبیعت جو محبت کا محل ہے فتویٰ عقلی پر جو مصلحت کا منشاء ہے غالب آگئی، جس میں آپ معذور بھی ہیں، یہ ظالم محبت اکثر مصلحت پر ظلم کر کے غالب آجاتی ہے،

۲۔ اس پر مجھ کو بے ساختہ شعر یاد آگیا۔

عشق را نازم کہ یوسف را بہ بازار آورد
ہمچو صنعا زاہدے را زیر زنار آورد،

مگر اب میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ آپ کا لقب بجائے فلسفی کے عاشق ہونا چاہیئے اس لیے کہ فلسفی ہمیشہ عقل کو غالب رکھتا ہے اور عاشق طبیعت کو۔

۳۔ میں نے جو کچھ مشورہ دیا تھا اپنی کسی مصلحت سے نہیں بلکہ محض آپ کی مصلحت سے دیا تھا کہ خدانخواستہ مولانا سے آپ کو بُعد نہ ہو جائے میرا تو ملکہ ایک نقصان ہی تھا کہ ایک دوست کم ہوتے تھے مگر میں دگوبدعی

ایثار نہیں لیکن، الحمدللہ کہ دوسروں کی مصلحت کو خصوص دوستوں کی مصلحت کو اپنے مصالح پر مقدم رکھنے پر پسند کرتا ہوں اور کبھی عمل بھی نصیب ہو جاتا ہے، میں مشورہ کا حق ادا کر چکا، اب اگر خدانخواستہ مولانا کو کوئی گرانی ہو تو میں سبکدوش ہوں آپ سر آنکھوں پر آئیں۔

اشرف علی

مولانا دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں: کیسے ظالم یا نابینا ہیں وہ دانا دشمن یا نادان دوست جنہوں نے حکیم الامّت کو "خشک" یا "چوب خشک" خود سمجھا یا دوسروں کو سمجھایا،

"نقوش و تاثرات ص ۴۷۱"

(۴)

حضرت تھانویؒ کی چھوٹی بیوی صاحبہ کا بغرض علاج لکھنؤ کا سفر ہوا، اتفاق سے مولانا دریابادیؒ کو اس کی بروقت اطلاع نہ ہو سکی، انہوں نے اپنے کسی مکتوب میں نیاز مندانہ شکایت تحریر فرمائی، حضرت اقدس تھانویؒ کا جواب آیا،

۴۔ "میں تو اس شکایت کو ناز مندانہ قرار دے کر محظوظ ہوں، واقعی میرا ذہن اس طرف اس لیے نہیں گیا کہ دریاباد اور لکھنؤ کا فاصلہ مجھ کو معلوم نہ تھا، وہ ابھی لکھنؤ سے نہیں آئیں، خواجہ صاحب سے مدّت قیام پوچھ کر حال معلوم ہو سکتا ہے، اگر گھر میں تکلیف فرما کر مل لیں گی تو ملیں گی تو وہ، اور مسرور ہوں گا میں،

مولانا دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

اس آخری فقرہ کی لطافت کیا اردو کے نامور شاعر و ادیب غالب کے

لطیف فقروں سے کچھ کم ہے؟

"نقوش و تاثرات ص ۲۰۷/۲۰۸

(۵)

۱۹۳۱ء کے اواخر میں تحریک خلافت کے پُرجوش کارکن و جمعیۃ العلماء کے ممتاز رکن مولانا عبد الماجد بدایونی قادری کا انتقال ہو گیا تو مولانا دریابادیؒ نے دعائے مغفرت کے لیے حضرت تھانویؒ کو خط لکھا، ۱۸ دسمبر کو حضرت تھانویؒ کا جواب آیا۔

"میں کل کے خط کا جواب لکھ کر روانہ کر چکا ہوں کہ دوسرا کارڈ آیا جس سے ایک محبِّ اسلام و اہلِ اسلام کی مفارقت ناسوتی کا علم ہو کر قلق ہوا، رائے کا اختلاف میری نظر میں کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے، اصول اور نیت پر نظر رہتی ہے سو مرحوم کے متعلق اس کے خلاف کوئی بات نہیں سنی گئی، اس لیے خاص قلق ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرماویں اور اُمّت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائیں، مجھ سے جو فرمائش ان کی گفت و شنید کے معاف کرنے کے متعلق فرمائی ہے، میں اس کا اس لیے شکر گذار ہوں کہ اس میں دو مسلمانوں کا بھلا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ میرے قلب میں بحمد للہ تعالیٰ کسی کی طرف سے غل نہیں ہے، اور ایسی گفت و شنید میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ ان کو گناہ بھی نہ ہوتا تھا، کیونکہ وہ روایات کے تحت معذور رہیں، اس لیے معافی کی حاجت بھی نہیں، لیکن اس سے آپ کی طبیعت خوش نہ ہوگی۔ اس لیے آپ کے مذاق کا اتباع کر کے صریح الفاظ میں دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ

میں نے سب کچھ ان کو معاف کیا آپ بھی معاف فرمائیں، اور ان کو تو ایک خاص امتیاز تھا کہ وہ بدایوں کے متوطن تھے جو وطن ہے ہمارے شیخ المشائخ حضرت سلطان جیؒ کا، میں تو خیر اہل بدایوں کے لیے یہ سمجھ کر ایسے امور گوارا کرتا ہوں کہ بدا۔یوں۔ ہی تھا" حضرت مولانا کی زیارت مبارک ہو۔

مولانا دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں:

مولانا (وہی خشک مزاجی کے لیے بدنام مولانا) رعایت لفظی کے استاد ماہر تھے بدایوں کے مناسبت سے پورا فقرہ "بدا۔یوں ہی تھا کیا خوب"!

"نقوش وتاثرات صـ ۲۲۰/۲۱

(۶)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے تحریر فرمایا کہ: اب تو یہ تجربہ بار بار کا ہو چکا کہ ادھر دعا کے لیے عریضہ روانہ ہوا، ادھر قبول دعا کے آثار نمایاں ہو گئے، اور حضرت رومیؒ کے قول کی تصدیق ہو گئی ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں

می دہد یزداں مراد متقین،

حضرت تھانویؒ نے جواباً تحریر فرمایا:۔

"جب تک میرے پاس خط نہ پہنچے اس وقت تک "تو چنیں خواہی" کا مصداق آپ ہوں گے۔ الحمد للہ بہت تواضع کے بعد ایک کمال کا تو اقرار کیا۔"

مولانا دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں، مولانا جس لطیف انداز سے مزاح فرماتے رہتے اس کی مثالیں تو اوپر بھی جابجا گذر چکی ہیں، باقی یہ " توچنیں خواہی" کے تحت میں لطیفہ تو بھولنے والی چیز نہیں:! (ص ۲۲۴)

(۷)

مولانا عبدالماجد صاحب نے سہیل صاحب اعظمی کی ایک پرلطف فارسی نظم جو حضرت مدنیؒ کے خیر مقدم میں پڑھی گئی تھی، حضرت اقدس تھانویؒ کی خدمت میں ارسال فرمائی۔ حضرت تھانویؒ نے جواباً تحریر فرمایا،

۱۔ واقعی نفیس ہے اور لطف یہ کہ سلیس ہے گویا سہل ممتنع ہے، میں نے نقل کرلی، مولانا دریابادیؒ نے اسی مکتوب میں لکھا تھا، "اللہ آپ کا ان کا دونوں بزرگوں کا سایہ مدتوں قائم رکھے، بعد میں لوگ ان صورتوں کو ترسیں گے۔"

حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا:

"حسب وعدہ صادق ومصدوق بہت سے بادل پیدا ہوتے رہیں گے جو ہم سے زیادہ برسیں گے۔"

مولانا دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

"وسط مکتوب گرامی میں نفیس کا قافیہ سلیس اور میرے ترسیں گے، کے جواب میں "برسیں گے" یہ ان ہی "خشک" مولانا کے قلم سے ہے! (ص ۲۳۳)

(۸)

مولانا دریابادیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں کئی مہینے کے بعد حاضر خدمت

ہونے کی اطلاع کی،

حضرت تھانویؒ نے جواباً تحریر فرمایا:

ادائے حق محبت عنایتیست ز دوست
دگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خورسند است ص ۲۴۵

(۹)

مولانا دریابادیؒ نے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا۔

"لکھنؤ میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بیمار ہو کر علاج کے لیے آئے ہیں، میرے دوست ہی نہیں محبوب بھی ہیں، اب ادھر چند روز لکھنؤ ان کے پاس گذارنے ہیں خدا کرے وہ جلد شفایاب ہو کر روانہ ہولیں، اس وقت ان شاء اللہ حاضری کا قصد کروں گا۔"

حضرت تھانویؒ نے اس فقرہ پر جواب تحریر فرمایا:۔

"مناظر احسن کے 'مناظر احسن' واہم ہیں، عجلت نہ فرمائیے جب تک کافی اطمینان نہ ہو جائے۔"

(۱۰)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے تھانہ بھون کے قیام میں ایک روز کئی کھانے قورمہ، مرغ، پلاؤ وغیرہ پکوا کر حضرت کی خدمت میں روانہ کر دیئے۔ رسید میں حسب ذیل پرچہ موصول ہوا۔

"ماشاء اللہ کل کھانا اتنا بھیجا کہ نصف کے قریب بڑے گھر بھیج دیا، بقیہ چھوٹے گھر کے پورے خرچ کے لیے کافی ہو گیا، اور پھر بھی بچ

رہا، حقیقت اس کی تالف تھی مگر صورت اس کی تکلف کی ہوگئی۔
جزاکم اللہ تعالیٰ، (ص ۲۹۶)

(۱۱)

مولانا دریابادیؒ نے اپنے کسی مکتوب میں تحریر فرمایا:۔
آپ نے فرطِ کرم سے مجھے جو آزادیاں دے رکھی ہیں۔ ان ہی کے بل پر گستاخانہ سب کچھ لکھ ڈالتا ہوں، اور سب کچھ بک جانے کے بعد یہ مصرعہ بھی پڑھ لیتا ہوں ع

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

حضرت تھانویؒ نے جواباً تحریر فرمایا۔
"یہ گستاخی نہیں، بقول مولانا ؎

گفتگوئے عاشقاں در کار رب
جوشش عشق است نے ترک ادب

(ص ۳۰۶)

(از تعمیرِ حیات)

اگر کوئی شخص!

مجھ سے یہ سوال کرے کہ تم نے حضرت تھانویؒ کی مجلس کو کیسا پایا؟

جواب میں کہونگا دربار تو میں عجب دربار رہتا' جلال بھی تھا جمال بھی۔ قوت و سختی کا بھی مظہر تھا' مسکنت وعاجزی اور تکسرو تواضع کا بھی کوہ گراں بھی' آب رواں بھی۔ شعلہ بھی اور شبنم بھی' متضاد و نرم وگرم قوتوں کا موزوں امتزاج ادھر خطوط کے جوابات بھی لکھے جا رہے ہیں۔ سوال کرنے والوں کے جوابات یہی دیئے جا رہے ہیں۔ کسی کو مختصر' کسی کو بہ تفصیل' تحقیقی بھی الزامی بھی' حکمت کا انداز بھی ہے موعظت و مجاولت حسنہ کا طرز بھی۔

مولانا حکیم عبد الرشید محمود صاحب گنگوہیؒ
نبیرہ قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

الرحمٰن فسئل به خبيرا (القرآن)
ترجمہ: "رحمٰن کی شان کسی باخبر سے پوچھو"
التوحید الحقیقی
تالیف لطیف
مسیح الامۃ حضرۃ مولانا شاہ محمد مسیح اللہ صاحب دامت فیوضہم
خلیفہ ارشد
حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ
مکتبہ فیض اشرف ماڈل ٹاؤن لاہور / پاکستان

مجلس
صیانۃ المسلمین کی
ضرورت و اہمیت
24808